عزیمت کے راہی

(حصہ چہارم)

حافظ محمد ادریس

ادارہ معارف اسلامی

یہ ادارہ، اسلامی علوم و معارف کی تحقیق و تصنیف اور اشاعت و ترویج کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد دورِ حاضر کے عظیم مفکر اور قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جولائی ۱۹۶۳ء میں رکھی تھی اور اس کا پہلا مرکز کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۷۹ء میں مولانا مرحوم نے لاہور کو اس کا دوسرا مستقر بنایا۔ اب کراچی اور لاہور میں ادارہ معارف اسلامی کے دونوں مراکز داخلی طور پر خود مختارانہ اور مقصدی اور آئینی طور پر ہم آہنگی سے حسب ذیل مقاصد کے لیے کوشاں ہیں:

- ❑ تحقیق اور علمی جستجو کے بعد اسلامی تعلیمات کو جدید ترین اسلوب اظہار کے ذریعے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کرنا۔
- ❑ علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیب نو، تشریح و توضیح اور اشاعت، اسی طرح قدیم علمی خزانوں تک آج کے طالب علموں کی رسائی ممکن بنانا۔
- ❑ عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔
- ❑ اسلامی موضوعات پر دورِ حاضر کے مسلم علما کے نمایاں کارناموں کی دنیا کی اہم زبانوں بالخصوص اردو، عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں تراجم اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ❑ عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ❑ تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظام تعلیم کی راہ ہموار کرنے کے لیے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

Marfat.com

عزیمت کے راہی

حصہ چہارم

حافظ محمد ادریس

ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب	عزیمت کے راہی (حصہ چہارم)
تصنیف	حافظ محمد ادریس
باہتمام	ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور 042-35432476, 35414677 website: www.imislami.org E-mail: imislami1979@gmail.com
مطبع	نوید حفیظ پرنٹرز، لاہور
اشاعت اول	جولائی 2013ء (1100)
صفحات	360
قیمت	-/300 روپے

تقسیم کنندہ:

مکتبہ معارف اسلامی

منصورہ ملتان روڈ لاہور پوسٹ کوڈ نمبر 54790

فون.042-35432419, 35419520-24

Marfat.com

فہرست

پیش لفظ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۱۸
عرضِ مصنف	حافظ محمد ادریس	۲۱

(۱) مجاہدِ ملت قاضی حسین احمدؒ

❁ کل من علیھا فان	۲۵	❁ رضا اور ناراضی اللہ ہی کے لیے	۳۵
❁ علمی و جہادی گھرانا	۲۶	❁ حق رائے	۳۶
❁ سید مودودی کا جانشین	۲۷	❁ اطاعت امیر	۳۷
❁ اقبال کا شاہین	۲۸	❁ فقہی امور	۳۷
❁ آتشِ نمرود اور عشقِ بے تاب	۲۸	❁ مسنون نمازِ جنازہ اور سفری نمازیں	۳۸
❁ پہلی ملاقات اور مابعد	۳۰	❁ دیدہ ور	۳۹
❁ کینیا آنے کی دعوت	۳۱	❁ غیور راہ نما	۳۹
❁ فرمودۂ قلندر	۳۱	❁ جفاکشی و ہمت مردانہ	۴۰
❁ راز دانِ افغانان	۳۲	❁ اتحادِ امت کا داعی	۴۱
❁ سفر و حضر	۳۳	❁ غم سے نڈھال عقیدت مندان	۴۱
❁ منصبِ امارت	۳۴	❁ آخری آرام گاہ	۴۲

(۲) نجم الدین اربکانؒ

❁ قلبی صدمہ	۴۴	❁ ازدواجی زندگی	۴۶
❁ ترقی کے زینے	۴۴	❁ لادینی نظام میں دین کی روح	۴۶
❁ تعلیم اور صنعت	۴۵	❁ غازیانِ دین سے سیکولرازم تک	۴۷

Marfat.com

ملی نظام پارٹی	۴۸	سوسرلک سکینڈل	۵۴
تحریکات کے مثبت اور منفی پہلو	۴۸	حکومت کا خاتمہ	۵۴
سید مودودی کا کارنامہ	۴۹	نورِ دیدہ اور چشم زلیخا	۵۵
انفرادی رابطوں کی اہمیت	۵۰	اعترافِ حقیقت	۵۵
تلخ تجربات	۵۰	اردوگان حکومت کی کارکردگی	۵۶
کشمیر و فلسطین	۵۱	اجتہادی مسئلہ؟	۵۷
وزیراعظم اربکان	۵۲	سرکاری پروٹوکول سے معذرت	۵۷
ڈی ایٹ	۵۳	خلدِ بریں کو روانگی	۵۸

(۳) پروفیسر غفور احمدؒ

غائبانہ تعارف	۵۹	بزرگ صحافی	۶۶
بھولی بسری یادیں	۵۹	مذہب اور مسلک	۶۷
خاندان	۶۰	نوجوان قیادت؟	۶۸
زندگی کے مراحل، ایک جھلک	۶۱	قدرِ مشترک	۶۸
بالمشافہ ملاقات	۶۲	”جیتے رہو“!	۶۹
ذاتی تعارف	۶۳	بڑا دل، بڑا گھر	۶۹
بزرگوں کے چٹکلے	۶۳	حق کے راہی	۶۹
پیار بھری شخصیت	۶۴	تصانیف	۷۰
کلیدی کردار	۶۵	بڑا لیڈر چھوٹا مکان	۷۱
نام و نمود سے پرہیز	۶۵	خدمت اقدس میں حاضریاں	۷۱
کوزے میں دریا!	۶۶	حسرت	۷۲

(۴) شیخ فقیر حسین مرحوم

زندۂ جاوید لوگ	۷۳	تعارف	۷۳

Marfat.com

- خاندانی پس منظر اور تعلیمی سفر ۷۵
- گھریلو زندگی اور اہل وعیال ۷۵
- رضا کارانہ خدمات ۷۶
- سرکاری ملازمت سے تحریکی ذمہ داریوں تک! ۷۶
- مولانا مودودی سے رابطہ ۷۷
- معالج کو ہدایات ۷۸
- شیخ صاحب کے بزرگان اور مولانا ۷۸
- جیل سے تعزیتی خط ۷۹
- باہمی مزاح ۸۰
- حاضر جوابی ۸۱
- امیر جماعت، فقیر جماعت ۸۱
- خلقِ عظیم ۸۲
- میاں صاحب کا خصوصی تعلق ۸۳
- نیا مدرسہ اور شیخ صاحب ۸۴
- تربیت اولاد ۸۴
- گھر میں گپ شپ اور تبادلۂ خیالات ۸۵
- پدری نصیحت ۸۵
- گرم دمِ جستجو ۸۶
- شیخ صاحب کے لطائف ۸۶
- باقر خاں صاحب، شیخ صاحب اور پروفیسر غفور صاحب ۸۷
- وفات کی اطلاع ۸۸
- آخری لمحات ۸۸

(۵) محمد یعقوب خالد مرحوم

- لوحِ حافظہ کا البم ۹۰
- پاکستان سے کینیا ۹۰
- وضع دار بزرگ ۹۱
- پہلی ملاقات ۹۲
- احباب مسجد ۹۲
- وقت کی پابندی ۹۳
- مشرقی افریقہ آمد کی کہانی ۹۴
- ٹھیکیداری ۹۴
- اسلامی و دینی خدمات ۹۵
- کینیا کا بابائے قوم ۹۶
- گھریلو معاملات میں مشورے ۹۷
- محبت بھرا ماحول اور اپنائیت ۹۸
- طلبہ کے درمیان مقابلے ۹۸
- محکم اصول ۹۹
- محبت فاتح عالم ۱۰۰
- اچھے جانشین ۱۰۰

Marfat.com

(۶) فضیلۃ شیخ علی طنطاویؒ

حسنِ خلق اور حسنِ خُلق	۱۰۲	صاحب تصنیف بزرگ	۱۰۷
علمی خاندان	۱۰۲	مبلغ اور خطیب	۱۰۷
مجاہدِ حریت	۱۰۳	شیخ اور ذرائع ابلاغ	۱۰۷
صلاحیت وقابلیت	۱۰۳	ذاتی مشاہدہ	۱۰۸
معرکۂ انتخابات میں	۱۰۴	اولادِ صالح	۱۰۹
زمانے کی ریت	۱۰۴	لختِ جگر کی یادیں	۱۱۰
شیخ اور اخوان	۱۰۵	روحانی اولاد	۱۱۰
جلاوطنی	۱۰۵	کنگ فیصل ایوارڈ	۱۱۱
فصاحت وبلاغت	۱۰۶		

(۷) فیض الرحمان ہمدانیؒ

درویشِ خدامست	۱۱۲	عربی زبان میں مہارت	۱۱۷
مرشد کے حضور!	۱۱۳	تحریکی کتب کے تراجم	۱۱۸
تحریکی رشتہ	۱۱۳	اہل نظر قلیل ہیں	۱۱۸
دارآخرت کا طلبگار	۱۱۴	ایک دوست کا خراجِ تحسین	۱۱۹
خاندان ہمدان	۱۱۴	مصائب وامراض	۱۲۰
پہلی ملاقات	۱۱۵	آپا خالدہ	۱۲۰
مومن کی صفات	۱۱۵	صحت، پھر مرض الموت	۱۲۱
دوہرا تعلق	۱۱۶		

(۸) شعیب احمد نیازی شہیدؒ (عمر مختار)

شہدا کی بستی	۱۲۲	خون جگر سے لکھی تحریر	۱۲۳
خاندان کا درخشاں ستارا	۱۲۲	داغ ہائے سینہ	۱۲۴
تعزیت کے لیے حاضری	۱۲۳	میدان جہاد سے موصولہ مکتوب	۱۲۵

Marfat.com

❁ شہید کا جہادی نام عمر مختار ۱۲۵
❁ حسین یادیں ۱۲۵
❁ تمنائے شہادت ۱۲۶
❁ کامیاب جہاد، شاندار تدفین ۱۲۷
❁ قابلِ مبارک باد ۱۲۷
❁ میری یادیں ۱۲۸
❁ ابتدائی تعارف ۱۲۸
❁ غیرتِ مسلم زندہ ہے ۱۲۹
❁ مراحلِ جہاد ۱۲۹
❁ جامع خط ۱۳۰
❁ والدین سے خطاب ۱۳۱
❁ بھائیوں کے نام پیغام ۱۳۲
❁ بہنوں کو نصیحت ۱۳۴
❁ سلسلہ وار خطوط ۱۳۴
❁ جانب شہادت رواں دواں ۱۳۵
❁ شہادت کی اطلاع ۱۳۶
❁ عظیم بیٹے کی عظیم ماں ۱۳۷
❁ سکینت ۱۳۸
❁ شہدا و غازیوں کے قافلے ۱۳۹

(۹) حاجی فضل رازق مرحوم

❁ غائبانہ تعارف ۱۴۰
❁ تاخیر، معذرت ۱۴۰
❁ دینِ حق کا سپاہی ۱۴۱
❁ بچپن اور تعلیم ۱۴۱
❁ ابتلا اور جلاوطنی ۱۴۲
❁ دعوت کے میدان میں ۱۴۳
❁ جراتِ مومنانہ ۱۴۴
❁ والی کا نادر شاہی حکم ۱۴۴
❁ قومی اسمبلی کا وفد ۱۴۵
❁ ریاست کا پاکستان میں ادغام ۱۴۶
❁ حلقۂ درسِ قرآن و دعوت ۱۴۶
❁ تحریکی گھرانہ ۱۴۷
❁ خاندانی نظامِ قیادت ۱۴۸
❁ معرکۂ انتخاب میں ۱۴۸
❁ بونیر کا ضلعی درجہ ۱۴۹
❁ خلیق و رحیم ۱۴۹
❁ عوام کی نمائندگی ۱۵۰
❁ ایثار کی مثال ۱۵۱
❁ معمولات ۱۵۱
❁ ہر دل عزیز ۱۵۲
❁ متفقہ لیڈر ۱۵۳
❁ بیماری اور وفات ۱۵۴

Marfat.com

(۱۰) ڈاکٹر محمد رمضان (مرحوم)

- حسنِ اخلاق نعمت عظمیٰ ۱۵۵
- پہلی یادگار ملاقات ۱۵۵
- دل جیت لینے والے ۱۵۶
- ابتدائی زندگی اور تعارف ۱۵۷
- تعلیم و ہنر ۱۵۷
- شادی اور نقل مکانی ۱۵۸
- مستقل مسکن ۱۵۹
- مستقل مشاغل ۱۵۹
- ہردلعزیزی ۱۶۰
- اولاد کی تربیت ۱۶۰
- مہمان نوازی ۱۶۳
- جائیداد اور اس کی تقسیم ۱۶۳
- جماعت اسلامی سے تعلق ۱۶۴
- مرکز اسلامی قلعہ دیدار سنگھ ۱۶۵
- گرفتاریاں ۱۶۵
- کفایت شعاری وسادگی ۱۶۶
- علالت اور سفرِ آخرت ۱۶۶
- بیماری کے بعد صحت ۱۶۷
- آخری مرض ۱۶۷
- نماز جنازہ ۱۶۸
- یادوں کے دیپ ۱۶۹

(۱۱) مولانا احمد غفور غواصؒ

- مردِ درویش کی رحلت ۱۷۰
- بطور طالب علم راہنما ۱۷۰
- جماعت کی رکنیت اور سلسلہ تعلیم ۱۷۱
- امارتِ ضلع ۱۷۲
- ممبر قومی اسمبلی ۱۷۲
- منصب کی نازک ذمہ داریاں ۱۷۳
- جنت کے طلب گار ۱۷۳
- رکنیت شوریٰ ۱۷۴
- خوش نصیب اور بدنصیب ۱۷۴
- روشن قبریں ۱۷۵
- زندہ و متحرک جماعت ۱۷۶

(۱۲) حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفیؒ

- شیریں مقال بزرگ کی رحلت ۱۷۷
- آبائی علاقہ ۱۷۷
- پاکستان کی حمایت ۱۷۸
- ''بیبا کاکا'' ۱۷۹

Marfat.com

- علم سے شغف ۱۷۹
- عقیدت میں اضافہ ۱۸۰
- مطالبۂ اسلامی دستور ۱۸۰
- پہلی ملاقات کا شرف ۱۸۱
- اتحادِ امت کا داعی ۱۸۲
- مہمان نواز، صلح ۱۸۳
- خدمتِ خلق ۱۸۴
- اتفاقات ۱۸۴
- سائیں شکریہ! ۱۸۵
- نوجوان باپ کم سن اولاد ۱۸۶
- تسبیح؟ ۱۸۶
- مثالی جنازہ ۱۸۷

(۱۳) ڈاکٹر زین العابدینؒ

- پرکشش شخصیت ۱۸۸
- پہلا رابطہ ۱۸۸
- ذہانت و لطافت ۱۸۹
- خاندانی تعارف ۱۹۰
- حسنِ اتفاق ۱۹۰
- نعمت غیر مترقبہ ۱۹۱
- مالاکنڈ ڈویژن پر ابتلا کیوں؟ ۱۹۲
- تاج الملوک ۱۹۲
- مقدر اپنا اپنا ۱۹۳
- تحدیثِ نعمت ۱۹۳
- دلی کا تذکرہ ۱۹۴
- مرشد کی میزبانی کا شرف ۱۹۴
- جلاوطنی اور کراچی آمد ۱۹۴
- چودھری غلام محمد مرحوم ۱۹۵
- عمر کا بونس ۱۹۵
- امریکی پٹھو ۱۹۶
- اہل و عیال ۱۹۶
- بے پناہ خوشی ناقابل بیان غم ۱۹۸
- بلاوا اور حاضری ۱۹۸

(۱۴) دو مثالی بھائی: میاں سخی محمدؒ، حافظ غلام محمدؒ

- حسین یادیں ۲۰۰
- دو محبوب شخصیتیں ۲۰۰
- اے اللہ مجھے ان میں شامل فرما! ۲۰۱
- سراپا شرافت و اخلاص ۲۰۲
- بچپن کی ایک تمنا اور اس کی تکمیل ۲۰۲
- حفاظِ قرآن کا خاندان ۲۰۳
- مثالی بھائی، مثالی ارکانِ جماعت ۲۰۴
- اللہ کے انعامات ۲۰۴
- نیک کسان اللہ کے محبوب ۲۰۵
- حفظ قرآن کی سعادت ۲۰۶

Marfat.com

❁ مرض اور علاج	۲۰۶	❁ مسافر جانبِ منزل	۲۰۸
❁ اپنائیت وشفقت	۲۰۷	❁ جنازے سے محرومی	۲۰۹
❁ خوش بخت مسافر	۲۰۸	❁ نیک گواہیاں، سرمایہ آخرت	۲۰۹

(۱۵) جنتی روح، سعدؒ بن بشیر

❁ سپیشل بچہ	۲۱۱	❁ گم شدگی اور بازیابی	۲۱۶
❁ پیغام ڈائجسٹ کا محبّ	۲۱۱	❁ اعزاز	۲۱۷
❁ خاندانی تعارف	۲۱۲	❁ حادثے پہ حادثہ	۲۱۷
❁ تحریک اسلامی سے رشتہ	۲۱۳	❁ جنت مکین	۲۱۸
❁ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی	۲۱۳	❁ خلا جو پر نہ ہو سکے	۲۱۸
❁ تعلیم	۲۱۴	❁ ”منصورہ کا تارا! سعد ہمارا!	۲۱۸
❁ خدمت خلق	۲۱۴	❁ داعی حق	۲۱۹
❁ کھیل کے میدان میں	۲۱۵	❁ مثالی رکن	۲۲۰
❁ مہم جوئی	۲۱۵	❁ دم بھر کی ملاقات اور دائمی ساتھ	۲۲۰
❁ شوقِ سفر	۲۱۶		

(۱۶) فاروق حسن گیلانیؒ

❁ عظیم باپ کا عظیم بیٹا	۲۲۲	❁ ام فاروق کے جذبات واحساسات	۲۲۶
❁ طلبہ سیاست	۲۲۲	❁ حسین بچپن!	۲۲۷
❁ کھرا اور صاف گو نوجوان	۲۲۳	❁ پیارا انسان	۲۲۸
❁ دیانت دار مسلمان، اعلیٰ سرکاری افسر	۲۲۴	❁ ہیروں کی کان	۲۲۹
❁ محبوب بیٹے کی وفات اور ماں کا امتحان	۲۲۵	❁ انفاق فی سبیل اللہ	۲۳۰
❁ اہل وعیال سے تعزیت	۲۲۵	❁ اپنا گھر، سکونِ جسم وجاں	۲۳۰

Marfat.com

ماں کی دلجوئی	۲۳۱	ناموسِ رسالت کا پروانہ	۲۳۱
آخری لمحات	۲۳۱		

(۱۷) عبدالوحید خان مرحوم

گلستان مودودی کا پھول	۲۳۳	دو معاشرتی تہذیبوں کا حسین نمونہ	۲۳۷
نیک سیرت، نیک نہاد	۲۳۴	نیک والدین، سعادت منداولاد	۲۳۸
ماہر قلم کار	۲۳۴	سنگلاخ وادیاں اور ثابت قدم مسافر	۲۳۹
بھائی جان	۲۳۵	تنظیمیں اور ادارے	۲۳۹
مرحوم بھائی کی یاد	۲۳۶	صحافت و تالیف	۲۴۰
مثالی تحریکی جوڑا	۲۳۶	الوداعی منظر	۲۴۱

(۱۸) حاجی حافظ محمد صدیق تجرؒ

بزرگ رکنِ جماعت	۲۴۲	جاگیردار وڈیرے کی ہزیمت	۲۴۸
باوقار اور عظیم زندگی	۲۴۲	طائف کا سفرِ نبوی اور سرگودھا کی سنگ باری	۲۴۸
تعزیتی مجلس	۲۴۳		
ابتدائی زندگی	۲۴۴	داعیِ حق اور مدرس قرآن وحدیث	۲۴۹
ہاشمی خاندان	۲۴۴	چمنِ مودودی کا مالی اور خادمِ خلق	۲۵۰
ہاشمیوں کی گاؤں سے سرگودھا منتقلی	۲۴۵	مثالی گھرانہ	۲۵۱
انتقامی کارروائیاں	۲۴۶	ایک متقی انسان	۲۵۲
مرشد کی خدمت میں حاضری	۲۴۷	آخری ایام	۲۵۲

(۱۹) مریم جمیلہ مرحومہ (۱)

مقدر کی بات	۲۵۴	اللہ کا منصوبہ	۲۵۵
یہودیت و صہیونیت	۲۵۴	انصاف کی علمبردار	۲۵۵

Marfat.com

ذہنی مرض؟	۲۵۶	یوسف خاں اور مریم جمیلہ کی شادی	۲۶۵
مظلوم کی ساتھی قلم کار	۲۵۷	یادگار ملاقاتیں	۲۶۶
کرب کا دور	۲۵۷	تعزیت کے لیے حاضری	۲۶۷
مسلم دانش وروں سے رابطے	۲۵۸	رشتے کی بات اور سوال و جواب	۲۶۷
مولانا مودودی سے تعارف	۲۵۸	مرشد کا مشورہ	۲۶۸
مراسلت	۲۵۹	یوسف خاں کا خاندان	۲۶۹
والدین کو مشورہ	۲۶۰	عزیمت واستقامت	۲۷۰
دعوت بطور سرپرست و مربّی	۲۶۱	صبغۃ اللہ	۲۷۱
والد کا متوازن مکتوب	۲۶۲	بنت اسلام	۲۷۱
پاکستان نیا وطن	۲۶۴	علمی خدمات اور سرمایہ	۲۷۲
خوب صورت تصویر کشی	۲۶۵	ایک روشن ستارہ!	۲۷۶

(۲۰) یوسف خان اور مریم جمیلہ کا گھرانہ (۲)

قافلے کی شناخت	۲۷۷	قابل فخر جوڑا	۲۸۰
مجاہد کی خدمت میں درویش کی حاضری	۲۷۷	بزرگان کی نشانیاں	۲۸۰
”عزیمت کے راہی“	۲۷۸	قرونِ اولیٰ کی یادگار	۲۸۱
سوتن نہیں سہیلی	۲۷۹	ماں کی بے مثال محبت	۲۸۲
گولیوں کی بوچھاڑ اور جرأت مومنانہ	۲۷۹		

(۲۱) محترمہ مریم جمیلہ، علم وعمل کی بہترین مثال (۳)

اسلام اور ہجرت	۲۸۳	اسلام کی ترجمانی	۲۸۵
علمی کارنامے	۲۸۳	محاکمہ ومحاسبۂ مغرب	۲۸۶
دفاعِ دین	۲۸۴	پابندِ اسلام	۲۸۶
مغربی تہذیب کا تجزیہ	۲۸۴	امی اور آپا	۲۸۷

Marfat.com

(۲۲) مولانا محمد وزیر خانؒ

❁ جنازے سے محرومی	۲۸۸	❁ ان تھک مجاہد	۲۹۵
❁ وادیٔ چھچھ کا موتی	۲۸۸	❁ وسائل کا درست استعمال	۲۹۵
❁ خاندانی پس منظر	۲۸۹	❁ پہلوان مولوی	۲۹۶
❁ تعلیم وتدریس	۲۸۹	❁ اعزاز	۲۹۶
❁ شوق علم اور سفر	۲۹۰	❁ قبرستان میں خطاب	۲۹۷
❁ جماعت سے تعارف	۲۹۰	❁ اللہ کی خصوصی مدد	۲۹۷
❁ شادی میں فحاشی؟	۲۹۱	❁ جنگل کا چیتا اور اسلام کا سپاہی!	۲۹۸
❁ مردِ حق کا کلمۂ حق	۲۹۲	❁ مزید تعلیم	۲۹۹
❁ معرکۂ حق وباطل	۲۹۲	❁ بیرون ملک دعوتی کام	۲۹۹
❁ طبلہ وسارنگی پر نعتِ رسولؐ؟	۲۹۳	❁ تحریکی خاندان	۳۰۰
❁ واپس چک ۷ ہ میں	۲۹۳	❁ بے تکلفی	۳۰۱
❁ حفظ قرآن کی سعادت	۲۹۴	❁ آخری لمحات	۳۰۱

(۲۳) ڈاکٹر پرویز محمود خان شہیدؒ

❁ ظالم کا حریف، مظلوموں کا ساتھی	۳۰۳	❁ الطاف کے نام کھلا خط	۳۰۷
❁ شیرِ خدا	۳۰۳	❁ چور مچائے شور	۳۰۷
❁ خاندان	۳۰۴	❁ سربستہ راز؟	۳۰۸
❁ تعلیم اور عملی زندگی	۳۰۴	❁ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا	۳۰۸
❁ امریکہ میں سزا!	۳۰۵	❁ موت زندگی کی محافظ	۳۰۹
❁ میدانِ سیاست میں!	۳۰۶	❁ نمرودی روش	۳۰۹
❁ دھمکیاں	۳۰۶	❁ تعزیت کے لیے حاضری	۳۱۰

Marfat.com

(۲۴) شیخ عبدالوحیدؒ

❁ سانحۂ ارتحال ۳۱۲
❁ اپنائیت وہم آہنگی ۳۱۲
❁ قصوراور قصوری ۳۱۳
❁ ترقی کے مدارج ۳۱۳
❁ ذمہ دار وفرض شناس ۳۱۴
❁ تنظیمی حلقے ۳۱۵
❁ قصۂ چہار درویش ۳۱۵
❁ مدینہ اور شیخ صاحب ۳۱۶
❁ رقیق القلب ۳۱۶
❁ توکل وقناعت ۳۱۷
❁ انتخابی معرکہ ۳۱۷
❁ شاندار کامیابی ۳۱۸
❁ پہلا اور آخری معرکہ ۳۱۸
❁ محبت وبے تکلفی ۳۱۹
❁ نازک ذمہ داری اور اجر ۳۱۹
❁ راہِ حق کا پرعزم راہی ۳۲۰
❁ پھول اور کلیاں ۳۲۰

(۲۵) ظفر محمد چودھریؒ

❁ عجوباتِ زمانہ ۳۲۲
❁ باہمی تعلقات ۳۲۳
❁ عرس ونیاز اور دعوت انقلاب ۳۲۳
❁ جذباتِ تشکر ۳۲۴
❁ منبر ومحراب کا کردار ۳۲۵
❁ ابتلا اور استقامت ۳۲۵
❁ اہل وعیال ۳۲۶
❁ برطانیہ کا قیام ۳۲۶
❁ مقامی جماعت اسلامی ۳۲۷
❁ انکسار ومتانت ۳۲۸
❁ گھریلو ذمہ داریاں ۳۲۸
❁ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے ۳۲۹
❁ مرشد مودودی کا فیضان ۳۲۹
❁ باہمی مزاح ۳۳۰
❁ حسرت ۳۳۱
❁ زمین اللہ کی ۳۳۱
❁ ہم دمِ دیرینہ ۳۳۲
❁ صاحبِ خیر، داعیِ حق ۳۳۲
❁ آخری ملاقات ۳۳۳
❁ داعیِ حق کی صفات ۳۳۳
❁ اپنائیت ومحبت ۳۳۴
❁ دعا مومن کے لیے نفع بخش ۳۳۵

Marfat.com

٭ آپا مقصودہ کا خط	۳۳۵	٭ تربیتِ اولاد	۳۳۸
٭ مخلص رکنِ جماعت	۳۳۶	٭ حق پر قائم، صلح جو	۳۳۹
٭ محبِ مخلص	۳۳۷	٭ بچگان کا مزید تعارف	۳۴۰
٭ وفات اور آخری سفر	۳۳۸		

(۲۶) صاحبزادہ محمد ابراہیمؒ

٭ صاحب ایمان کا جنازہ	۳۴۲	٭ دینی تعلیم	۳۵۱
٭ مسافر اور گاڑی	۳۴۲	٭ جنت کی بشارت	۳۵۱
٭ قیمتی یادداشتیں	۳۴۳	٭ حق ہمسائیگی	۳۵۲
٭ ابتدائی حالات	۳۴۴	٭ دو محبوب ساتھی	۳۵۲
٭ اکابر جماعت سے خصوصی تعلق	۳۴۴	٭ ہمسایہ ماں جایا	۳۵۳
٭ امانت و دیانت	۳۴۵	٭ نایاب ہیرے	۳۵۴
٭ خصوصی سرپرستی	۳۴۵	٭ یہ قیمتی چراغ	۳۵۴
٭ اچھی مثال	۳۴۶	٭ پہلے روز کی ضیافت	۳۵۵
٭ امرت دھارا	۳۴۶	٭ باہمی محبت و تعاون	۳۵۵
٭ جماعت سے وابستہ یادیں	۳۴۷	٭ ماتحت اور باس	۳۵۶
٭ مولانا مودودیؒ کی وسیع الظرفی	۳۴۷	٭ قاضی ثانی	۳۵۶
٭ اخلاص و سادگی	۳۴۸	٭ مرشد مودودی کی عظمت	۳۵۷
٭ سید سے صاحبزادے تک	۳۴۸	٭ عید اور حافظہ	۳۵۷
٭ گھریلو معاملات وواقعات	۳۴۹	٭ آخری سفر اور آخری لمحات	۳۵۸
٭ متوکل علی اللہ	۳۴۹	٭ سکراتِ موت	۳۵۸
٭ صابر و شاکر بندہ	۳۵۰	٭ آہ پنچھی اڑ گیا	۳۵۹
٭ ایک دوست کی شہادت	۳۵۰		

Marfat.com

پیش لفظ

حافظ محمد ادریس صاحب ہفت زبان نہیں تو ہفت قلم ضرور ہیں۔ ان کا قلم مختلف النوع موضوعات پر اور ان کے مختلف الجہات پہلوؤں میں خوب چلتا ہے۔ فاضل موصوف بیک وقت سیرۃ النبیؐ، سوانحِ صحابہؓ وصحابیاتؓ، خصائلِ اکابرِ امت، تحریکِ اسلامی، حالاتِ حاضرہ، قصہ کہانی اور یادرفتگاں پر بڑی سہولت کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سہولت، صلاحیت اور نعمت ہر قلم کار کو میسر نہیں۔ مختلف اصنافِ سخن اور متنوع موضوعات پر حافظ صاحب کی درجنوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب قارئین کے لیے ان کا تازہ ترین تحفہ ہے۔

سیرت اور سوانح سے انھیں ایک خاص مناسبت اور لگاؤ ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً بیس سال پہلے ان کی پہلی تصنیف مسافرانِ راہِ وفا کے نام سے منظرِ عام پر آئی تھی، پھر وقفے وقفے سے اس سلسلے کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوتی چلی گئیں:

۱-	مسافرانِ راہِ وفا	۱۹۹۳ء	۳۳ شخصیات
۲-	چاند اور تارے	نومبر 1995ء	۲۷ شخصیات
۳-	عزیمت کے راہی، اوّل	اپریل ۲۰۰۸ء	۱۷ شخصیات
۴-	عزیمت کے راہی، دوم	اگست ۲۰۱۰ء	۲۷ شخصیات
۵-	عزیمت کے راہی، سوم	دسمبر ۲۰۱۱ء	۲۹ شخصیات

ان مجموعوں کی بیشتر شخصیات عالم اسلام کی کسی نہ کسی دینی یا اسلامی تحریک سے وابستہ تھیں۔ حافظ صاحب کی یہ کتاب پڑھتے ہوئے ہماری معلومات میں اضافہ تو ہوتا ہی ہے، مولانا حالی کے بقول:

''اکثر نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک بھی دل میں پیدا ہوتی ہے۔''

خود حافظ صاحب یادرفتگاں کے اس سلسلے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ہمارے پیش نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس دور میں پائے جانے والے وہ کردار جو دنیا کی زندگی میں تمام مصروفیات اور جدوجہد کے باوجود آخرت کو اپنی ترجیح اوّل بنائے رکھتے ہیں، ان کی زندگی کے کچھ لمحات وواقعات اور کارہائے نمایاں سینۂ قرطاس پر محفوظ کر دیے جائیں تاکہ قافلۂ حق کے لیے ان کے نقوشِ پا راہ نمائی کا کام کرتے رہیں۔''

Marfat.com

بچھڑنے والوں کے حالات و واقعات قلم بند کر کے محفوظ کرنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ آج مختلف اسلامی تحریکوں سے وابستہ جو لوگ غلبۂ دین کی جدوجہد میں مصروف ہیں، یہی تابندہ نمونے ان کے لیے نقوشِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاضی حسین احمد صاحب نے (جو خود اب قافلہ رفتگاں میں شامل ہو چکے ہیں) عزیمت کے راہی کی جلد اول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

''نیک انسانوں کی زندگیاں بھی متنوع ہوتی ہیں، کوئی شخص نیکی کے کسی پہلو میں بہت آگے نکل جاتا ہے تو کوئی دوسرا کسی اور پہلو میں نمایاں تر ہو جاتا ہے۔ بہرحال ایسے لوگوں کی مثالیں مردہ دلوں کو زندگی اور غفلت میں ڈوبے ہوؤں کو بیداری عطا کرتی ہیں۔ اصلاح کے راستے پر گامزن مسافر، ان سے مزید تقویت اور حوصلہ پاتے ہیں اور عزیمت کی قدر جاننے والے ان کی مثالوں سے اپنے ایمان میں مزید بالیدگی محسوس کرتے ہیں۔''

عزیمت کے راہی کی زیرِنظر چوتھی جلد دراصل یادرفتگاں کا چھٹا حصہ ہے، اس میں سب سے پہلا مضمون محترم قاضی حسین احمد پر ہے۔ مزید برآں اس میں پروفیسر غفور احمد، شیخ فقیر حسین، شیخ علی طنطاوی، فیض الرحمٰن ہمدانی، عبدالوحید خان، نجم الدین اربکان، مریم جمیلہ، فاروق حسن گیلانی، مولانا محمد وزیر خاں، حاجی فضل رازق، ڈاکٹر زین العابدین، صاحبزادہ ابراہیم، مولانا احمد غفور غواص، مولانا عبدالرحمان اشرفی اور متعدد [بظاہر] غیر معروف حضرات سمیت چوبیس (۲۴) شخصیات کی حیات و خدمات کا تذکرہ شامل ہے۔ سوانحی خاکوں کے ساتھ مرحومین کی شخصیت اور اپنے اپنے شعبوں میں ان کے کارناموں کا ذکر بھی شامل ہے۔ مریم جمیلہ" پر ایک کی بجائے تین مضامین شاملِ کتاب ہیں۔

مضامین بالعموم طویل ہیں، اس لیے ہر مضمون میں ضمنی عنوانات اور سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ ان کی افادیت یہ ہے کہ قاری ان سرخیوں پر رکتا ہے، سانس لیتا ہے اور ٹھیکی لیتا ہوا آگے چلتا ہے۔ اس طرح طویل مضامین کو پڑھنا آسان ہو جاتا ہے یعنی ان کی ریڈے بلٹی (readability) بڑھ جاتی ہے۔

یادِرفتگاں کا یہ سلسلہ" وفیات نویسی'' ہی کی ایک قسم ہے۔ اردو میں وفیات نویسی کی روایت بہت مستحکم ہے۔ اس طرح کی چند ایک کتابوں میں صرف ولادت و وفات کی تواریخ ملتی ہیں۔ بعض میں مختصر کوائفِ زندگی اور بعض میں مرحومین کی خدمات اور کارناموں کا ذکر ہے، کہیں لکھنے والا مرحوم سے اپنی ملاقاتوں کی یادیں تازہ کرتا ہے، مثلاً سید سلیمان ندوی معارف میں ہر ماہ وفات پانے والے مشاہیر پر تعزیتی شذرے لکھا کرتے تھے۔ فضل ربی ندوی نے یہ شذرات مرتب کر کے یاد رفتگاں کے نام سے شائع کر دیے۔ یہ شذرے بالعموم مختصر ہیں، نصف صفحے، ایک صفحے یا دو تین صفحوں کے ہیں مگر کوئی شذرہ طویل بھی ہے، جیسے

Marfat.com

مولانا حمید الدین فراہی (۲۳ صفحات) مولانا شبلی نعمانی، مولانا اشرف علی تھانوی (۱۶ صفحات) مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۸ صفحات) پر شذرات۔ اسی طرح مرحوم ماہر القادری بھی فاران میں ہر ماہ دو تین مرحوم احباب و اکابر کو یاد کرتے تھے۔ یہ مضامین بھی یادِ رفتگاں کے عنوان سے دو جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔ ماہر صاحب نے زیادہ تر اپنے مشاہدات اور مرحومین سے اپنے تعلقات کی روداد قلم بند کی ہے۔

معروف محقق اور مصنف آنجہانی مالک رام نے تذکرۂ معاصرین کے نام سے چار کتابیں شائع کی تھیں۔ پہلی ۱۹۷۲ء اور آخری ۱۹۸۲ء میں۔ وفات یافتہ ادیبوں اور شاعروں کا یہ تذکرہ خاصا مقبول ہوا تھا۔ حافظ صاحب کی زیرِ نظر کتابیں بھی اسی سلسلۂ وفیات کی کڑی ہیں، مگر ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر، بلکہ تقریباً تمام تر دینی اور تحریکی شخصیات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر جماعتِ اسلامی سے متعلق لوگ ہیں لیکن دیگر دینی طبقوں اور مسالک سے تعلق رکھنے والوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

جماعتِ اسلامی برعظیم کی اسلامی تحریکوں میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی تاریخ پر چند ایک کتابیں ضرور لکھی گئی ہیں (آباد شاہ پوری، سید اسعد گیلانی، ولی رضا نصر) مگر رجالِ جماعت پر ابھی تک کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ پروفیسر افتخار احمد مرحوم نے عالمی تحریکی شخصیات پر ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جو ناتمام رہ گیا۔ سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے رجال پر غلام رسول مہر نے تین کتابیں: جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کے مجاہدین مرتب کر کے ایک بڑا قابل قدر کام کیا۔

حافظ محمد ادریس صاحب کا زیرِ نظر کام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، مگر ان سب سے آگے کی چیز ہے اور اسی لیے ایسی کتابوں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ یہ نہ صرف جماعت بلکہ تجدید و احیائے ملت کی تاریخ کا ایک بڑا نمایاں باب ہے جسے وہ رقم کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ جماعت کے اہلِ قلم کی طرف سے وہ ایک فرضِ کفایہ ادا کر رہے ہیں، تو غلط نہ ہوگا۔

درخواست ہے کہ حافظ صاحب اس سلسلے کو، جب تک ممکن ہو، جاری رکھیں۔ اس درخواست میں زیرِ نظر کتاب کے جملہ قارئین میرے ہم نوا ہوں گے۔

رفیع الدین ہاشمی

۲۲ر ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ

۵ر مارچ ۲۰۱۳ء

Marfat.com

عرضِ مصنّف

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں!

دنیا کی عارضی زندگی سے عقبیٰ کی دائمی حیات کی جانب سفر کا سلسلہ تخلیق آدم کے دور سے جاری ہے اور یہ تا قیامت جاری رہے گا۔ اللہ ربِ کائنات اور خالقِ حقیقی ہے۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی اور مسافر ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسانوں میں سے ایک اچھی خاصی تعداد اپنے خالق و مالکِ حقیقی کے وجود کی منکر رہی ہے، مگر اسی خالق کی برپا کردہ موت کا انکار ان منکرین حق تعالیٰ میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتا۔ موت تمام معاشروں میں ہمیشہ سے اپنا کام کرتی چلی آرہی ہے۔ موت سے اگر کسی انسان کو رستگاری ہوسکتی تو وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے مگر آپ بھی اپنی حیاتِ مستعار پوری کرنے کے بعد اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس چلے گئے۔

بہ گیتی گر کسے پایندہ بودے
ابو القاسم محمدؐ زندہ بودے

لوگ دیکھتے ہیں کہ موت یوں آتی ہے کہ نظروں سے اگرچہ غائب ہے مگر کام وہ کر جاتی ہے جو واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس موت کا یہ ہنگامہ قیامت تک برپا رہے گا اور پھر انسانوں کے دوبارہ زندہ کیے جانے، ان کے امتحانی نتائج مرتب ہوجانے اور ان میں سے ہر ایک کا مقام متعین کیے جانے کے بعد موت کو جنت اور دوزخ کے درمیان مجسم صورت میں جنتیوں اور دوزخیوں کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا جائے گا۔ اس روز موت ایک مینڈھے کی شکل میں ہوگی۔ اس سے پہلے انسانوں کے بارہا چاہنے کے باوجود موت نہیں مر سکتی، نہ اس کا ہنگامۂ دلدوز رک سکتا ہے۔
جانے والے چلے جاتے ہیں، اپنی یادیں اور آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اچھے لوگوں کی یادیں بھی

Marfat.com

حسین ہوتی ہیں اور آثار بھی نفع بخش وثمر آور جبکہ برے لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے "انا نحن نحی الموتیٰ ۔۔۔۔۔(سورہ یٰسین ۳۶:۱۲)

"ہم یقیناً ایک روز مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انھوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جارہے ہیں، اور جو کچھ آثار انھوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کررہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔"

جن لوگوں کو آپ زندگی میں جانتے ہیں۔ جن سے آپ کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں اور جن سے آپ کا محبت واپنائیت، دوستی واخوت اور ہم نظری وہم آہنگی کا رشتہ ہوتا ہے، وہ موت کی وادی میں چلے جانے کے بعد آپ کی دعاؤں کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کا اچھے انداز میں ذکر کرنے کا حکم حدیث پاک میں دیا گیا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے ان کا حق بھی ہے کہ ان کی موت کے بعد انھیں فراموش نہ کر دیا جائے بلکہ ان کا ذکر خیر زندہ رکھا جائے۔ راقم نے اپنے قلم سے اسی ذمہ داری کو ادا کرنے کی کاوش کا ارادہ سال ہا سال قبل کیا تھا۔ یہ ذمہ داری اچھے انداز میں ادا نہ ہوسکنے کا احساس ہے۔ بہت سے قریبی احباب، محبت کرنے والے ساتھی اور سرپرستی ومشفقانہ راہ نمائی کرنے والے مرحومین پر بروقت قلم نہ اُٹھایا جاسکا۔ یادیں بہت سی وابستہ تھیں مگر محفوظ نہ کی جاسکیں۔ اس کوتاہی کا احساس کبھی کبھی تڑپا دیتا ہے۔ جن پیاری شخصیات پر قلم اُٹھانے کی توفیق ملی، ان پر لکھنے سے قبل ان کے قریبی ساتھیوں اور اہل خاندان سے ملاقات ضروری سمجھی۔ بعض احباب کا تذکرہ تفصیلاً ہوا، بعض کا قدرے مختصر مگر ہر ایک کے حالات قلم بند کرتے ہوئے ہمیشہ احساس رہا کہ کام بڑا نازک، مشکل اور ذمہ دارانہ تقاضوں کا حامل ہے۔

اس میدان میں اگر کوئی دوسرا تحریکی معاصر قدم رکھ دیتا تو میں اپنا قلم روک لیتا مگر جو اس موضوع کا حق ادا کر سکتے تھے، انھوں نے نہ معلوم کن وجوہ سے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس خلا کو دیکھ کر یہ ناکارہ قلم مسافر عدم اس میدان میں اُترا۔ اب تک اس سلسلے کی پانچ کتب چھپ چکی تھیں۔ اب یہ چھٹی کاوش منظر عام پر لانے کی نوبت آگئی ہے۔ اس نئی جلد میں ۲۳ شخصیات کا تذکرہ ہے۔ پہلے کی کتب میں مجموعی طور پر ۱۴۰ خواتین وحضرات پر قلم اُٹھانے کی توفیق ملی، میری دلی خواہش

۱۱۷۴۲۵

Marfat.com

ہے کہ کوئی دوسرا ساتھی اس ذمہ داری کو سنبھال لے اور میں جہاں تک یہ کام کر سکا ہوں، وہیں قلم روک لوں۔ اللہ کرے کوئی دردِ دل رکھنے والا بھائی بہن آگے بڑھے اور یہ میدان سنبھال لے۔

اللہ کے نیک و صالح بندے ہر دور میں رہے ہیں۔ صحابہ کرام بطور جماعت ایک ایسی مثال ہیں کہ جن کی نظیر تاریخ انسانی میں نہ ان سے قبل ملتی ہے، نہ ان کے بعد یہ ممکن ہے۔ ہاں البتہ یہ حقیقت ہے کہ جماعتِ صحابہ کے نقوش پا تازہ ہیں اور ہمیشہ تازہ رہیں گے اور ان نقوش پر چلنے کی کوشش امتِ مسلمہ نے گذشتہ چودہ صدیوں کے ہر دور میں کی ہے، اگرچہ قلیل تعداد میں۔ خوش قسمت مسلمان وہی ہے جو صحابہ کے راستے کا راہی بن جائے کیوں کہ صحابہ کی زندگیاں سیرتِ مطہرہ علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کا پرتو تھیں۔ صحابہ کرام کے دورِ سعید کا جب بھی کوئی مستند واقعہ کسی مجلس میں پیش کیا جائے تو مخلص اہل ایمان کے دلوں پر دستک ہوتی ہے اور آنکھیں نم آلود ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ یہ واقعات سننے کے بعد اکثر لوگ دل میں خیال کرتے ہیں کہ کہاں وہ خوش نصیب نفوسِ قدسیہ جن کا تزکیہ و تربیت مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کی تھی اور کہاں ہم دورِ انحطاط کے مسلمان؟ اسی کے ساتھ مخلص سامعین بڑی سنجیدگی سے یہ سوال، بلکہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ دورِ جدید کے اہلِ دین کے تذکرے کیوں نہیں کیے جاتے جن کی زندگیوں میں صحابہ کے اخلاق و کردار کا عکس کسی نہ کسی طور نظر آتا ہو؟ یہ سوچ بلاشبہ مثبت اور ایمانی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ میں نے صحابہؓ و صحابیاتؓ پر بھی قلم اٹھایا اور پھر اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہم عصر شخصیات کے احوال جاننے اور پھر لکھنے کی کاوش کی۔

میری سب سے پہلی پیش کش جس پر دورِ طالب علمی میں کام شروع کر دیا تھا ''روشنی کے مینار'' کے عنوان سے بیس صحابہ کرام کے احوال و واقعات پر مشتمل تھی۔ اس کی حیثیت طالب علمانہ کاوش ہی کی ہے۔ اس کے بعد میری دوسری کتاب قرآنی دعاؤں پر مشتمل تھی جس کا عنوان ہے ''رحمان کے سائے میں''۔ ان دو تصانیف کے بعد میں نے ہم عصر شخصیات پر ''یادِ رفتگان'' کے تحت مضامین لکھے جو بکھرے بکھرے اور منتشر رہے۔ بعد میں یہ ''مسافرانِ راہِ وفا'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے۔ یہاں سے یہ سلسلہ چل نکلا۔ دوسری کتاب ''چاند اور تارے'' کے نام

Marfat.com

سے مرتب ہو کر چھپی۔ پھر یہ کام ”عزیمت کے راہی“ کے عنوان سے جاری رہا۔ اب اس عنوان کے تحت یہ جلد چہارم ہے اور مجموعی طور پر اس سلسلے کی یہ چھٹی کڑی ہے۔ ان شخصیات کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے آدمی سوچتا ہے کہ یہ تو ہمارے ہی دور کے مسافران تھے، پھر ان کے اخلاقِ عالیہ اور کردارِ درخشاں کو اپنانے کا جذبہ بھی اللہ کی توفیق سے دل میں جڑ پکڑنے لگتا ہے۔ یہی جذبہ کسی نہ کسی درجے میں عمل کا روپ دھار لیتا ہے اور یہی ان تحریروں سے مقصود ہے۔ اللہ اس کٹھن کام میں احقر کے قلم سے ہونے والی ہر لغزش کو معاف فرمائے اور مثبت و مفید نکات کو شرفِ قبولیت بخش کر گناہوں کا کفارہ بنادے۔ یہی مطلوب و مقصود ہے۔

”عزیمت کے راہی“ جلد چہارم کا دیباچہ لکھنے کی درخواست برادرم مکرم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے کمال محبت و شفقت سے قبول فرمائی۔ ہاشمی صاحب آج کے دور کے کہنہ مشق ادیب اور مصنف و محقق ہیں۔ ان کے تربیت یافتہ بے شمار ادباء اور قلم کار زندگی کے مختلف میدانوں میں اور ادب کی مختلف اصناف میں اپنی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔ اس دور میں ہاشمی صاحب مرجع ادب و تحقیق کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے میری اس ٹوٹی پھوٹی کاوش پر ایک نظر ڈالی اور پھر وہ قیمتی سطور رقم فرمائیں جو اس کتاب کی زینت بنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہاشمی صاحب کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ جہاں کوئی تسامح محسوس کریں، معلومات کی تصحیح و تصویب ضروری سمجھیں یا کوئی کمی بیشی کرنا مناسب خیال کریں تو بلاتکلف ہمیں مطلع فرمائیں۔ ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان تمام احباب کے درجات بلند فرمائے، جن کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی

Marfat.com

مجاہدِ ملت قاضی حسین احمد

(۱۹۳۸ء-۲۰۱۳ء)

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

۵ اور ۶ رجنوری ۲۰۱۳ء کی درمیانی شب ڈیڑھ بجے کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلیفون ذرا فاصلے پر لاؤنج میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت جو فون آیا ہے وہ معمول کا فون نہیں ہے، معلوم نہیں کیا خبر لایا ہے، اللہ خیر کرے۔ میں جلدی سے بستر سے نکلا، ریسیور اٹھایا۔ منصورہ ایکسچینج آپریٹر برادرم عبدالودود خان نے نہایت غمگین اور گلوگیر لہجے میں انتہائی اندوہناک خبر سنائی۔ دل یقین نہیں کر رہا تھا مگر ایسی خبر مرکزی ایکسچینج سے جھوٹی نہیں ہوسکتی تھی۔ عبدالودود کو قاضی صاحب کے ساتھ جماعت کے ہر کارکن کی طرح بے پناہ محبت ہے مگر اس کا ایک اور تعلق بھی کئی سال تک قاضی صاحب سے بہت قریبی رہا۔ اس نے قاضی صاحب کے گارڈ کی حیثیت سے ان کے سفرو حضر میں ان کا ساتھ دیا۔ اس کا تعلق بھی صوبہ خیبر پختونخواہ سے ہے۔ میری زبان پہ بے ساختہ آ گیا۔ یہ خبر کس نے دی ہے اور کب؟ اس نے کہا اسلام آباد سے قاضی صاحب کے بچوں نے ابھی اطلاع دی ہے۔ تر آنکھوں کے ساتھ میری زبان پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ جاری ہوگیا۔ پھر میں نے اپنے اہلِ خانہ کو اطلاع دی۔ ہر شخص غمزدہ اور دم بخود تھا۔ تحریکِ اسلامی، ملتِ اسلامیہ پاکستان، پورے عالم اسلام اور دنیا بھر کی جہادی تحریکوں کے لیے یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ یہ خبر ظاہر ہے پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں لمحات میں پھیل گئی۔ بس پھر کیا تھا، اطلاع دینے کے لیے اور اس اطلاع کی تصدیق و تفصیل جاننے کے لیے ٹیلیفون کالوں اور موبائل پر ایس ایم ایس پیغامات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہر جنازے پر کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ کی تلاوت

Marfat.com

کر کے پر تاثیر تذکیر کرنے والا عظیم مربی و مزکی آج خود اس آیت کے مطابق دنیائے فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ دل کہتا تھا کہ کاش آج موت کو موت آجاتی مگر نہیں، بے چاری موت اور فرشتۂ اجل سب اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں!

علمی و جہادی گھرانا

قاضی حسین احمد اپنے پانچ بھائیوں اور پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ زیارت کا کا صاحب کے ایک دینی و علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد صاحب مولانا قاضی عبدالربؒ اور دادا جان قاضی دُرِ مکنونؒ، ماموں جی مولانا لطف اللہؒ اور نانا ابو مولانا عبدالحق جہانگیرویؒ، سبھی اجل علما تھے۔ دیوبندی مکتبِ فکر کے قائدین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ خاندان کے بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف جہادی تحریک بھی چلائی اور قاضی صاحب کے ننھیال و ددھیال میں کئی بزرگان شہادت سے بھی سرفراز ہوئے۔ یوں یہ خاندان محض علمی روایات ہی کا وارث و امین نہیں تھا بلکہ جہادی معرکوں کا بھی شہ سوار تھا۔ مولانا عبدالقدوس قاسمیؒ، مولانا عبدالسبوح قاسمیؒ، قاضی عطاء الرحمٰنؒ، ڈاکٹر عتیق الرحمان اور خود قاضی صاحب دینی و عصری علوم سے بہرہ ور تھے۔ قاضی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پھر اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن اور جامعہ پشاور سے ایم ایس سی جغرافیہ میں تعلیم مکمل کی۔ کچھ عرصہ تک وہ جہانزیب کالج سیدو شریف (سوات) میں بطور لیکچرر بھی کام کرتے رہے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر پشاور میں اپنا کاروبار منظم کیا۔ اللہ نے ان کے کاروبار میں بڑی برکت دی۔ یہ میڈیسن کا کاروبار تھا جو اب تک ڈائگنوسٹک سنٹر بن کر بخیر و خوبی چل رہا ہے۔ قاضی صاحب کی اہلیہ، چاروں بچے عزیزم آصف لقمان قاضی، عزیزی ڈاکٹر انس فرحان قاضی، عزیزہ ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی اور عزیزہ خولہ سلجوقی سبھی جماعت کی اگلی صفوں میں کام کر رہے ہیں بلکہ پورا خاندان جو سیکڑوں ارکان پر مشتمل ہے، اسی فکر کا داعی اور اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے جو خاندان کے اس نایاب سپوت نے اپنایا اور زندگی بھر نبھایا۔ آخری وقت میں بھی اپنے بچوں کو وصیت فرمائی کہ جماعت اسلامی کا ساتھ کبھی اور

Marfat.com

کسی حال میں بھی نہ چھوڑنا۔ زندگی بھر اس راہ پہ گام زن رہنا جس پہ میں نے اپنی ساری زندگی پوری یک سوئی کے ساتھ گزاری ہے۔

سید مودودی کا جانشین

قاضی صاحب زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے متاثر ہوئے، خاندان کا ماحول دیوبندی اور جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ کی فکر سے متصادم نہیں تو اختلافی ضرور تھا۔ قاضی صاحب کے دو بڑے بھائی جناب عطاء الرحمان اور ڈاکٹر عتیق الرحمان بھی جمعیت کے سرگرم کارکن تھے۔ ان کے بزرگوں کی وسعتِ ظرفی تھی کہ عمومی طور پر علمائے دیوبند کے برعکس انھوں نے اپنے ہونہار سپوتوں کے اس راستے پر چلنے کی مزاحمت نہیں کی۔ قاضی صاحب عملی زندگی میں داخل ہوئے تو فوراً جماعت کے کارکن بنے۔ پھر ۱۹۷۰ء میں جماعت کے رکن بن گئے۔ زمانۂ طالب علمی میں اپنے بھائی ڈاکٹر عتیق الرحمان صاحب کے پاس لاہور آیا کرتے تھے، جو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں زیر تعلیم اور کالج کے ہاسٹل میں رہائش پذیر تھے۔ اسی عرصے میں مرکز جماعت اچھرہ میں مولانا مودودیؒ سے ان کی براہِ راست ملاقاتیں ہوئیں اور مولانا کی شخصیت کو دیکھتے ہی وہ ان کے گرویدہ ہوگئے۔ کون جانتا تھا کہ صوبہ سرحد کا ایک عام سا طالب علم اور دیوبندی علماء کا سپوت مولانا کی اس تحریک کا بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوگا، نہ صرف اس کی اگلی صفوں میں کام کرے گا بلکہ مولانا کی جانشینی اور جماعت کی قیادت کی ذمہ داری بھی اللہ اس سے لے گا۔ اس میدان میں اللہ کا یہ بندہ امارت وقیادت کے مقام پر فائز ہوا تو سید مودودیؒ کی طرح سر سے کفن باندھ کر گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی پیچھے کی طرف دیکھنے کی بجائے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ سیّد نے جو نقوشِ پا چھوڑے تھے وہ تو قیامت تک آنے والے قافلوں کے لیے جرأت و حوصلے کا سامان پیدا کرتے رہیں گے۔ قاضی صاحب نے بھی ان نقوشِ پا پر چل کے دکھایا اور ہر آمر کو للکارتے رہے۔ ان کی جدوجہد کا سارا زمانہ معترف ہے، دوست بھی اور دشمن بھی!

مثلِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی!

Marfat.com

اقبال کا شاہین

قاضی صاحب سید مودودیؒ کے پیروکار اور علامہ اقبالؒ کے مدّاح وفدا کار تھے۔ انھیں کلامِ اقبالؒ، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں، یوں مستحضر تھا کہ بسا اوقات احساس ہونے لگتا جیسے پورا کلام انھیں ازبر ہے۔ وہ کئی بار خود فرماتے کہ لوگ مبالغہ کرتے ہوئے انھیں کلام اقبال کا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ ہم ان کا یہ تبصرہ سن کر کہا کرتے تھے کہ اس میں کوئی مبالغہ تو نظر نہیں آتا۔ آپ جس موضوع پر گفتگو کریں خواہ تقریر ہو یا انٹرویو، آپ کا خطبہ ہو یا کوئی مضمون، ڈرائنگ روم میں گپ شپ ہو یا کوئی پریس کانفرنس کلامِ اقبالؒ اس میں پھولوں کی طرح مہکتا اور موتیوں کی طرح چمکتا ہے۔ میں تو کلامِ اقبالؒ کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ کے بے شمار اشعار قاضی صاحب پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کلام اقبال کا بیشتر حصہ آفاقی اور عالمگیر حقیقتوں پر مشتمل ہے مگر ان کے اشعار کے مطابق جب بھی اور جو بھی اپنے آپ کو جس قدر ڈھال لے گا یہ اشعار اس کا لباس اور اوڑھنا بچھونا بن جائیں گے۔ قاضی صاحب ایسی ہی شخصیات میں سے ایک انقلابی شخصیت تھے۔ یوں سمجھیے کہ وہ اقبال کے شاہین تھے۔ راقم الحروف کو قاضی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا براہ راست طویل موقع نصیب ہوا۔ یہ عرصہ ستائیس سال پر محیط ہے۔ ان کو سفر وحضر میں، امن وحرب میں، اندرونی وبیرونی محاذوں پر، آسایش وراحت اور ابتلا وآزمایش میں، ہر جگہ دیکھنے اور پرکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کا تصور آتا ہے تو وہ اس شعر کا مصداق نظر آتے ہیں۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر، میرِ کارواں کے لیے

آتشِ نمرود اور عشقِ بے تاب

قاضی صاحب آتشِ نمرود میں بے خطر کود جایا کرتے تھے۔ اگر کوئی ناصح وخیراندیش خطرات کی سنگینی کا حوالہ دے کر احتیاط وپرہیز کی ترغیب دیتا تو جواب میں کہا کرتے تھے کہ ہم تو درویش

Marfat.com

ہیں، کندھے پہ ردائے درویشی لیے پھرتے ہیں۔ ہم سے کوئی کیا چھین لے گا۔ ہم اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے کیوں پسپائی و مداہنت اختیار کریں۔ ہم درویشی کی چادر جہاں چاہیں بچھالیں!

نہ تخت و تاج میں نَے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

یہ شعر بھی قاضی صاحب کی زبان سے بارہا سنا، جو فی الحقیقت ان کی آزادیٔ طبع اور فکری حریت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے!

چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسّس قاضی صاحب کی پہچان تھی، ہر لحظے اپنی منزل کی جانب بڑھتے رہنے کی آرزو اور سنگلاخ وادیوں میں جرأت مندانہ پیش قدمی!

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیِ دانش و فرہنگ
نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو!
حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی
تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر
مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ!

قاضی صاحب نے جو مجلس بھی سجائی، امت کے درد کا مداوا کرنے، ظلم کے خاتمے اور عدل و انصاف کے قیام کی فکر ہی ان پر غالب رہی۔ کلمۃ اللہ کی سربلندی ان کا مطمحِ نظر تھا اور اس راستے میں شہادت ان کی تمنا۔ وہ جہاد کرتے ہوئے ہی اللہ کے دربار میں گئے ہیں۔ ان کا درجہ حدیث

Marfat.com

کے مطابق شہید کا ہے

آسماں سجدہ کند برسرِ خاکے کہ براُو
یک دو تن، یک دو نفس، بہرِ خدا می نشیند

پہلی ملاقات اور مابعد

پہلی بار قاضی صاحب سے پشاور میں ان کے کاروباری دفتر میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ پشاوری چائے اور بسکٹوں سے تواضع کی۔ ان کی شخصیت ظاہری طور پر بھی بہت پرکشش تھی اور ان کے چہرے سے احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے اندر انقلابی روح لیے بیٹھے ہیں۔ بعد کے ادوار میں قاضی صاحب پشاور شہر کے امیر جماعت، پھر صوبہ سرحد کے صوبائی امیر بنے۔ میں اس دور میں بیرون ملک تھا۔ جماعت کے مرکزی و صوبائی قائدین کے بارے میں دوست احباب کے خطوط سے معلومات ملتی رہتی تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ضیاالحق کے مارشل لا میں پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کی جماعتوں نے انتخابات کے لیے بنیادی انتظامات اور دیگر امور نپٹانے کی خاطر جنرل ضیاالحق کی درخواست پر عبوری حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے یہ خبر اچھی تو نہ لگی مگر چونکہ یہ اجتماعی فیصلہ تھا اس لیے بیرون ملک بیٹھے ہوئے ہم لوگوں نے بھی اسے قبول کرلیا۔ اسی دور میں معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی کے قیم چودھری رحمت الٰہی صاحب، پروفیسر غفور احمد صاحب اور محمود اعظم فاروقی صاحب کے ساتھ جماعت کی تین رکنی ٹیم میں کابینہ میں چلے گئے ہیں۔ صوبہ سرحد کے امیر قاضی حسین احمد صاحب کو مرکز جماعت میں میاں صاحب کے ساتھ قیم کی ذمہ داری پر فائز کردیا گیا ہے۔ کینیا میں ہمارے ساتھی قاضی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ مجھ سے انھوں نے تبصرہ مانگا تو میں نے مختصر طور پر کہا: ''امیر و قیم دونوں اپنی اپنی ذات میں خوب ہیں، بزرگی کا ہوش اور جوانی کا جوش مل کر حسین امتزاج قائم کریں گے۔''

Marfat.com

کینیا آنے کی دعوت

اس دوران جب پہلی مرتبہ پاکستان آیا تو منصورہ میں قائدین سے ملاقات کے دوران قاضی صاحب سے بھی تفصیلی تبادلۂ خیالات ہوا۔ وہ اس زمانے میں زیادہ تر تنظیمی دورے اور جماعتی امور نپٹا رہے تھے۔ مجھ سے کینیا کے حالات پوچھتے رہے اور پھر فرمایا: ''اس ملک کو دیکھنے کا شوق ہے، کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ ضرور وزٹ ہوگی۔'' میں نے عرض کیا کہ ہمیں آپ کی آمد کی بڑی خوشی ہوگی۔ چنانچہ اس کے جلد ہی بعد ڈاکٹر سید مراد علی شاہ صاحب کے ہمراہ سوڈان میں ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد کینیا تشریف لائے۔ ان کی آمد کی اطلاع ہمیں پہلے سے مل چکی تھی۔ ہم نے ان کے لیے کئی پبلک خطابات اور اپنے تمام مراکز کے دوروں کا پروگرام ترتیب دیا۔ یہ پروگرام خاصے ٹائٹ تھے اور بعض مقامات کا سفر بھی طویل مگر قاضی صاحب ہمارے اس شیڈول کے مطابق پوری مستعدی اور مسرت کے ساتھ ہر پروگرام میں شریک ہوئے۔ جناب قاضی صاحب کا وہ دورہ یادگار تھا۔ اس سے قبل امیر جماعت محترم میاں طفیل محمد صاحب اور مولانا خلیل حامدی صاحب بھی کینیا کا دورہ کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر خورشید احمد صاحب اور خرم مراد صاحب بھی اپنی شفقتوں سے نواز چکے تھے۔

فرمودۂ قلندر

نیروبی کی مرکزی جامع مسجد ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں قاضی صاحب کا خطاب ''جہادِ افغانستان'' کے موضوع پر تھا۔ اس زمانے میں جہاد اپنے جوبن پر تھا اور پوری دنیا کی نظریں اس جہاد کے نتائج کی تلاش میں تھیں۔ ابھی کافی سفر باقی تھا مگر قاضی صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ میں اپنے بھائیوں کی خدمت میں یہ بشارت اور پیشگی مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ان شاء اللہ سوویت یونین کا قبرستان سرزمینِ افغانستان ہوگی۔ پھر انھوں نے فرمایا ''ہمارے دانش ور یہ بات کہتے نہیں تھکتے کہ روس جہاں بھی جاتا ہے کبھی واپس نہیں پلٹتا اور یہ بائیں بازو کے دانش ور اپنے اس دعوے کو تاریخی حقیقت قرار دیتے ہیں۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں

Marfat.com

کہ روس کے بارے میں یہ خودساختہ حقیقت محض پروپیگنڈا ہے جبکہ اس سے بڑی، پائیدار اور ثابت شدہ حقیقت یہ ہے کہ غیرت مند افغانوں نے تاریخ کے کسی دور میں غلامی قبول نہیں کی۔ وہ آزادی کے متوالے اور اس کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کے جذبے سے سرشار ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کی فوج کا جو انجام افغانستان میں ہوا تھا اسے انگریز فوج اور ان کے مورخین آج تک نہیں بھولے۔ روس کا انجام ان سے بھی زیادہ عبرت ناک ہوگا۔'' کینیا کے بہت سے احباب روس کی شکست اور اس کی فوجوں کی پسپائی کے بعد قاضی صاحب کے ان الفاظ کو یاد کرتے تھے اور اہلِ دانش پکار اٹھتے تھے: ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید''۔

رازدانِ افغانان

قاضی صاحب افغانوں کی تاریخ، افتادِ طبع، نسلی و ملّی روایات ہر چیز سے بخوبی واقف تھے اور پھر روس کے مقابلے پر جہادِ افغانستان میں تو وہ اگلے مورچوں پر جا کر خود، سربکف افغان و دیگر نسلوں کے مسلمان مجاہدین کے ساتھ جنگ میں شریک بھی ہوئے تھے۔ ان کی بات محض علمی تجزیے کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ عملی طور پر وہ اس کے جملہ رموز و اسرار اور نشیب و فراز کو جانتے تھے۔ اس جہاد کے دوران وہ جب بھی افغانوں کی فتح اور روس کی شکست کا تذکرہ کرتے، پورے ایمان و یقین کے ساتھ کرتے۔ افغانوں کی تعریف سے اقبال کا کلام بھرا پڑا ہے۔ قاضی صاحب اس معاملے میں علامہ کے اشعار اپنی تقاریر و خطابات اور مضامین و مقالات میں یوں پیش کرتے تھے کہ وہ نگینوں کی طرح چمکتے اور پھولوں کی طرح مہکتے تھے

آسیا یک پیکرِ آب و گلِ است
مِلّتِ افغاں در آں پیکر دل است
از فسادِ او ، فسادِ آسیا
درکشادِ او ، کشادِ آسیا!

اسی طرح اردو میں علامہ کی ہر کتابِ شعر و سخن میں بھی جگہ جگہ غیور افغانوں کا ایمان افروز

Marfat.com

تذکرہ ملتا ہے

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفت سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے ، وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردئ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
اخلاصِ عمل مانگ نیا گانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!

سفر و حضر

۱۹۸۵ء میں مرکز جماعت کے حکم پر میں کینیا سے واپس پاکستان آیا۔ مرکز جماعت میں رپورٹ کی تو محترم میاں طفیل محمد صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں مرکزی نظم میں بطور نائب قیم ذمہ داری ادا کروں۔ میں نے امیر جماعت کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا۔ اس وقت قاضی صاحب قیم جماعت تھے اور محترم چودھری محمد اسلم سلیمی صاحب ان کے ساتھ نائب قیم کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس عرصے میں میری ذمہ داری فیلڈ میں تنظیمی و تربیتی امور سے متعلق اور ملک بھر میں مسلسل دورے اور پروگراموں میں شرکت تھی۔ اکثر قیم جماعت کے ساتھ اکٹھے سفر کرنے کا موقع ملا۔ کئی پروگراموں میں ان کے ساتھ شرکت کیا کرتا تھا۔ سفر میں ان کی نفاستِ طبع اور بھی کھل کر سامنے

Marfat.com

آئی۔ ڈرائیور اگر بلا وجہ ہارن بجاتا تو سرزنش فرماتے کہ ہارن ناگزیر ضرورت کے بغیر بجانا تہذیب وثقافت کے خلاف ہے۔ ان کے ساتھ چلنے والے ڈرائیور بہت محتاط ہوا کرتے تھے۔ غلط اوورٹیکنگ یا پیدل چلنے والوں کا خیال نہ رکھنے پر قاضی صاحب ناراض ہوا کرتے تھے۔ خوش خوراک تھے مگر میں نے بارہا دیکھا کہ نہایت سادہ اور روکھا سوکھا کھانا بھی ملا تو اسی طرح شوق سے کھایا جس طرح اپنے مرغوباتِ اکل وشرب شوق سے کھاتے پیتے تھے۔ کبھی کسی چیز کو ناپسند نہیں کیا۔

منصبِ امارت

قاضی صاحب اور راقم مغربی اور جنوبی اضلاع کے طویل تنظیمی دورے پر تھے جب ۱۹۸۷ء میں امارتِ جماعت کے لیے انتخاب ہو رہا تھا۔ مظفر گڑھ میں رات کے وقت ہمیں ٹیلیفون سے اطلاع ملی کہ امیر جماعت کے انتخاب کا نتیجہ آگیا ہے اور ناظمِ انتخاب نے امیر جماعت میاں طفیل محمد صاحب کی خدمت میں یہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے مطابق قاضی حسین احمد صاحب کو امیر منتخب کیا گیا تھا۔ یہ خبر سن کر قاضی صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے اور پھر اللہ سے اپنے لیے خود بھی استقامت کی دعا کی اور تمام دوستوں سے بھی یہی درخواست کی۔ جماعت کے حلقوں میں بحیثیتِ مجموعی اس نتیجے سے خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ فیلڈ میں کام کرنے والے کارکنان و ذمہ داران بالخصوص نوجوان چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی کو زیادہ زور وشور سے میدان میں نکلنا چاہیے۔ قاضی صاحب نے اپنے بائیس سالہ دورِ امارت (۱۹۸۷ء تا ۲۰۰۹ء) میں جماعت کو عوامی اور پاپولر سیاسی جماعت بنانے کے لیے مختلف منصوبے شوریٰ کے سامنے پیش کیے۔ یہ تمام منصوبے مشاورت میں کثرتِ رائے یا اتفاقِ رائے سے طے کیے جاتے رہے۔ ان میں پاسبان اور شباب ملی کا قیام، پاکستان اسلامک فرنٹ کا قیام، ملی یکجہتی کونسل، شریعت محاذ، ممبر سازی مہم اور مختلف دیگر پلیٹ فارم انھی کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔ ملک بھر میں کاروانِ دعوت ومحبت اور مختلف مواقع پر دیگر عوامی کارواں اور ریلیاں قاضی صاحب کے ذہنِ رسا اور متحرک قیادت کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ قاضی صاحب کے دورِ امارت میں کافی عرصے کے بعد جماعت اسلامی کے کل پاکستان

Marfat.com

اجتماعاتِ عام مسلسل منعقد ہوئے۔ پہلا نومبر ۱۹۸۹ء میں مینار پاکستان پر ہوا۔ دوسرا نومبر ۱۹۹۵ء میں پھر مینار پاکستان پر۔ تیسرا ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں فیصل مسجد اسلام آباد میں۔ چوتھا اکتوبر ۲۰۰۰ء میں قرطبہ نزد چکری میں۔ پانچواں اکتوبر ۲۰۰۴ء میں اضاخیل، نوشہرہ میں۔ چھٹا نومبر ۲۰۰۷ء شاہ کے بھٹیاں میں ارکان وامیدواران۔ ساتواں اجتماعِ عام اکتوبر ۲۰۰۸ء میں مینار پاکستان میں ہوا۔ ان اجتماعات پر کافی اخراجات ہوئے اور مشاورتوں میں کئی احباب ان کے انعقاد کے خلاف بھی آرا دیتے رہے مگر کثرتِ رائے سے فیصلے ہوئے اور سچی بات یہ ہے کہ ان اجتماعاتِ عام نے جماعت کے کام میں خاصی وسعت پیدا کی اور جمود ٹوٹا تحرّک پیدا ہوا۔

رضا بھی اللہ کے لیے، ناراضی بھی اسی کے لیے

۲۰۰۲ء کے انتخابات سے قبل قاضی صاحب کی کاوشوں سے دینی جماعتوں کا سیاسی اتحاد، متحدہ مجلس عمل وجود پذیر ہوا جس نے انتخابی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ہم ان تمام امور کی تفصیل کسی اور مضمون میں بیان کریں گے۔ قاضی صاحب کے ساتھ بطور امیر صوبہ بارہ سال اور بطور نائب امیر جماعت چھ سال کام کرنے کا موقع ملا۔ قاضی صاحب سے کئی امور میں اختلاف بھی ہوتا تھا۔ جماعت میں اختلافِ رائے کی روایت موجود ہے اور ہر دور میں ہر امیر کے ساتھ حکمتِ عملی کے معاملات میں رفقا نے اختلافِ رائے کیا ہے۔ ایسے کئی مواقع آئے کہ اس اختلاف کی وجہ سے قاضی صاحب نے قدرے ناراضی کا اظہار بھی کیا۔ ان کی ناراضی وقتی ہوتی تھی، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اپنے دل میں گرہ لگالیں کہ فلاں شخص میرا مخالف ہے۔ جو لوگ ہر معاملے اور فیصلے پر قاضی صاحب کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھے تھے ان احباب اور ارکان جماعت کے خلاف بھی قاضی صاحب نے کبھی کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی۔ اپنا معاملہ تو یہ تھا کہ جن باتوں سے اتفاق ہوتا تھا اس کی کھل کر حمایت اور جن سے اختلاف ہو ان کی مناسب فورم کے اوپر مخالفت میں رائے کا اظہار کیا جاتا تھا۔ جب فیصلہ اس رائے کے برعکس ہو جاتا تو راقم نے ہمیشہ اس فیصلے کو اجتماعی فیصلہ سمجھتے ہوئے خوش دلی سے قبول کیا۔ مجھے دو تین مواقع یاد ہیں کہ جب

Marfat.com

قاضی صاحب نے مجلس میں سخت ردعمل کا اظہار کیا مگر بعد میں اس پر معذرت بھی کی اور محبت و دل جوئی کے ساتھ تحسین بھی فرمائی۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ ان کی ناراضی بھی لوجہ اللہ ہوتی تھی اور رضا بھی لوجہ اللہ۔ ناراضی کے بعد جب وہ اعتذار کرتے تو بہت پیارے لگتے تھے!!

حق رائے

۹-۱۰؍جون ۲۰۰۱ء میں منعقدہ مرکزی مجلس شوریٰ کے ایک فیصلے میں طے کیا گیا کہ ہر سطح کے امرا دو میقات پوری کرنے کے بعد تیسری میقات کے لیے ذمہ داری پر مقرر نہیں کیے جائیں گے۔ البتہ امیر جماعت اور صوبائی امرا اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ میں نے اس فیصلے سے قبل یہ رائے دی کہ امرائے صوبہ کو بھی دیگر ذیلی امرا کی طرح استصواب کے ذریعے امیر جماعت مقرر کرتے ہیں، اس لیے ان کی بھی دو میقات کی ذمہ داری کے بعد سبک دوشی ضروری قرار دی جائے۔ ہاں امیر جماعت کا تو انتخاب ارکانِ جماعت کی حتمی رائے کے عین مطابق ہوتا ہے، اس لیے اس میں دستوری لحاظ سے ردو بدل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا استثنا صرف امیر جماعت کو ہونا چاہیے۔ راقم اس وقت پنجاب کا صوبائی امیر تھا۔ میری رائے کے برعکس چونکہ قرارداد منظور ہوچکی تھی، اس لیے میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ تاہم جماعتی دستور کے مطابق اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے اگلے اجلاسوں میں پھر یہ مسئلہ پیش کیا۔ قصہ مختصر اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ ۷ تا ۹ جنوری ۲۰۰۲ء میں بحث و دلائل کے بعد میری یہ تجویز منظور ہوگئی۔ اب اگلے صوبائی استصواب میں مولانا عبدالحق صاحب (امیر صوبہ بلوچستان)، پروفیسر محمد ابراہیم صاحب (امیر صوبہ سرحد)، اسداللہ بھٹو صاحب (امیر صوبہ سندھ) اور راقم الحروف (امیر صوبہ پنجاب) اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوگئے۔ قاضی صاحب نے مجلس شوریٰ میں فرمایا کہ چاروں سابق امرائے صوبہ کو مرکز میں نائب امیر جماعت کے طور پر شامل کرلیا جائے۔ میں نے اصولی طور پر اس رائے کی مخالفت کی۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ضرورت کے تحت کسی ساتھی کا تقرر بطور نائب جماعت کرنے میں کوئی ہرج نہیں مگر یہ روایت کہ جو لوگ امارتِ صوبہ سے فارغ ہوئے ہیں،

Marfat.com

انھیں یہ ذمہ داری سونپی جائے، درست نہیں ہے۔

اطاعت امیر

محترم قاضی صاحب نے باقی تین حضرات کا تقرر فرما دیا اور مجھ سے [ایک مجلس میں بھی] اور انفرادی طور پر بھی پیار بھرا شکوہ کیا کہ میں نے ان کے ساتھ ان کی ٹیم میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا تو میں نے عرض کیا ''حاشا وکلا میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہیں کہ میں آپ کی ٹیم کا حصہ نہیں ہوں۔ میں نے آپ کے ساتھ آپ کے نائب قیم کے طور پر کئی سال پوری دلجمعی کے ساتھ کام کیا۔ پھر بارہ سال بطور امیر صوبہ بھی آپ کے زیر قیادت اپنی صلاحیت واوقات کے مطابق مسلسل کام کیا۔ میں کیسے آپ کی قیادت پر عدمِ اطمینان کا اظہار کر سکتا ہوں؟ آپ میرے قائد ہیں اور بطورِ امیر جماعت میں آپ کے حکم فی المعروف کا مکمل پابند ہوں۔ میں نے تو ایک اصولی بات کی تھی مگر آپ نے مشاورت سے اس کے خلاف فیصلہ فرما دیا۔ میں اپنی اس رائے کے باوجود آپ کے فیصلے کا دل و جان سے احترام کرتا ہوں۔'' فرمانے لگے ''آپ احترام کرتے ہیں تو نائب امیر کی ذمہ داری سے کیوں بھاگتے ہیں؟'' میں نے عرض کیا ''بھاگ کے کہاں جانا ہے، جینا اور مرنا ان شاء اللہ اسی قافلے کے ساتھ ہے۔'' فرمایا ''تو ٹھیک ہے تمھارا تقرر بھی میں نے کر دیا ہے، حلف اٹھاؤ اور کام کرو۔'' میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

فقہی امور

مجالس کی گفتگو اور بحث کے علاوہ دو تین اور امور پر بھی قاضی صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے اختلاف ہوتا تھا مگر اپنے اختلاف کے اظہار کے باوجود ہماری باہمی عقیدت و محبت اور احترام میں کبھی ذرہ برابر بھی رخنہ نہ پیدا ہوا۔ میرے کسی فقہی عمل پر انھوں نے مجھے کبھی برا بھلا نہیں کہا۔ البتہ ان معاملات میں وہ اپنی رائے پر اصرار ضرور کرتے تھے۔ بطور چیئرمین شہدائے اسلام فاؤنڈیشن، میں ان شہدا کے غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا کرتا تھا جن کے جسد خاکی افغانستان میں یا وادیٔ کشمیر میں شہادت کے بعد وہیں دفن کر دیے جاتے تھے۔ محترم قاضی صاحب غائبانہ

Marfat.com

نماز جنازہ کے حق میں نہیں تھے اور وہی کیا تمام حنفی علما اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ رائے دی کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مرتبہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کا عمل ثابت ہے تو میرے نزدیک فقہا کی رائے کے مقابلے میں وہ زیادہ ارجح واولیٰ ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کے بعد کبھی اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔ دوسرے یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہم ہے کہ اگر کوئی عمل مباح ہو اور اس کے ساتھ مصالح عامہ کے تحت کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہو تو اس پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں البتہ اگر کوئی شخص وہ عمل نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے مجبور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جن خاندانوں کے نوجوان شہادت پاجاتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے لختِ جگر کا جنازہ پڑھ سکیں۔ پھر اس جنازے کے ذریعے ایک بڑی تعداد جمع ہو جاتی ہے۔ موقع محل اور شہادت کے واقعات ایسے ایمان افروز ہوتے ہیں کہ مجمع کے سامنے اسلامی دعوت اور جہاد کو اجاگر کرنے کا موثر ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مرحوم کی وسعتِ قلبی کا اس سے پتا چلتا ہے کہ بعد میں چند مواقع پر خود قاضی صاحب نے غائبانہ نماز جنازہ میں شرکت فرمائی، اور اللہ نے ان کی رحلت کے بعد پانچ براعظموں میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ کا بھی اہتمام فرمایا۔ اللہ یہ سب دعائیں اپنے مجاہد بندے کے حق میں قبول ومنظور فرمائے اور ان کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں۔

مسنون نمازِ جنازہ اور سفری نمازیں

دوسری بات نماز جنازہ میں دعا بالجہر کا معاملہ تھا۔ میں جنازے میں سرّی اور جہری دونوں طریقوں پر موقع محل کی مناسبت سے عمل کرتا ہوں کیونکہ یہ دونوں طریقے سنّت سے ثابت ہیں، اس لیے مسنون ہیں۔ قاضی صاحب بھی ایسے مواقع پر جنازے میں شرکت فرماتے تھے مگر خود جہری دعا کے ساتھ جنازہ پڑھانے کے قائل نہ تھے۔ تیسرا معاملہ سفر کے دوران جمع بین الصلوٰتین کا تھا۔ وہ اس کے قائل نہیں تھے۔ بہرحال کبھی کبھار سفر کی نوعیت وکیفیت ایسی ہوتی کہ وہ بھی اس پر عمل فرمالیتے۔ مگر ایسے مواقع بہت شاذ دیکھنے میں آئے۔ قاضی صاحب کے پیش رو میاں طفیل محمدؒ

Marfat.com

بھی جمع بین الصلوٰتین نہیں کرتے تھے۔اس کے علاوہ بھی کئی امور میں اختلاف رائے ہوتا تھا مگر ان کی محبت اور میری عقیدت میں کبھی کوئی رخنہ پیدا نہ ہوا۔وہ بہت عظیم انسان تھے۔ان کا دل سمندر کی طرح وسیع وعمیق تھا اور ان کا حوصلہ ہمالیہ سے بلند تر تھا۔وہ محبت فاتح عالم کی تفسیر تھے۔

اقبال کا یہ شعر ان کی زبان پر بھی ہوتا تھا، ان کے دل میں بھی اور ان کے طرزِ عمل بھی

یقیں محکم، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں!

دیدہ ور

قاضی صاحب نے امت کی راہنمائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔افغانستان ہو یا کشمیر، عراق ہو یا فلسطین، چیچنیا ہو یا برما، بوسنیا و ہرزیگووینا ہو یا فلپائن وہ ہر جہاد کے روح رواں تھے۔انھوں نے ہر ایک جہادی تحریک میں کلیدی کردار ادا کیا اور اس کا اعتراف ان تمام مقامات کے مجاہدین وقائدین کھلے دل سے کرتے ہیں۔سچی بات یہ ہے کہ اس وقت پورے عالمِ اسلام میں ان جیسی ہمہ پہلو اور پرکشش شخصیت کہیں نظر نہیں آتی۔وہ دیدہ ور تھے اور اس وقت تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے انھی کے لیے کہا تھا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

غیور راہ نما

ظالم اور ظلم کو للکارنا قاضی صاحب کے خون میں شامل تھا۔ان کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ مظلوم کو بے یارومددگار چھوڑا جائے۔لاہور کے قریب بھارت کی سرحد سے ملحق علاقوں میں قبضہ گروپوں اور غنڈہ گرد مافیا کے خلاف ان کی جدوجہد بھی لوگوں کو یاد ہے۔کشمیری مسلمانوں کے لیے مسلسل جدوجہد اور ان کی مکمل حمایت قاضی صاحب کی پہچان تھی۔انھوں نے ۱۹۹۰ء میں کشمیری عوام کے ساتھ یوم یک جہتی کے لیے 5 فروری کو ملی و بین الاقوامی دن کے طور پر منانے کا

Marfat.com

اعلان کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس فکر کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ دن اور آج کا دن یہ تاریخ یومِ یک جہتیِ کشمیر کی علامت بن گئی ہے۔ حکومتِ پاکستان نے بھی اسے قومی تعطیل اور یومِ احتجاج کے طور پر تسلیم کر رکھا ہے اور پوری دنیا میں مسلمان اس روز جہاد و حریتِ کشمیر کی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ عظیم صدقۂ جاریہ بھی ہے اور مرحوم کی قبولیتِ دعا کی علامت بھی! بقول اقبال:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن، نئی شان
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان!
یہ راز کسی کو نہیں معلوم، کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!
فطرت کا سرودِ ازلی، اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا، صفت سورتِ رحمان!

جفاکشی و ہمت مردانہ

قاضی صاحب نے اپنے دورِ امارت میں جو کاروانِ دعوت و محبت چلایا تھا اس نے ملک بھر میں لسانی و نسلی اور سیاسی و مذہبی نفرتوں کے مقابلے میں اسلامی اخوت و محبت کا پرچار کیا۔ مہینے بھر کی یہ کٹھن مہم بہت مشکل اور تھکا دینے والی تھی۔ ہر روز نیا سفر اور نئی منزلیں، قیام و طعام کے مسائل و مشکلات، سفر کی تھکاوٹ اور بے آرامی، کوئی چیز قاضی صاحب اور ان کے کاروان کے لیے سدِ راہ نہ بن سکی۔ مذہبی و دینی جماعتوں کے درمیان روایتی و تاریخی دوریاں، نفرتوں کے الاؤ بھڑکانے کا سبب بن رہی تھیں۔ اس آگ کو بجھانا ملک و ملت کے مفاد و سلامتی کا تقاضا تھا مگر یہ کام کوئی آسان نہ تھا۔ قدم قدم پر مشکلات اور رکاوٹیں، راستے تنگ اور گلیاں بند، کئی لوگ اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیتے۔ قاضی صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور بڑے عزم اور قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے، اپنی مضبوط شخصیت کے ساتھ میدان میں اترے اور نفرتوں کی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ شیعہ سنی مسئلہ اگرچہ ابھی تک مکمل اور حتمی طور پر تو حل

Marfat.com

نہیں ہوسکا مگر قاضی صاحب نے ملی یکجہتی کونسل کے تحت دونوں متحارب گروہوں کو ایک میز پر اکٹھا کیا، ان کے درمیان مذاکرات ہوئے اور کئی موضوعات پر باہمی رواداری کی فضا بھی پیدا ہوئی۔

اتحادِ امت کا داعی

جماعت اسلامی کے ساتھ سیاسی میدان میں جن مذہبی جماعتوں کا ٹکراؤ ہوتا تھا ان میں جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپس میں افہام وتفہیم کے فقدان نے بلاوجہ ان پارٹیوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے متنفر کر دیا تھا۔ قاضی صاحب کی کوششوں سے متحدہ مجلس عمل وجود میں آئی تو مولانا شاہ احمد نورانی اور قاضی صاحب کے درمیان اتنا قرب پیدا ہوا کہ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت اور احترام کے رشتوں میں جڑ گئے۔ قاضی صاحب کسی بھی مسلک کے دینی ادارے اور مدرسے میں چلے جاتے، ہر مسلک کے اساتذہ و طلبا والہانہ ان کا استقبال کرتے۔ یہی کیفیت عالمی اسلامی تحریکوں کے کارکنان وقیادت کی تھی۔ قاضی صاحب کو دیکھتے ہی وہ ان کی طرف لپکتے، ان کی پیشانی، چہرہ اور ہاتھ چومنے لگتے۔ قاضی صاحب کی شخصیت ایک عالمی راہ نما کے طور پر مسلمہ تھی۔ ترکی، ایران، افغانستان، عالمِ عرب، یورپ، امریکہ، افریقہ، جنوبی ایشیا اور مشرقِ بعید کے تمام ممالک میں اسلامی اور جہادی تحریکیں دینی اور تبلیغی مراکز، علمی اور تحقیقی ادارے، ہر ایک میں قاضی صاحب کا تعارف بھی موجود تھا اور لوگ دل سے ان کی قدر بھی کرتے تھے۔ جس طرح اپنے ملک کے اندر انھوں نے مختلف گروہوں کو مختلف اوقات میں مشترکہ ومتفقہ اصولوں پر جمع کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا اسی طرح عالمی سطح پر بھی مختلف ملکوں کے اندرونی اور بین الملکی اتحادوں کے لیے بھی انھوں نے بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے!

غم سے نڈھال عقیدت مندان

قاضی صاحب کو اللہ کی طرف سے اچانک بلاوا آ گیا اور وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔

Marfat.com

ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ آخری دم تک میدانِ جہاد میں سرگرم عمل رہے۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۲ء کو جماعت اسلامی کے عظیم راہنما پروفیسر غفور احمد صاحب کا انتقال ہوا۔ قاضی صاحب ان کے جنازے کے لیے کراچی تشریف لے گئے۔ انھوں نے جنازے کے موقع پر مجمع عام کے سامنے بھی اپنے ساتھی اور دوست کی جدائی پر اپنے غم کا اظہار کیا اور پھر اپنے مضمون میں بھی ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ کون جانتا تھا کہ جس قریبی ساتھی کے غم میں قاضی صاحب پر بار بار رقت طاری ہوتی تھی، قاضی صاحب اتنی جلد اس سے جا ملنے والے تھے۔ قاضی صاحب کا جنازہ موٹروے چوک پشاور کے وسیع وعریض میدان میں پہنچا تو ہزاروں کی تعداد میں ان کے عشاق ومداحین، دست وبازو اور بیٹے، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد کرنے والے، پیرو جوان، سسکیوں اور آہوں، آنسوؤں اور نعروں کے ساتھ اس سانحۂ ارتحال پر غم زدہ ونڈھال نظر آرہے تھے۔ جنازہ ٹھیک تین بجے ہونا تھا۔ ہر جانب سے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ چلے آرہے تھے اور تین بجے سے پہلے ہی کھلا میدان اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کرتا نظر آیا۔ جنازے میں موجود لوگ جب مرحوم کا آخری دیدار کرنے ان کی چارپائی کے پاس آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے اشک آلود آنکھیں اور غمزدہ چہرے کہہ رہے ہوں

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور!

مجھے شیخ سعدیؒ یاد آئے اور میں بس ایک شعر پڑھ کے رہ گیا

بگذار تا بہ گریم چوں ابر در بہاراں
کز سنگ نالہ خیزد وقتِ وداعِ یاراں!

آخری آرام گاہ

جنازے سے قبل پروفیسر محمد ابراہیم، سراج الحق، لیاقت بلوچ، مولانا طیب طاہری، جاوید ہاشمی، جنرل حمید گل، مولانا سمیع الحق، مولانا فضل الرحمٰن، آصف لقمان قاضی اور امیر جماعت اسلامی پاکستان سید منور حسن نے مختصر خطاب کیے اور ہر ایک نے کہا کہ آج کا غم اس کا ذاتی غم بھی

Marfat.com

ہے اور یہ پوری امت کا دردِ مشترک بھی ہے۔ ٹھیک تین بجے منور حسن صاحب نے جنازہ پڑھایا۔ بے پناہ ہجوم میں ہر جانب سے نماز کے دوران آہوں اور سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔ جنازے کے بعد میت مرحوم کے آبائی گاؤں زیارت کا کا صاحب میں ان کے آبائی قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ جہاں وہ اپنے خاندان کے دیگر مرحومین کے ساتھ محوِ استراحت ہیں۔ پوری دنیا میں مسلسل تعزیتی ریفرنس منعقد ہو رہے ہیں۔ حرم مکی و مدنی میں، نیز مشرق و مغرب کے ہر ملک میں غائبانہ نماز ہائے جنازہ پڑھی گئیں۔ ہر شخص مرحوم کی خوبیوں اور عظمتوں کو سلامِ عقیدت پیش کر رہا ہے۔ اپنے ہی نہیں بیگانے بھی، ہم خیال و ہم مشرب ہی نہیں، نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ جانے والا عظیم تھا! وہ دلوں میں آج بھی بستا ہے اور پورا ماحول زبانِ حال سے کہے جا رہا ہے،

ے مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

میرا جی چاہتا ہے کہ لکھتا ہی چلا جاؤں۔ اتنی حسین یادیں، اتنا شیریں دورِ رفاقت اور ایسا پیار بھرا تعلق، مگر کیا کروں کہ مرحوم کی وفات نے نڈھال و مضمحل کر دیا ہے۔ زندگی رہی تو مزید یادیں بھی ان شاء اللہ قلم بند کروں گا۔ آج تو قلبِ حزیں اور قلمِ شکستہ کے ساتھ لکھی گئی اس تحریر کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ پر امید دل کے ساتھ اللہ کے حضور یہ آرزو پیش کرتا ہوں کہ اس مردِ مجاہد کو زمرہ شہدا میں شامل فرما کر اپنے بے پایاں انعامات سے مالا مال کر دے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

Marfat.com

نجم الدین اربکان

(۱۹۲۶ء-۲۰۱۱ء)

قلبی صدمہ

۲۷رفروری ۲۰۱۱ءکوموبائل فون پر پیغامات موصول ہونے لگے، جن میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ترکی کے مردِ مسلم انجینیر (ڈاکٹر) نجم الدین اربکان اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ نجم الدین اربکان کی وفات پر عالمی اسلامی تحریکوں نے تعزیتی بیان میں کہا کہ مرحوم اسم بامسمّٰی تھے۔ وہ دینِ اسلام کا روشن ستارا، امت مسلمہ کی آنکھوں کا تارا اور باطل کی آنکھوں کا کانٹا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرحوم کو یہ خراجِ عقیدت سچائی وصداقت کا ترجمان ہے۔ بلاشبہ مرحوم ملتِ اسلامیہ کے قابلِ فخر سپوت، عالمِ اسلام کے کوکبِ درخشندہ اور دنیا بھر کے اہلِ علم ودانش کی نظروں میں ایک پاکباز سیاست دان کے طور پر معروف تھے۔ اربکان صاحب کی وفات سے دلی صدمہ پہنچا۔ مرحوم کی بلندی درجات کے لیے دل سے دعائیں نکلیں اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ مرحوم ایک سخت کوش، عالی ہمت اور صاف دل ودماغ کے مالک، مدبر سیاست دان تھے۔

ترقی کے زینے

اربکان صاحب ترکی کے ایک چھوٹے سے شہر سنوپ (Sinop) جو ترکی کے شمالی علاقے میں بحیرہ اسود کے ساحل پر واقع ہے، میں ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۶ءکوایک معزز اور پڑھے لکھے خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد صبری اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان اور پیشے کے لحاظ سے جج تھے۔ نجم الدین اربکان نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر میں حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کا طویل

Marfat.com

سفر شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے وہ ترقی کے زینے پر چڑھتے چلے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں استنبول یونیورسٹی سے انھوں نے مکینکل انجینیر نگ میں ماسٹر ڈگری حاصل کی جس میں یونیورسٹی میں ریکارڈ قائم کیا۔ یہ ریکارڈ آج تک نہیں توڑا جا سکا۔ اس کے بعد انجینیر نگ میں پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی گئے اور آخن کی (RWTH) یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ جرمنی یا یورپ میں قیام کرنے کے بجائے اپنے وطن واپس آ گئے۔

تعلیم اور صنعت

جرمنی میں ترک آبادی کا ایک بڑا حصہ آج بھی مقیم ہے۔ اربکان صاحب کو بھی کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے یورپ کو منتخب کرنا چاہیے مگر انھوں نے پوری یکسوئی کے ساتھ ہمیشہ یہی فرمایا کہ سرزمینِ وطن کا میرے اوپر حق ہے اور ملت اسلامیہ کا مجھ پر قرض ہے۔ میں یہ حق ادا کرنا اور قرض چکانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے ۱۹۵۷ء میں استنبول یونیورسٹی میں بطور لیکچرار اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۵ء میں اسی یونیورسٹی میں انھیں پروفیسر کا درجہ حاصل ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یونیورسٹی ملازمت چھوڑ کر اپنی فنی مہارت اور دوستوں کے تعاون سے انڈسٹری کی طرف توجہ دی۔ انڈسٹری میں انھوں نے ٹینک سازی اور انرجی و ایندھن کی پیداوار کے منصوبوں پر توجہ مرتکز کی۔ ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ہی تجرباتی طور پر انھوں نے انرجی اور ایندھن پیدا کرنے کا ایک بڑا مرکز قائم کیا۔ یہ تجربہ بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس کے بعد ہی مرحوم نے یونیورسٹی کی ملازمت کو خیرباد کہا مگر اپنی مادرِ علمی سے غیر رسمی تعلق بعد میں بھی قائم رکھا اور اس کی بہبودی کے لیے ہمیشہ مشورے اور تعاون پیش کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے صنعتی مرکز کو بھی جامعہ کے طلبہ و طالبات کے لیے وقف کر دیا۔ اس میں تین سو ملازمین اور اہل ہنر و فن شریک تھے۔ یہ مرکز اب تک چل رہا ہے اور اس کی سالانہ پیداوار تیس ہزار ڈیزل انجن ہے۔ جرمنی میں قیام کے دوران جرمن حکومت کے لیے ایک ٹینک Leopard one A کے نام سے ڈیزائن کیا جو جرمن فوج کے پاس ایک بہت بڑا اثاثہ ہے۔

Marfat.com

ازدواجی زندگی

نجم الدین اربکان صاحب نے محترمہ نرمین صاحبہ سے ۱۹۶۷ء میں شادی کی۔ ان سے ان کے تین بچے محترمہ زینب اربکان، جناب الیف اربکان اور جناب فاتح اربکان ہیں۔ اربکان صاحب کو سلطان محمد فاتح (۳۰ر مارچ ۱۴۳۲ء تا ۳ر مئی ۱۴۸۱ء) سے بڑی عقیدت ومحبت تھی۔ وہ ترک تاریخ میں اربکان صاحب کا ہیرو اور آئیڈیل شخصیت ہے۔ سلطان محمد فاتح نے نبی مہربان صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی پوری کر کے رومی پایہ تخت (ایشیا) قسطنطنیہ کو ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو فتح کرلیا تھا جسے استنبول کہا جاتا ہے۔ اربکان بھی فتوحات اور غلبہ اسلام کے علم بردار تھے۔ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا اور ضرور ہوگا مگر اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ اربکان صاحب نے سلطان محمد فاتح ہی کی نسبت سے اپنے بیٹے کا نام فاتح رکھا تھا اور وہ سال ہا سال سے ترکی میں یومِ فتح منانے کا اہتمام کرتے رہے ہیں جو ایک بہت بڑے قومی جشن کا سماں پیش کرتا ہے۔ اس میں ترکی سے لاکھوں لوگ اور پورے عالمِ اسلام سے نمایاں اسلامی شخصیات شرکت کرتی ہیں۔ اربکان صاحب کی اہلیہ نے ان کی جدوجہد میں ان کا بھرپور ساتھ دیا اور ہر قسم کی مشکلات نہایت جرأت مندی وخندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ محترمہ نرمین اربکان چھ سال قبل ۲۰۰۵ء میں انتقال کرگئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں میاں بیوی کو اعلیٰ علیین میں اعلیٰ مقام اور بلند درجات عطا فرمائے۔

لادینی نظام میں دین کی روح

صنعت سے سیاست کی طرف منتقلی اربکان صاحب کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ یہ وقت کا تقاضا بھی تھا اور نجم الدین اربکان کا ذوق بھی اس سے مطابقت رکھتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے سیاست میں قدم رکھتے ہی ملی گرش (ملت کا نقطۂ نظر) کے نام سے سیاسی منشور تیار کیا۔ ملی گرش اتنا مقبول ہوا کہ اس نے باقاعدہ ایک تنظیم کی صورت بھی اختیار کرلی، چنانچہ اسلامی تحریک ترکی کے تحت بیرونِ ملک بھی اس نام کے تحت مراکز منظم ہوئے اور صنعتی وتجارتی اداروں کا ایک پورا نیٹ ورک بھی

Marfat.com

وجود میں آیا جو تا امروز نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ یورپی ممالک میں یہ نام بہت مقبول ہے۔ جہاں جہاں ترک آبادی موجود ہے ملی گرش بھی وہاں اپنا وجودِ مسعود قائم رکھے ہوئے ہے۔ اربکان صاحب کے منشور کو ترکی کی سیکولر اور لادینیت سے مسموم فضاؤں میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا شمار کیا گیا۔ طویل عرصے کی گھٹن اور جبر کے درمیان یہ امید اور روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ترکی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اور ملک و بیرونِ ملک پھیلے ہوئے ترک عوام کے دلوں سے لے کر دماغ تک اس نے ایک جوت جگا دی۔ لادینی نظام کے اندر دین اور مذہب کا نام لینا کچھ آسان نہ تھا مگر "ہمتِ مرداں مددِ خدا" کے مصداق یہ تجزیہ برگ و بار لایا۔ وللہ الحمد!

غازیانِ دین سے سیکولرازم تک

ترکی میں ۱۹۲۵ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور لادینی نظام کے اجرا کا دور شروع ہوا۔ مصطفےٰ کمال ایک سکہ بند فری میسن اور عالمی صہیونی تحریک کا ایجنٹ تھا۔ عالمی قوتوں نے بڑی شاطرانہ چالوں سے اسے ہیرو بنایا اور پھر اس کے ذریعے خلافت کے مرکز کو لادینیت کا گڑھ بنا کر اپنے منصوبوں کی تکمیل کرتے رہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ترک خلیفہ اور خلافتِ عثمانیہ کا ماٹو ہی غازیانِ دین (Defenders of Faith) تھا مگر نئے نظام میں دین و مذہب کو مکمل طور جلاوطن کر دیا گیا۔ "ببیں تفاوتِ راہ، از کجا است تا بہ کجا"! یہ بھی حقیقت ہے کہ خلافت کے خاتمے اور لادینی دور کے آغاز ہی سے اسلام پسند طبقات نے اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ بدیع الزمان سعید نورسی (۱۸۷۳ء تا ۱۹۶۰ء) کی شخصیت نے پورے ماحول میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ نوری تحریک دلوں کی دھڑکن بن گئی مگر مصطفےٰ کمال پاشا کے ظالمانہ اور آہنی اقدامات نے اسے عوامی تحریک بننے سے روکے رکھا۔ بدیع الزمان سعید نورسی مرحوم نے زندگی کا بیش تر حصہ جیلوں میں گزارا۔ وہ سیکولر نظام کے مقابلے پر اسلامی نظام کے احیا کا علم لے کر اٹھے تھے۔ ان کے رسالۂ نور نے ترک نوجوانوں بالخصوص طلبہ کے دلوں میں امید کے دیپ روشن کر دیے تھے۔ اپنی تعلیم

Marfat.com

کے دوران نجم الدین اربکان بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی جامعہ میں ہم خیال طلبہ کو منظّم کر کے ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں بڑی حکمت وتدبر کے ساتھ تحرک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بدیع الزمان سعید نورسی کی وفات کے بعد اس چراغ کو نجم الدین اربکان نے نہ صرف یہ کہ بجھنے نہیں دیا بلکہ اس کی لو کو تیز سے تیز تر کرنے میں کامیاب رہے۔

ملی نظام پارٹی

اربکان مرحوم صاحبِ کردار بھی تھے اور صاحبِ گفتار بھی۔ وہ دوررس نگاہ رکھنے والے مفکر بھی تھے اور نہایت جرأت مند عملی راہ نما بھی۔ ۱۹۵۹ء میں شروع کیا گیا یہ سفر جلد ہی ثمر آور ثابت ہوا۔ ملی گرش کے تحت ہی ۶۰ء کے عشرے میں انھوں نے سیاسی جماعت، ملی نظام پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس کے تحت انتخابات میں داخل ہوئے تو قونیا سے پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوگئے۔ ان کے علاوہ دو درجن کے قریب دیگر ارکان بھی مختلف علاقوں سے منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں آگئے۔ اس دوران سیکولر قوتیں بالخصوص سیاست دان اور فوجی جرنیل حرکت میں آئے۔ ملی نظام پارٹی پر نو مہینے بعد ہی پابندی لگا دی گئی۔ اس پابندی کی دھمکی فوجی جرنیل محسن باتور نے دی تھی اور پابندی کا اعلان بھی اسی نے کیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دستوری عدالت عالیہ نے بھی اس ظالمانہ وآمرانہ فیصلے کو بحال رکھا۔

تحریکات کے مثبت اور منفی پہلو

اربکان صاحب سے پاکستان اور بعض دیگر ممالک میں مختلف کانفرنسوں کے دوران مختصر ملاقات ہوتی رہی، وہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ میاں طفیل محمدؒ اور جناب قاضی حسین احمد صاحب سے بھی اربکان صاحب کو ایک خصوصی محبت اور لگاؤ تھا۔ جماعت کی قیادت سے وہ اپنے معاملات اور امور میں مشاورت کرتے رہتے تھے۔ یوم فاتح کے جلسوں میں قاضی حسین احمد مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوتے تھے۔ لاکھوں کا مجمع ''مجاہد اربکان'' اور ''مجاہد قاضی'' کے نعروں سے گونج اٹھتا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان سے خصوصی محبت کا

Marfat.com

اظہار کرتے ہوئے پر جوش ترک نوجوان دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑ کر ''ترک پاکستان کوردوش''، یعنی ترک پاکستانی بھائی بھائی کے والہانہ نعرے بھی لگایا کرتے تھے۔ دو مرتبہ اربکان مرحوم ومغفور سے قدرے تفصیلی ملاقاتوں میں ان کے خیالات براہِ راست سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ دونوں مواقع اربکان صاحب کی پاکستان آمد کے موقع پر نصیب ہوئے۔ ایک بار وہ جماعت اسلامی کے کسی کل پاکستان اجتماعِ عام میں بطور مہمان تشریف لائے تو ائیرپورٹ پر میاں طفیل محمد صاحب نے ان کا استقبال کیا۔ ایئرپورٹ سے منصورہ آتے ہوئے اربکان صاحب، محترم میاں صاحب اور راقم الحروف ایک ہی گاڑی میں سوار تھے۔ اربکان صاحب اس زمانے میں بھی سیکولر طبقات کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے مگر مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے۔

سید مودودی کا کارنامہ

انھوں نے فرمایا: ''میاں صاحب! پاکستان کی تحریک اسلامی بڑی خوش نصیب ہے۔ جب آپ کے ملک کا دستور بن رہا تھا تو مولانا مودودیؒ کی بیدار مغز قیادت نے بروقت تحریک چلا کر دستور کو اسلامی رنگ دینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس ملک میں جیسی بھی نااہل اور بدعنوان حکومتیں مسلط رہی ہوں، ایک بات مسلّم ہے کہ حکومت آپ پر جب بھی پابندی لگائے اور آپ عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور دستور کا حوالہ دے کر دادرسی چاہیں تو دستور آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے جبکہ پاکستانی حکمران اپنے لاؤلشکر اور اقتدار کے باوجود کٹہرے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا معاملہ بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب بھی ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو ہم اسلام کا نام لینے والے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہیں اور دستور سیکولر طبقات کی پشت پر ہوتا ہے۔ ہماری دستور سازی کے وقت میں بدیع الزمان سعید نورسی نے صدائے احتجاج تو بلند کی تھی مگر وہ صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ہم جو کانٹے پلکوں سے چن رہے ہیں آپ کے راستے میں ان کانٹوں کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہم بجا طور پر آپ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں کہ آپ کی تحریک جلد منزل سے ہمکنار ہوجائے گی''۔

Marfat.com

ارکان صاحب کے جواب میں میاں صاحب نے ان کی جدوجہد کی تعریف کی اور انھیں پاکستان کے بعض مشکل اور سلگتے ہوئے مسائل کا حوالہ دیا جو تحریک کے راستے کی عملاً رکاوٹیں ثابت ہوتے ہیں۔ بلاشبہ دیگر مقامات پر اپنی اپنی نوعیت کے مسائل اسلامی تحریکوں کو درپیش ہیں مگر پاکستان کا طبقۂ مترفین ہو یا تفرقہ بازی و برادری ازم کا عفریت، بڑی بڑی جاگیرداریوں کی لعنت ہو یا بیوروکریسی کی منہ زور خرمستیاں سبھی بڑی بڑی رکاوٹوں کی حیثیت سے تحریک کے راستے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ چلیے یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا ہم اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔

انفرادی رابطوں کی اہمیت

ایک اور موقع پر محترم قاضی حسین احمد صاحب کے ساتھ گفتگو میں ارکان صاحب نے ایک بات کہی جو مجھے آج تک یاد ہے۔ قاضی صاحب نے ایک رابطۂ عوام مہم کا تذکرہ کیا تو ارکان صاحب نے اسے بہت سراہا۔ فرمانے لگے جب تک عوام سے براہِ راست اور انفرادی سطح پر ملاقات اور تبادلۂ خیالات نہ کیا جائے، جمود کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ پھر انھوں نے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ترکی کی حدود میں کوئی گھر اور کسی عمارت کا دروازہ ایسا نہیں ہوگا جہاں کچھ لوگ پائے جاتے ہوں اور ہمارے کارکنان نے اس پر کم از کم چار مرتبہ دستک نہ دی ہو۔ ہم بار روموں، قہوہ خانوں اور نائٹ کلبوں میں بھی پہنچے ہیں اور لوگوں کو بتایا ہے کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں''۔ ان کی باتیں سن کر مجھے حسن البنا شہیدؒ بھی شدت سے یاد آئے جو اپنی دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں قہوہ خانوں کے چکر لگایا کرتے تھے۔ ہمارے لیے اس نصیحت میں بہت بڑا سبق مضمر ہے، ہم اپنی منصوبہ بندی میں یہ امور ملحوظ رکھیں تو یقیناً جمود ٹوٹ سکتا ہے۔ بڑے بڑے دعوتی وتعارفی پروگرام اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں مگر انفرادی رابطے کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔

تلخ تجربات

ملی نظام پارٹی پر پابندی لگنے کے بعد اخباری نمایندوں نے ارکان صاحب سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا تو انھوں نے فرمایا چوبیس گھنٹے آپ انتظار کریں۔ انھوں نے فوراً ۱۹۷۲ء میں ملی

Marfat.com

سلامت پارٹی کے نام سے نئی جماعت قائم کردی۔اسی جماعت کے تحت انھوں نے جب اگلے انتخابات میں حصہ لیا تو پارلیمنٹ میں ان کے ہاتھ میں ویٹو پاور آ گئی۔وہ دونوں بڑی پارٹیوں میں سے جس کا ساتھ دیتے، وہی حکومت بنا سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بلند ایجوت کا ساتھ دیا اور مخلوط حکومت میں نائب وزیر اعظم منتخب ہوگئے۔ یہ ۱۹۷۴ء کے آغاز کی بات ہے۔اسی عرصے میں ۱۹۷۴ء میں جزیرہ قبرص پر یونانی اور ترک آبادیوں کے درمیان مسلح تصادم ہوا۔یونانیوں کی مدد کے لیے یونان نے اپنے مسلح دستے بھیج دیے۔ادھر بلند ایجوت بیرون ملک دورے پر تھے اور اربکان قائم مقام وزیر اعظم کے فرائض ادا کر رہے تھے۔انھوں نے نہایت جرأت مندی سے ترک دستے قبرص میں اتار دیے۔اس جنگ میں بہادر ترکوں نے سفاک یونانیوں کو سبق سکھا دیا۔ اس کے نتیجے میں قبرص کے ترک مسلمانوں کو، جن کی آبادی ۴۰ سے ۴۵ فیصد تک تھی، یونانی اکثریت کے تسلط سے آزادی مل گئی اور قبرص کی ترک حکومت وجود میں آگئی۔یہ تاریخ جدید کا ایک بہت عظیم واقعہ ہے۔مغربی اور صہیونی طاقتوں نے اب اربکان کو اپنا دشمن نمبر ایک قرار دے دیا اور اربکان صاحب کے تلخ تجربات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا مگر انھوں نے اس کی کبھی پروا نہ کی۔اربکان مرحوم اس دور میں علامہ اقبال کے مردِ مومن اور مردِ درویش تھے۔زندگی بھر کے امتحان و ابتلا ان کا حوصلہ پست نہ کر سکے

گرچہ ہوا ہے تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

کشمیر و فلسطین

اس دور میں اربکان صاحب نے ایک اور فیصلہ کن اقدام کیا۔فری میسن تنظیم پر پابندی لگوائی اور ان کی سرگرمیوں کو ترکی میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔اربکان صاحب کا ذہن تمام عالم اسلام کے لیے سوچتا اور منصوبہ بندی کرتا تھا۔وہ مسئلہ کشمیر پر کھل کر کشمیری عوام کی حمایت کرتے تھے۔ اسی طرح فلسطینی تحریک کی حمایت میں بھی وہ ہمیشہ یک سوئی کے ساتھ ہر فورم پر دوٹوک بات

Marfat.com

کرتے رہے۔انھوں نے اسرائیل سے تعلقات منقطع کرنے کا بھی مطالبہ کیا اور اس وقت کے وزیرِ خارجہ خالد بن ارکمان سے بھی یہ بیان جاری کرایا کہ ترکی اسرائیل سے تعلقات منقطع کرنے پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔بدقسمتی سے لادین فوج اور سیکولر عدالتیں اس میں آڑے آئیں اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور جنرل کنعان ایورن نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔اس دور میں اربکان صاحب نے ترکی کے دارالحکومت میں اسرائیل کے خلاف ایک عظیم الشان مظاہرہ کیا۔اس مظاہرے میں لاکھوں کا مجمع اسرائیل کے خلاف اور فلسطین کے حق میں والہانہ نعرے لگا رہا تھا۔ترکی کی تاریخ میں پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں لوگ کسی مظاہرے میں شریک ہوئے تھے۔تجزیہ نگاروں کے نزدیک آج تک اتنا بڑا مظاہرہ انھوں نے نہیں دیکھا۔

وزیرِاعظم اربکان

اس جرأت مندانہ اقدام سے اگرچہ ملی سلامت پارٹی اور اس کے لیڈر کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی مگر سیکولر نظام نے اسے اپنے وجود کے لیے خطرہ محسوس کیا اور ملی سلامت پارٹی پر پابندی لگا دی۔اربکان صاحب ہتھیار ڈالنا نہیں جانتے تھے۔حکومت سے محروم ہونے اور سیاسی پارٹی پر بین لگنے کے بعد انھوں نے فوراً دوستوں سے مشورہ کر کے ملی رفاہ پارٹی کے نام سے تیسرا تجربہ کیا اور یہ بھی کامیاب رہا۔اب وہ پہلے سے کہیں بڑی تعداد میں پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔۱۹۸۰ء کے فوجی انقلاب نے اربکان صاحب کو سیاست سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا مگر وہ ۱۹۸۷ء میں پھر میدانِ سیاست میں داخل ہو گئے۔بڑی پارٹیوں کے درمیان کشمکش زوروں پر تھی۔مسعود یلماز اور مسز تانسو شلر کی پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلے پر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر خوب نفرت کی جنگ لڑ رہی تھیں۔۱۹۹۰ء میں اربکان صاحب پھر ایک بڑی پارٹی کے طور پر پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔۱۹۹۵ء کے اواخر میں ہونے والے انتخابات میں انھیں مزید کامیابیاں حاصل ہوئیں۔اس مرتبہ انھوں نے تانسو شلر کی ٹرو پاتھ پارٹی (صراط مستقیم پارٹی) کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنائی اور معاہدے کے تحت دونوں کے درمیان طے پایا کہ پہلی نصف میعاد کے لیے اربکان صاحب

Marfat.com

وزیراعظم ہوں گے جبکہ دوسری میعاد کے لیے تانسوشلر وزیراعظم ہوں گی۔ یہ سیکولر ترکی میں پہلے اسلام پسند وزیراعظم تھے۔ ان کی وزارت عظمیٰ عالمِ اسلام کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھا مگر عالم کفر کی صفِ ماتم بچھ گئی اور اسی وقت سے ملکی اور غیر ملکی ہر سطح پر ان کے خلاف پھر سے سازشیں شروع ہوگئیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہوئی کہ اسلامی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی راہ نما ملک کے مختلف بلدیاتی اداروں میں میئر منتخب ہوئے اور ان کی کارکردگی اس قدر شاندار تھی کہ پوری قوم کی توجہ اب اسلامی تحریک کی طرف مبذول ہوگئی۔

ڈی ایٹ

موجودہ وزیراعظم طیب رجب اردگان استنبول کے میئر تھے، جس سے انھوں نے بڑی شہرت کمائی۔ وہ اربکان صاحب کے نائبِ اول تھے مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ بعد میں راستے جدا ہوگئے۔ بہرحال اربکان صاحب نے وزیراعظم بنتے ہی عالمِ اسلام کی طرف رخ کیا۔ اسرائیل کے مقابلے میں پہلی مرتبہ ترکی کے ایوان اقتدار سے فلسطین کے حق میں آواز بلند ہوئی۔ عالم اسلام کی سیاسی و معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے آٹھ مسلم ممالک پر مشتمل ایک گروپ تشکیل دیا گیا۔ یہ ڈی ایٹ (D8) کہلایا یعنی ترقی پذیر آٹھ ممالک۔ ان ممالک میں ترکی، ایران، ملائشیا، انڈونیشیا، مصر، بنگلہ دیش، پاکستان اور نائجیریا شامل ہیں۔ ان آٹھ ممالک کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ۱۵ فیصد ہے۔ اربکان صاحب بجا طور پر کمیونزم اور سرمایہ دارانہ دونوں باطل نظاموں کو طاغوتی طاقتوں کا شیطانی چکر قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک دونوں انسانیت کے دشمن اور انصاف کے قاتل ہیں۔ ہر دو لعنتوں کا جواب ان کے نزدیک اسلام کا منصفانہ اور شفاف و حلال نظامِ اقتصاد و معیشت ہے۔ وہ دور رس نگاہ اور اعلیٰ اہداف اپنے سامنے رکھتے تھے۔ انھوں نے عالمِ کفر کے مقابلے پر عالم اسلام کو معاشی لحاظ سے منظم و مستحکم کرنے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا مگر مخالف قوتیں تاک میں تھیں کہ ذرا سا موقع ملے تو جھپٹ کر شاہین کے پر کاٹ دیں۔

Marfat.com

سوسرلک سکینڈل

ترکی میں اربکان صاحب کی حکومت سے چند سال قبل ایک سکینڈل تانسوشلر کے دور اقتدار میں بہت مشہور ہوا جسے سوسرلک سکینڈل کہا جاتا تھا۔ یہ چونکہ تانسوشلر کے دور حکومت میں وقوع پذیر ہوا تھا اور وہ اربکان صاحب کی مخلوط حکومت میں شامل تھی اس لیے نئے سرے سے اس کے تذکرے میڈیا میں عام ہونے لگے۔ اس میں کرد آزادی کے لیے سرگرم عمل پارٹی کے خلاف سوسرلک کے قریب ایک مشترکہ ملٹری و پولیس آپریشن کیا گیا جس میں کرد پارٹی کے لیڈر اور اس کے ساتھ گاڑی میں سوار چار دیگر افراد کو دھماکہ خیز مواد سے ایک سفر کے دوران اڑا دیا گیا تھا۔ پہلے پہل نیشنل سیکورٹی کونسل کے سامنے یہ منصوبہ رکھا گیا تو اسے منظوری نہ مل سکی کیونکہ صدر تُرگُت اوزال اور آرمی جرنیل اشرف بطلس اس سے متفق نہیں تھے۔ اتفاق سے ۱۹۹۳ء میں جنرل بطلس ایک ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گیا، جس کے بارے میں معروف تھا کہ جہاز کے گرانے میں تخریبی کارروائی کی گئی ہے جبکہ انھی دنوں میں صدر اوزال بھی وفات پا گیا، جس کے بارے میں کہا گیا کہ اسے بھی ہلاک کیا گیا ہے حالانکہ اچانک دل کا دورہ پڑا تو وہ مر گیا تھا۔ پروپیگنڈے نے لوگوں کو خاصا متاثر کیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ صدر کے ارتحال کے پیچھے بھی کوئی خفیہ سازش ہے۔ عوام کی نظر میں اس سکینڈل میں تانسوشلر اور لیفٹیننٹ جنرل حسن کنداسی کا ہاتھ تھا۔

حکومت کا خاتمہ

نجم الدین اربکان کا اس واقعے سے نہ کوئی تعلق واسطہ تھا نہ کسی کی انگلی ان کی طرف اٹھی مگر سوئے اتفاق کہ انھوں نے ایک پبلک تقریر میں اس سکینڈل کا مذاق اڑایا اور اس کے پورے تانے بانے کو مضحکہ خیز قرار دے دیا۔ اس پر فوج میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور مغربی قوتوں کی اشیر باد سے سیکولر حلقوں نے آرمی کی مدد سے ۳۰ر جون ۱۹۹۷ء کو اربکان صاحب کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ انھیں تقریباً ایک سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس مرتبہ بھی ان کی پارٹی اور تمام نمایاں لیڈرز کو سیاست سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس مرتبہ اربکان صاحب کو جیل میں ڈالا گیا۔ نئے نام

Marfat.com

سے جو تجربات کیے گئے ان میں سعادت پارٹی اور فضیلت پارٹی کے نام آتے ہیں۔ اب پارلیمنٹ میں رجائی قوطان پارلیمانی لیڈر تھے جبکہ اربکان صاحب، طیب رجب اردگان اور دیگر نمایاں راہ نما منظر سے غائب کر دیے گئے۔ اسی عرصے میں یہ افسوس ناک حادثہ رونما ہوا کہ طیب رجب اردگان اور بہت سے نمایاں سیاسی راہ نماؤں نے اربکان صاحب سے الگ راہ اپنا لی۔ انھوں نے اپنی پارٹی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ کے نام سے منظم کر لی اور سیاست میں کامیاب تجربات کے ذریعے ملک کی وزارت عظمیٰ اور صدارت دونوں اہم مناصب پر بیک وقت فائز ہو گئے۔ اس وقت اردگان وزیر اعظم اور عبداللہ گل ترکی کے صدر ہیں۔

نورِ دیدہ اور چشم زلیخا

اربکان صاحب اس نئی صورت حال سے سخت نالاں تھے۔ ان کی نئی پارٹی پارلیمان سے بھی باہر رہ گئی اور ان کے حلقے کے بیش تر لوگ بھی حکمران پارٹی کی طرف چلے گئے۔ عالمی اسلامی تحریکوں کی نمایاں شخصیات نے اس باہمی اختلاف کو دور کرنے اور نا مطلوب خلیج کو پاٹنے کی بڑی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ اربکان صاحب اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنی رائے پر اصرار کچھ زیادہ ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اردگان اور ان کے ساتھی اصل راستے سے انحراف کر گئے تھے۔ بسا اوقات ان کے الفاظ میں اتنی حدت آجاتی تھی کہ اپنے سابقہ شاگردوں کو منافق تک کہہ گزرتے تھے۔ ان کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہ گزرا تھا کہ اتنی اعلیٰ قیادت پر فائز یہ لوگ بھی ان سے یوں بے وفائی کر جائیں گے۔ اربکان صاحب بزبانِ قال بھی اور بزبانِ حال بھی اپنے احباب سے شکوہ کیا کرتے تھے کہ جن کو انگلی پکڑ کر انھوں نے چلنا سکھایا اور پھر تمام فنونِ سیاست سے آشنا کیا وہی ان سے بے وفائی کر گئے گویا وہ فارسی کے شاعر غنی کے الفاظ میں شکوہ کناں تھے:

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را!

اعترافِ حقیقت

یہ موضوع خاصا نازک بھی ہے اور بحث طلب بھی۔ سچی بات یہ ہے کہ موجودہ حکمران جماعت

Marfat.com

کی پوری قیادت اربکان صاحب ہی کی تربیت یافتہ ہے اور وہ جس احتیاط اور حکمت کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، اس کے اندر بھی بلاشبہ دانشِ مومنانہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اربکان صاحب کے سیٹ کیے ہوئے راستے پر ہی یہ لوگ بحیثیت مجموعی گامزن ہیں۔ اربکان صاحب کی وفات پر وزیراعظم طیب اردگان نے بہت واضح الفاظ میں اعتراف کیا کہ ان کی سیاسی تعلیم وتربیت اربکان صاحب ہی کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اب بھی انھیں اپنا استاد اور مرشد مانتے ہیں۔ راقم الحروف کی اس معاملے میں غیر جانبدارانہ اور مخلصانہ رائے یہ ہے کہ موجودہ حکومت اور اس کے کارپردازان کی نیت میں کوئی فتور نہیں۔ انھوں نے وہی فکر اور منصوبے آگے بڑھانے کا کام شروع کر رکھا ہے جو انھوں نے اربکان صاحب اور دیگر اکابر سے سیکھے اور اخذ کیے تھے۔ اللہ ان کو ثابت قدمی سے آگے بڑھتے رہنے کی توفیق بخشے اور سیکولر ترک عناصر و اسلام دشمن مغربی قوتوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ فرمائے۔ اربکان صاحب کے اٹھ جانے سے بلاشبہ عالمِ اسلام کی بیدار مغز قیادت میں ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ جس کا پر ہونا سرِ دست خاصا مشکل نظر آتا ہے مگر اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔

اردوگان حکومت کی کارکردگی

اربکان صاحب کی پارٹی سعادت پارٹی کے نام سے میدان میں موجود ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کے آخری سالوں میں ہی ان کی پارٹی کے بیش تر لوگ وزیراعظم اردوگان کے کامیاب تجربات سے متاثر ہو کر حکمران پارٹی، جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ میں چلے گئے تھے۔ اب اربکان صاحب کی وفات کے بعد اس میں مزید کمزوری آنا فطری ہے۔ عام لوگ بھی بڑی تعداد میں دیگر پارٹیوں سے وفاداریاں چھوڑ کر حکمران پارٹی کی طرف جا رہے ہیں۔ پبلک میں ہونے والے ہر سروے میں کم وبیش یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ آیندہ انتخابات میں حکمران پارٹی بھاری اکثریت سے جیتے گی۔ ایک سروے میں تو دو تہائی سے بھی زائد اکثریت کے تخمینے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکمران پارٹی نے کرپشن کا کافی حد تک خاتمہ کر دیا ہے اور ترک

Marfat.com

عوام کی معاشی حالت پہلے سے کافی بہتر ہوگئی ہے۔ بحیثیت مجموعی بھی دنیا بھر کی معیشتیں جہاں زوال پذیر ہیں وہاں ترکی کی قومی معیشت پچھلے چند سالوں سے مسلسل بہتری اور اضافے کی طرف مائل ہے۔

اجتہادی مسئلہ؟

اربکان صاحب ایک بڑی شخصیت تھے اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر کسی قسم کا سمجھوتہ ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ یہ اپنی جگہ بہت بڑی عظمت ہے مگر دورِ جدید کے اسلامی مفکرین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی مؤید و حامی ہے کہ کٹھن اور پیچیدہ حالات میں حکمت کے ساتھ اپنا راستہ نکالنا اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا جس میں دینا کم پڑے اور لینے کے زیادہ مواقع حاصل ہوں مناسب حکمت عملی ہے، اسے اختیار کر لینا چاہیے۔ بہرحال یہ موضوع نازک بھی ہے اور بحث طلب بھی۔ اس پر یقیناً آرا میں اختلاف کی گنجایش موجود ہے۔ ذاتی طور پر اربکان صاحب کے لیے اسلام سے محبت کرنے والے ترک عوام کے دلوں میں بے پناہ محبت و احترام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ان کے جنازے میں محتاط اندازوں کے مطابق تیس لاکھ لوگ شامل ہوئے تھے۔ مرحوم عزیمت پر قائم رہنے کے قائل تھے، رخصت کا راستہ اپنانا ان کے نزدیک ضعف ایمان کی علامت ہے۔ انھوں نے وزارت و حکومت قربان کر دی مگر اپنی ڈگر نہ چھوڑی۔ ان کا بھی موقف اپنی جگہ درست تھا مگر موجودہ ترکِ قیادت کی سوچ میں بھی مومنانہ حکمت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ معاملہ ایک اجتہادی نوعیت رکھتا ہے۔ واللہ اعلم!

سرکاری پروٹوکول سے معذرت

حکومت نے اربکان صاحب کی زندگی کے آخری دنوں میں یہ عندیہ دیا تھا کہ سابق وزیر اعظم اور ایک قومی ہیرو ہونے کی حیثیت سے ان کی وفات پر انھیں سرکاری پروٹوکول دیا جائے گا۔ اربکان صاحب کے علم میں یہ بات آئی تو انھوں نے وصیت کی کہ سرکاری پروٹوکول کے بجائے انھیں سلطان محمد فاتح کی مسجد اور اس سے ملحقہ میدان میں عام مسلمانوں کی طرح جنازہ پڑھنے کے بعد

Marfat.com

اسی احاطے میں دفن کر دیا جائے۔ان کی نماز جنازہ میں وزیراعظم، صدر اور دیگر اعلیٰ سرکاری حکام بھی شریک تھے۔صدر اور وزیراعظم نے ان کے جنازے کو کندھا بھی دیا اور ان کی بطور استاد و مربی بہت زیادہ تحسین بھی کی۔تمام عالمی اسلامی تحریکوں کے نمایاں افراد نے جنازے میں شرکت کی، بالخصوص پاکستان سے سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان جناب قاضی حسین احمد صاحب اور مصر سے اخوان المسلمون کے سابق مرشد عام جناب محمد مہدی عاکف جنازے میں شریک تھے۔

خلدِ بریں کو روانگی

اربکان صاحب اگر اپنے آخری دورِ حکومت کو کچھ عرصہ مزید طوالت دے سکتے تو اسرائیل پر پابندی لگ چکی ہوتی مگر اب پھر ان کا تختہ الٹ دیا گیا اور انھیں جیل میں ڈال کر جرنیلوں نے اسرائیل کی خوشنودی اور صہیونی طاقتوں کی شاباش حاصل کی۔اربکان صاحب کی پارٹی کے ارکان نے اگلی پارلیمنٹ میں رجائی قطان کی قیادت میں یہ قرارداد اسمبلی میں پیش کر دی کہ اسرائیل سے سرکاری سطح پر تعلقات ختم کر دیے جائیں اور اس کی جگہ فلسطین حکومت کو تسلیم کیا جائے۔اربکان صاحب کی یہ تحریک اگرچہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی مگر ایک تاریخ بنا گئی۔اربکان صاحب کی قید و بند کا یہ آخری مرحلہ ۱۸ راگست ۲۰۰۸ء کو ختم ہوا۔صدر عبداللہ گل نے ان کی بزرگی اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کی سزا ختم کر کے رہائی کا اعلان کیا۔شیر اب بوڑھا اور بیمار تھا مگر اس کا دبدبہ اب بھی قائم تھا۔ماہِ فروری میں اربکان صاحب کی علالت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی۔انھیں انقرہ کے مرکزی ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ان کو عارضہ قلب کی بیماری لاحق تھی۔ ڈاکٹروں نے اپنی بھرپور کوشش کی مگر ظاہر ہے کہ معالجین کے پاس مرض و بیماری کا علاج ہوتا ہے، موت کا مداوا اور علاج کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔آخر پیکِ اجل نے شیرِ ترکی کو ۲۸ رفروری ۲۰۱۱ء کو واپسی کا بلاوا پہنچا دیا اور اربکان صاحب ایک کامیاب زندگی گزار کر دارِ خلد کو سدھار گئے۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین

Marfat.com

پروفیسر غفور احمدؒ

(۱۹۲۷ء-۲۰۱۲ء)

غائبانہ تعارف

پروفیسر غفور احمدؒ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان جیسی شخصیات پوری ملت کا سرمایہ اور اپنے دور ہی کے لیے نہیں، آنے والی نسلوں کے لیے بھی روشنی کا منبع ہوتی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے پچاسی سال عمر پائی، اور جب سے ہم نے ان کو دیکھا انھیں ہر لمحہ اللہ کی اطاعت اور خلقِ خدا کی خدمت و خیر خواہی میں مصروف پایا۔ پروفیسر صاحب سے غائبانہ تعارف، روزنامہ تسنیم لاہور کے ذریعے اس وقت ہوا تھا جب میں سکول کی ابتدائی کلاسوں میں پڑھتا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی کے بلدیاتی انتخابات ہوئے جن کے نتائج تسنیم اخبار نے چھاپے۔ یاد پڑتا ہے کہ یہ انتخابات کئی مرحلوں میں بتدریج مکمل ہوئے تھے، اس میں جماعت اسلامی کے لوگوں کی کامیابی کی خبر ہمارے گھر میں بڑی خوشخبری کے مترادف تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ان کونسلرز میں پروفیسر غفور احمد صاحب کا بھی نام تھا۔ دیگر کئی نام بھی لوحِ حافظہ پر موجود ہیں۔

بھولی بسری یادیں

یہ واقعہ کافی پرانا ہے مگر دو وجوہات سے ذہن میں محفوظ ہے۔ ایک تو یہ کہ میرے تایا جی، حافظ غلام محی الدین مرحوم و مغفور، نے مجلس میں یہ خبر پڑھ کر سنائی۔ ساتھ ہی متفکرانہ انداز میں کہا کہ ایک جانب تو یہ عظیم کامیابی ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے مگر دوسری جانب یہ خدشات بھی ہیں کہ حکمرانوں کو پاکستان کے دارالحکومت (اس زمانے میں کراچی ہی دارالحکومت تھا) میں جماعت اسلامی کی یہ کامیابی ہضم نہیں ہو سکے گی۔ معلوم نہیں شرپسند قوتیں کیا کیا سازشیں کریں گی۔ پھر عملاً

Marfat.com

ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ملک میں مارشل لا لگ گیا۔ ایوب خان نے سیاست اور سیاسی جماعتوں کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی۔ اسی مجلس میں پروفیسر صاحب کا نام "غفور احمد" بھی زیرِ بحث آیا کہ یہ عبدالغفور احمد ہونا چاہیے۔ مجھے کچھ زیادہ شعور نہیں تھا کہ نام کے متعلق یہ تبصرہ کیوں ہوا ہے، لیکن بزرگوں کے تبادلۂ خیال کا یہ پہلو بھی یادوں میں محفوظ ہے۔ بعد کے ادوار میں پروفیسر غفور صاحب کے نام کو دونوں طرح سے بولا، لکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ غفور احمد بھی اور عبدالغفور احمد بھی مگر ان کا پیدائشی نام غفور احمد ہی تھا۔

خاندان

پروفیسر صاحب نے بانس بریلی (یوپی، بھارت) کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ سے چھوٹے آپ کے ایک بھائی تھے اور دو بہنیں تھیں۔ پروفیسر صاحب کی رحلت کے موقع پر آپ کے بھائی حبیب احمد اور ایک ہمشیرہ زندہ ہیں جبکہ ایک بہن وفات پا چکی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے بریلی، آگرہ اور لکھنؤ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ پروفیسر صاحب جماعت اسلامی کے ایک اور عظیم راہ نما اور سابق امیر جماعت کراچی جناب حکیم صادق حسین مرحوم کے بہنوئی تھے۔ پروفیسر صاحب کی شادی محترمہ صدیقہ صاحبہ سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ میاں بیوی مثالی جوڑا تھے۔ ان کو اللہ نے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں عطا فرمائیں۔ ماشاء اللہ سبھی اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ بڑے بیٹے طارق فوزی اور چھوٹے شعیبؔ اعزاز کراچی میں مقیم ہیں جبکہ منجھلے بیٹے خالد شجاع کینیڈا میں رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کی صاحبزادیاں عفت اقبال، عشرت اقرار، رخشندہ رشید، فرخندہ شہاب، فوقیت پرویز اور عظمیٰ محمد، سبھی کراچی میں مقیم ہیں۔ آپ کے سب سے چھوٹے داماد محمد حسین سید اس وقت بلدیہ کراچی کے ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ وہ ایم کیو ایم کے سرگرم کارکن ہیں۔ یہ قدرت کی عجیب تقسیم ہے!!

پروفیسر صاحب جماعت اسلامی کا روشن ستارا اور جماعت کی قیادت میں ایک نہایت بیش قیمت ہیرا تھے۔ ان کے خاندان میں یوں تو ان کے سبھی بچے بچیاں جماعت کے ساتھ کم یا زیادہ

Marfat.com

وابستہ ہیں مگر ان سب میں سے ان کے ایک پوتے عزیزم حماد فوزی ہی تحریک کی اگلی صفوں میں آئے۔ وہ کراچی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے تین سال تک ناظم رہے اور اب جماعت میں سرگرمِ عمل ہیں۔ اللہ اس عزیز کو ثابت قدمی سے اپنے عظیم دادا جان کے نقوشِ پا پہ چلتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ مرحوم کے تعلق داروں میں جوان کی فکر سے یکسر مختلف سوچ اور عمل کے حامل ہیں، ان کی تلافی ہو سکے۔

زندگی کے مراحل، ایک جھلک

پروفیسر صاحب نے اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ایک منظم، مربوط اور بھرپور زندگی گزاری۔ آپ کی زندگی کی ایک جھلک ذیل میں بطورِ خلاصہ دی جا رہی ہے۔

۱۔ تاریخ اور جائے پیدائش: ۱۱رجون ۱۹۲۷ء بریلی یوپی، ہندستان۔ پاکستان ہجرت ۱۹۴۹ء (کراچی)

۲۔ تعلیم

الف: ابتدائی تعلیم سے انٹر تک — بریلی ۱۹۴۴ء

ب۔ بی کام — آگرہ یونیورسٹی ۱۹۴۶ء

ج۔ ایم کام — لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۴۸ء

۳۔ شادی خانہ آبادی ۱۹۴۸ء میں — رفیقہ حیات: صدیقہ غفور

۴۔ ملازمت

الف۔ لیکچرر — اسلامیہ کالج لکھنؤ ۱۹۴۸ء۔ ۱۹۴۹ء

ب۔ لیکچرر — اُردو کالج ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء

ج۔ دیگر تعلیمی مناصب

i۔ فیلوشپ — انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹنس

ii۔ فیلوشپ — انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنس

Marfat.com

iii۔ فیلوشپ جناح انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹنٹس

۵۔ جماعت اسلامی میں خدمات

i۔ رکنیت جماعت ۱۹۵۰ء، کراچی

ii۔ امیر جماعت اسلامی کراچی، فروری ۱۹۷۲ء تا اکتوبر ۱۹۷۷ء

iii۔ نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان، ۱۹۷۸ء تا 2012ء

۶۔ سیاسی خدمات

i۔ منتخب کونسلر و سیکرٹری بلدیہ کراچی ۱۹۵۸ء

ii۔ منتخب رکن قومی اسمبلی ۱۹۷۰ء و ۱۹۷۷ء

iii۔ رکن دستور ساز کمیٹی ۱۹۷۳ء

iv۔ سیکرٹری جنرل متحدہ جمہوری محاذ (یو ڈی ایف) ۱۹۷۳ء

v۔ سیکرٹری جنرل پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) ۱۹۷۷ء

vi۔ وفاقی وزیر صنعت و پیداوار ۱۹۷۸ء

vii۔ سیکرٹری جنرل اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) ۱۹۸۸ء

viii۔ ممبر سینٹ آف پاکستان ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۵ء

بالمشافہ ملاقات

پروفیسر صاحب کو بالمشافہ ۱۹۶۸ء میں دیکھا۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی کراچی کا دفتر آرام باغ میں تھا۔ چودھری غلام محمد مرحوم کراچی کے امیر اور برادرِ گرامی قدر سید منور حسن قیم تھے۔ دفتری عملے میں سے رجب علی صاحب اور محمد مسلم صاحب سے تعارف تھا۔ مختلف بزرگوں کو دفتر میں دیکھا تو ان احباب سے ان کے بارے میں پوچھا۔ اسی زمانے میں حکیم صادق حسین، حکیم اقبال حسین، پروفیسر غفور احمد اور صابر حسین شرفی صاحب کو قدرے دور سے دیکھا تھا۔ دور سے ان معنوں میں کہ ان کا تعارف تو مجھ سے ہوگیا، اس وقت میرا تعارف ان سے نہ ہو سکا، میں

Marfat.com

لاہور جمعیت کا ناظم تھا اور مرکزی شوریٰ کا رکن بھی، مگر یہ کوئی ایسا اعزاز نہیں تھا کہ ان قائدین سے متعارف ہوتا۔ البتہ بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ چودھری غلام محمد مرحوم نے کمال شفقت و محبت سے مجھ سے میرے تعارف اور ذمہ داری کے بارے میں استفسار فرمایا۔ کیا پیاری شخصیات تھیں۔ اللہ ان سب کو غریق رحمت فرمائے۔

ذاتی تعارف

پروفیسر غفور صاحب سے براہ راست ذاتی تعارف ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں سردیوں کی ایک دوپہر کو وہ اسلام آباد سے تشریف لائے۔ مجھے صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب کے ساتھ ان سے ملنے کا شرف حاصل ہوا اور باہمی تعارف بھی ہوا۔ پروفیسر صاحب ان دنوں اسلام آباد میں قومی اسمبلی کا اجلاس اٹینڈ کر کے آئے تھے۔ مرکز جماعت میں کم و بیش تمام مرکزی ذمہ داران موجود تھے۔ پروفیسر صاحب نے مولانا کو ان کے کمرے میں جا کر اسمبلی کے حالات و واقعات کی بریفنگ دی۔ پروفیسر صاحب جماعت کے چار رکنی پارلیمانی گروپ کے لیڈر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ پروفیسر صاحب مولانا سے ملاقات کے بعد باہر نکلے تو میں نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور اپنا نام بتایا تو میرا ہاتھ چھوڑنے سے پہلے اپنی دائمی مسکراہٹ اور شیرینی کے ساتھ مجھ سے پوچھا: ''اچھا تو آپ آج کل کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے عرض کیا: ''کوئی خاص کام تو نہیں کر رہا، البتہ گجرات میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام چھپنے والے ایک ہفت روزہ رسالے الحدید کی نگرانی کر رہا ہوں۔'' پھر پوچھا: '' آپ نے کس مضمون میں ایم۔ اے کیا ہے؟'' عرض کیا'' میں نے عربی اور علوم اسلامیہ میں ماسٹر کیا ہے۔'' فرمانے لگے: ''پی۔ ایچ۔ ڈی کرلو۔'' میں نے کہا: ''ارادہ تو ہے مگر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد کیا فرق پڑے گا سوائے اس کے کہ نام کے ساتھ ڈاکٹر لگ جائے گا۔''

بزرگوں کے چٹکلے

مرکز جماعت میں اس زمانے میں جو بزرگ ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے، ہر ایک اپنی اپنی

Marfat.com

ذات میں انجمن اور منفرد شخصیت کا حامل تھا۔ شیخ فقیر حسین صاحب بڑے بذلہ سنج اور نکتہ طراز تھے۔ قبل اس کے کہ پروفیسر صاحب مجھے کوئی جواب دیتے، شیخ صاحب نے جو پاس ہی کھڑے ہوئے تھے، فرمایا: ''فائدہ تو بہت ہوگا، پروفیسر صاحب کو دیکھیے، چند سال کالج میں پڑھایا اور اب پروفیسری مستقل طور پر ان کے نام کا حصہ ہے۔ آپ بھی مستقل ڈاکٹر صاحب بن جائیں گے''۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شیخ صاحب محترم پروفیسر صاحب سے اتنے بے تکلف ہیں۔ بعد کے ادوار میں کئی مواقع پر یہ عقدے مزید کھلتے چلے گئے۔ بہرحال اس موقع پر سید صدیق الحسن گیلانی صاحب اور خود پروفیسر صاحب کھلکھلا کر ہنسے۔ پروفیسر صاحب نے مجھ سے فرمایا: ''تمھارے متعلق میں نے کچھ خبریں پڑھی تھیں، جب تم جمعیت میں تھے۔'' میں نے عرض کیا: ''جمعیت کے دور میں میں کراچی میں آپ سے ملا تھا مگر اس وقت کوئی تعارف نہیں ہو سکا تھا۔'' فرمایا: ''کیوں تعارف نہیں کروایا تھا؟، تعارف تو کروانا چاہیے تھا۔'' پروفیسر صاحب کے ہر فقرے اور لفظ میں عظمت کی جھلک تھی کہ ایک بڑا آدمی معمولی کارکنانِ جماعت کے ساتھ کس قدر محبت و اپنائیت کا اظہار کر رہا تھا۔

پیار بھری شخصیت

مرکزِ جماعت میں ملاقات کا وہ دن اور آخری لمحات، پروفیسر صاحب کے ساتھ اس تعلق، محبت اور عقیدت میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں میں لاہور سے کراچی اور کراچی سے جدہ روانہ ہوا۔ پھر وہاں سے عازمِ نیروبی ہوا۔ ان دنوں نیروبی اور جدہ سے براہِ راست لاہور کی پروازیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ کراچی ہی کے راستے جانا اور آنا ہوتا تھا۔ کراچی میں قیام ہوتا تو سید منور حسن میرے میزبان ہوتے جو اس زمانے میں تنہا نعمت اللہ خان صاحب کے مکان کے ایک حصے میں مقیم تھے۔ اس زمانے میں غفور صاحب کراچی جماعت کے امیر تھے۔ ان سے مزید ملاقاتیں جاری رہیں۔ ہر مرتبہ یہ احساس ہوا کہ وہ بے انتہا محبت کرنے والے بزرگ اور مربی ہیں۔ ان سے محبت خود بخود دل میں پیدا ہوتی اور ہر لمحے اس میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ یہ میرا ذاتی

Marfat.com

تجربہ اور وجدان ہے۔ وہ علامہ اقبال کے شعر کا مصداق تھے

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو

رزم ہو کہ بزم ہو، پاک دل و پاک باز

کلیدی کردار

اسی زمانے میں ۱۹۷۳ء کے دستور کا ابتدائی خاکہ حکومت کی طرف سے قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا۔ پروفیسر صاحب اس دستوری دستاویز پر بحث میں حصہ لینے اور دستوری امور کو حتمی شکل دینے کے لیے خود بھی تیاری کر رہے تھے اور مختلف ماہرینِ قانون و دستور سے بھی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ وہ ہر وقت رواں دواں رہنے اور کبھی ہتھیار نہ ڈالنے والے انتھک مجاہد تھے۔ ۷۳ء کے دستور میں جتنی اچھی چیزیں نظر آتی ہیں انھیں شامل کروانے میں جماعت اسلامی اور حزب اختلاف کی دیگر دینی اور سیاسی جماعتوں کا بھی بلاشبہ بڑا اہم کردار ہے مگر بنیادی مسودے میں ترمیمات اور حتمی آئین میں دفعات کی فقرے بندی پروفیسر صاحب کی قابلیت و مہارت کی مرہونِ منت تھی۔ وہ دستوری کمیٹی کے اہم اور متحرک ترین رکن تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس متفقہ دستور کی تدوین میں پروفیسر صاحب مرحوم و مغفور کا کلیدی کردار ہے۔ ۷۳ء کے دستور کا جب بھی حوالہ دیا جائے، میرے ذہن میں پروفیسر صاحب کا نام گونجنے لگتا ہے۔

نام و نمود سے پرہیز

پروفیسر صاحب میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ مرنجاں مرنج تھے، اپنی بے پناہ صلاحیتوں، شہرت، مقبولیت اور قابلیت کے باوجود ان کے اندر انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خوراک اتنی کم تھی کہ بعض اوقات تعجب ہوتا تھا کہ اس قدر بھاگ دوڑ کرنے اور فعالیت کے ساتھ بلا تاخیر ہر اجلاس اور پروگرام میں پہنچنے والے یہ قائد اتنی کم خوراک کے ساتھ کیسے اتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ بہرحال اپنی آخری بیماری سے قبل وہ ہر لحاظ سے توانا اور فِٹ تھے۔ ان کے اندر بے پناہ قوتِ ارادی تھی۔ نام و نمود اور نمائش سے ہمیشہ مجتنب رہے۔ پنجاب کے دور دراز اضلاع میں بھی ان

Marfat.com

کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا، بار کونسلوں اور پریس کانفرنسوں سے خطاب کرتے تو ان کا تعارف کرواتے ہوئے جب مقامی احباب تعریف و تحسین کے الفاظ استعمال کرتے تو وہ انھیں منع کر دیتے اور فرماتے کہ پروگرام شروع کراؤ۔

کوزے میں دریا!

پروفیسروں اور دانشوروں سے گفتگو ہو یا وکلا و صحافیوں کے سامنے اظہارِ خیال، جلسۂ عام ہو یا احتجاجی مظاہرہ، پروفیسر صاحب دس پندرہ منٹ میں اپنا پورا مافی الضمیر بیان کر دیتے اور متعلقہ موضوع پر کوئی تشنگی نہ رہنے دیتے۔ صحافیوں کے ہر سوال کا جواب بھی ان کی طرف سے نپا تلا اور نہایت جامع ہوتا تھا۔ شوریٰ کے اجلاسوں میں خاموشی کے ساتھ بیٹھتے اور اپنی باری پر اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے کہ کوزے میں دریا بند کر دینے کا محاورہ مجسم صورت میں حقیقت کا روپ دھارتا نظر آتا۔ قومی اسمبلی اور سینٹ میں اپنی رکنیت کے دوران انھوں نے جس بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اس کا ہر شخص معترف ہے۔ ان کی تقاریر میں کوئی شور ہنگامہ نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اپنی عظیم شخصیت اور مرتبے کے عین مطابق وہ پر مغز نکات اٹھاتے اور ہر موقف مضبوط استدلال کے ساتھ پیش کرتے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی منظوری کے دور میں ڈاکٹر نذیر احمد تو شہید ہو چکے تھے اور جماعت کے صرف تین ارکان اسمبلی میں رہ گئے تھے، مگر اللہ کے فضل سے جماعت کا وزن اسمبلی کے اندر اور باہر ہر جگہ مسلم تھا۔ ان ارکان میں پروفیسر صاحب کے علاوہ محمود اعظم فاروقی صاحب (کراچی) اور صاحبزادہ صفی اللہ صاحب تھے جو دیر سے منتخب ہوئے تھے۔

بزرگ صحافی

پیپلز پارٹی کو ۱۹۷۰ء والی اسمبلی کے اندر، بچے کھچے پاکستان میں بہت بڑی اکثریت حاصل تھی اور ان کے بیشتر ارکان انتہائی زبان دراز بلکہ منہ پھٹ تھے۔ اس کے باوجود اسمبلی کا ریکارڈ گواہ ہے کہ پروفیسر صاحب کی گفتگو کے دوران ایوان میں پر وقار ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔ سبھی ان کی بات غور سے سنتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ اس زمانے میں ملک کے مشہور اور بزرگ

Marfat.com

صحافی، مصطفیٰ صادق مرحوم اسلام آباد میں پارلیمنٹ کے اجلاس کی جھلکیاں دیکھ کر آئے تو ۵۔اے ذیلدار پارک میں مولانا مودودیؒ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے مولانا سے کہا: ''مولانا ایوان میں بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملیں مگر سچی بات یہ ہے کہ اگر کسی رکن کی کسی بات میں وزن اور تاثیر تھی تو یہ وہی ارکان تھے جو جماعت کی تربیت گاہوں سے ہو کر نکلے۔'' پروفیسر غفور صاحب اور محمود اعظم فاروقی صاحب کا بالخصوص تذکرہ کرنے کے بعد مصطفیٰ صادق نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ جماعت کو چھوڑ کر چلے گئے مگر پیپلز پارٹی کے دو ارکان اسمبلی راؤ خورشید علی خان اور کوثر نیازی بھی جب بات کرتے تو محسوس ہوتا کہ انھیں بات کرنے کا ڈھنگ اور سلیقہ آتا ہے۔

مذہب اور مسلک

پروفیسر صاحب اپنے احباب سے ہر موضوع پر بے تکلفی سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ میرے ساتھ ایک مرتبہ ننکانہ صاحب کے دورے پر تھے۔ وہاں ہم لوگ سکھوں کا گوردوارہ دیکھنے کے لیے بھی چلے گئے۔ ایک نوجوان لڑکی مرکزی مسند پر بیٹھی گرنتھ صاحب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ وہ اپنی ''مقدس کتاب'' میں یوں منہمک اور کھوئی ہوئی تھی کہ لوگوں کی آمد پر ذرا بھر بھی اپنی توجہ اوراق سے ادھر ادھر نہ ہونے دی۔ پروفیسر صاحب نے فرمایا: ''یہ مذہب انسان کے لیے امرت دھارا ہے۔ خواہ وہ حق ہو یا باطل، اپنے پیروکاروں میں ایسی وارفتگی پیدا کر دیتا ہے کہ مذہب بیزار اور سیکولر عناصر اسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس سفر میں بار کونسل میں آپ سے سوال ہوا کہ جماعت اسلامی کے اندر محض اہل حدیث اور دیوبندی ہی کیوں آتے ہیں؟ آپ نے مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں فرمایا ''تمھیں یہ کس نے کہا کہ صرف اہل حدیث اور دیوبندی ہی جماعت میں آتے ہیں؟ مجھے دیکھو، میں اصلی بریلوی ہوں۔'' ان کا اشارہ اپنے مولد بریلی کی طرف تھا۔ ہم سب لوگ اس جواب سے بہت محظوظ ہوئے۔

Marfat.com

نوجوان قیادت؟

پروفیسر صاحب کی بے تکلفی کا ایک اور واقعہ بھی یاد آرہا ہے۔ایک بار فرمایا: عوامی جذبات کا بھی اپنا ہی رنگ اور اسلوب ہوتا ہے۔اس کا پسِ منظر یہ تھا کہ کراچی میں جماعت کی امارت کے منصب پر پروفیسر صاحب سے قبل جناب صادق حسین مرحوم فائز تھے۔جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، دونوں کا آپس میں قریبی خاندانی تعلق بھی تھا۔صادق حسین صاحب کی جگہ پروفیسر صاحب کا تقرر ہوا تو کئی کارکنان نے نعرے لگائے ''خوش آمدید، نوجوان قیادت خوش آمدید۔'' پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے خود یہ واقعہ سنا کر فرمانے لگے کہ حقیقت میں صادق حسین صاحب مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے مگر یار لوگوں کا اپنا ہی انداز اور ڈھب ہوتا ہے۔انھوں نے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ میں اپنے دفتر سے مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گیا۔نماز سے فارغ ہونے کے بعد دیکھا تو میرے جوتے غائب تھے۔ میں ننگے پاؤں ہی دفتر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں کئی لوگ مجھے ملے مگر کسی نے بھی میرے پاؤں کی طرف نہیں دیکھا، نہ کہا کہ تم ننگے پاؤں کیوں جارہے ہو۔اس واقعہ میں بھی پروفیسر صاحب کی مومنانہ سادگی اور درویشی کی جھلک نظر آتی ہے۔

قدرِ مشترک

بر سبیل تذکرہ ہماری منصورہ کی مسجد میں بہت زیادہ نمازی ہوتے ہیں اور اکثر وبیشتر آس پاس کی بستیوں سے آنے والے ''ضرورت مند'' حسب ضرورت و پسند بے چارے نمازیوں کے جوتے پہن کر غائب ہو جاتے ہیں۔اپنی اس مسجد میں بھی پروفیسر صاحب اور یہ راقم کافی مرتبہ اس حادثے سے متاثر ہوئے۔میں نے ایک دن پروفیسر صاحب کو اپنی آپ بیتی سنائی کہ میرے بچگان میں سے بعض کے جوتے یکے بعد دیگرے اٹھائے گئے تو میں نے انھیں لعن طعن کیا کہ ہر روز تمھارے ہی جوتے گم ہونے ہوتے ہیں۔اس کے بعد تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میرے جوتے بھی غائب ہونے لگے اور کئی مرتبہ خطبہ جمعہ سے فارغ ہوا تو معلوم ہوا کہ پاپوش ندارد۔پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ بھائی میں نے تو کبھی کسی کو ڈانٹا بھی نہیں نہ کبھی لعن طعن کی ہے، اس کے باوجود میرے جوتے غائب ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

"جیتے رہو"!

پروفیسر صاحب مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں میرے ساتھ والی نشست پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ کبھی کبھار سیاسی موضوعات پر کسی قرارداد کا متن منظوری سے پہلے پڑھ رہے ہوتے تو مجھ سے کسی لفظ کے بارے میں پوچھتے۔ میں عرض کرتا کہ آپ تو اہل زبان ہیں۔ فرماتے کہ نہیں آپ بھی زبان کو جانتے ہیں۔ میں کئی مرتبہ پروفیسر صاحب کو ملتے ہوئے ادب واحترام سے ان کے گھٹنے چھوتا تو گھٹنے پیچھے کر کے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتے کہ "جیتے رہو"۔ مرحوم کے یہ الفاظ "جیتے رہو" اتنے پیار بھرے لہجے اور محبت کے انداز میں سماعت نواز ہوتے تھے کہ ان کی بازگشت اب تک سنائی دیتی ہے۔ 26 / دسمبر کو اپنے اس عظیم محسن کو بستر پر جامد و ساکت دیکھا تو آنکھیں تر ہوگئیں۔ وہ پیار بھری دعا شدت سے یاد آئی۔

بڑا دل، بڑا گھر

پروفیسر صاحب ہندستان سے ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ان کا قیام کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں تھا۔ بعد میں مرحوم نے فیڈرل بی ایریا میں ایک بڑا گھر جو ۱۲۰۰ گز کے رقبے پر تھا بنالیا۔ یہاں جماعت اسلامی کراچی کا اجتماع ارکان بھی ہوجایا کرتا تھا اور دیگر پروگرام بھی بطریق احسن منعقد ہوجاتے تھے، ان کے گھر کے سامنے بہت کھلی اور پرسکون سڑک بھی تھی اور قریب کچھ فاصلے پر پارک بھی تھا۔ مولانا جان محمد عباسی مرحوم کی یاد میں جو جلسہ منعقد ہوا، وہ ان کے گھر پر ہی ہوا تھا۔ اس گھر میں جماعت کے تمام اکابر آتے رہے اور قیام کرتے رہے۔ یہاں دیگر جماعتوں کے راہنما بھی آیا کرتے تھے۔ کئی اتحاد بھی یہاں وجود میں آئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد شہید نے بھی رکن اسمبلی منتخب ہونے کے بعد کراچی کا دورہ کیا تو دو ہفتے اس گھر میں قیام فرمایا۔

حق کے راہی

پروفیسر صاحب پورے ملک میں اپنوں اور بیگانوں سبھی کے نزدیک مقبول و محترم تھے۔ ان کی شخصیت ایسی تھی کہ ان سے لوگ بے ساختہ متاثر ہوتے اور ادب و احترام کا مظاہرہ کرتے تھے۔

Marfat.com

کراچی جیسے محبتوں کے مرکز کی بدقسمتی دیکھیے کہ جب یہاں نفرتوں کے لاوے ابلے اور لسانی بنیادوں پر فتنہ پردازوں نے کراچی کو حکومتی سرپرستی میں یرغمال بنایا تو کیا کیا حادثے رونما ہوئے۔ یہ فرشتہ صفت راہ نما (جو خود اردو بولنے والے تھے) بھی بدزبان اور بدقماش لونڈوں کے ہاتھوں ''ٹھاہ ٹھاہ'' کے نازیبا نعرے سننے پر مجبور ہوئے۔ ایک مرتبہ خود بیان فرمایا کہ میں جب گھر سے مسجد کی جانب نکلتا ہوں یا واپس آرہا ہوتا ہوں تو وہی نوجوان جو کبھی جھک کر مجھے سلام کیا کرتے تھے میرا نام بگاڑ کر ٹھاہ ٹھاہ کا ورد کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب اس منظر میں بھی مسکراتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ ظالموں نے تو اللہ کے نبیوں کو اور خود ختم المرسلین کو بھی نہ بخشا تھا۔ اہل حق کو ان منزلوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ آج وہ عظیم راہ نما جنت کے باغوں میں بھی اللہ کی رحمت سے مسکرا رہا ہوگا اور اس کی توہین کرنے والے سرحد کے اس پار جائیں گے تو خدا معلوم کیا انجام ہوگا۔ اللہ سب پر رحم فرمائے اور سب کو ہدایت دے۔ کراچی کو شیاطین کی نظرِ بد نے محبت کے زمزموں کی جگہ نفرتوں کے الاؤ میں بدل دیا ہے!!

تصانیف

پروفیسر صاحب نے تاریخ پاکستان کے بعض ادوار کو اپنی تحریروں میں بہترین انداز میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس دور میں ملک میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات، سیاسی اتار چڑھاؤ، معاشرتی و معاشی نشیب و فراز اور جمہوریت کشی کی وارداتوں کا خوب محاکمہ کیا ہے۔ آپ کی درجِ ذیل تصانیف اس ضمن میں تاریخی حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

- i۔ ''پھر مارشل لا آ گیا'' اشاعت جون ۱۹۸۸ء
- ii۔ ''اور الیکشن نہ ہو سکے'' اشاعت جون ۱۹۹۰ء
- iii۔ ''جنرل ضیاء الحق کے آخری دس سال'' اشاعت جولائی ۱۹۹۳ء
- iv۔ ''وزیر اعظم بے نظیر نامزدگی سے برطرفی تک'' اشاعت مئی ۱۹۹۵ء
- v۔ ''نواز شریف کا پہلا دورِ حکومت'' اشاعت ۱۹۹۷ء
- vi۔ ''بے نظیر حکومت کا عروج و زوال'' اشاعت ۲۰۰۱ء

Marfat.com

vii۔ ”نواز شریف اقتدار سے عتاب تک“ اشاعت ۲۰۰۳ء

viii۔ ”پرویز مشرف آرمی ہاؤس سے ایوانِ صدر تک“ اشاعت ۲۰۰۹ء

بڑا لیڈر چھوٹا مکان

پروفیسر صاحب نے ایف بی ایریا والا اپنا بڑا مکان چند سال قبل، جبکہ ان کی صحت اچھی تھی اور ان کی اہلیہ بھی زندہ تھیں، فروخت کر دیا۔ مکان فروخت کرنے سے قبل سارے اہل وعیال سے مشورہ کیا اور باہمی رضامندی سے فیصلہ ہوا کہ یہ مکان فروخت کر کے چھوٹا مکان رہائش کے لیے خرید لیا جائے اور زائد رقم شرعی حصص کے مطابق تمام بچوں میں تقسیم کر دی جائے۔ بڑا مکان دو کروڑ میں فروخت ہوا جبکہ نیا مکان گلشن اقبال کے علاقے میں خریدا گیا جو ایک کروڑ روپے میں ملا۔ یہ دو سو گز پر مشتمل ہے۔ ایک کروڑ روپیہ تمام بیٹے بیٹیوں میں شریعت کے قانونِ وراثت کی روشنی میں تقسیم کر دیا گیا۔ پروفیسر صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے جبکہ تمام بچے بچیاں اپنے اپنے گھروں میں مقیم تھے۔ اہلیہ کی وفات کے بعد بچے بچیاں باری باری ان کے پاس ان کی دیکھ بھال کے لیے رہا کرتے تھے مگر پروفیسر صاحب کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ اللہ نے جتنے سانس مقدر کر رکھے تھے وہ پورے ہو گئے اور عین ان لمحات میں جب امیر جماعت سید منور حسن صاحب کے بیٹے عزیزم طلحہ حسن کے استقبالیۂ ولیمہ میں ہزاروں مہمان جمع تھے، یہ دلدوز خبر موصول ہوئی کہ پروفیسر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ خوشی کی محفل میں موجود ہر شخص غم میں ڈوب گیا۔ یہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۲ء کی رات تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ حق تعالیٰ اس عظیم مردِ مومن کے درجات بلند فرمائے اور ان کی انسانی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

خدمت اقدس میں حاضریاں

پروفیسر صاحب سے ان کی بیماری کے دوران پانچ چھ مرتبہ ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر حاضر ہوا۔ یہ بیماری کافی طویل تھی۔ وہ اس دوران تقریباً چار یا پانچ سال لاہور کا سفر بھی نہ کر سکے۔ بطور نائب امیر و رکن مرکزی شوریٰ کسی اجلاس میں شرکت بھی نہ ہو سکی۔ ان کا حلف بھی

Marfat.com

کراچی کی شوریٰ کے اجلاس ہی میں ہوسکا۔دراصل ۲۰۰۸ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد وہ مسلسل کمزور ہوتے چلے گئے۔ میں جب بھی کراچی جاتا، پروفیسر صاحب کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔آخری ملاقات ۲۵ رنومبر کو یعنی ان کی وفات سے ایک ماہ قبل ہوئی۔اس ملاقات میں وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔میں نے ٹانگیں دبانا چاہیں تو ہاتھ کے اشارے سے سختی سے منع کر دیا۔اس سے قبل جب بھی عیادت کے لیے حاضر ہوا تو بہت خوش ہوئے اور منصورہ کے رفقا کا نام لے لے کر ان کا حال احوال پوچھتے رہے۔اس مرتبہ کوئی بات نہ ہوسکی۔ برادرم شعیب نے بتایا کہ اباجی ان دنوں بہت نڈھال ہوگئے ہیں اور اگر سوال جواب یا ان کے سامنے زیادہ بات چیت بھی کی جائے تو ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔

حسرت

اس ملاقات کے بعد آخری مرتبہ ۲۶ ردسمبر کو اپنے اس عظیم راہ نما کی محض زیارت ہی ہوسکی۔ زخمی دل اور نم آلود آنکھوں کے ساتھ جب ان کے گھر جا کر برادرم لیاقت بلوچ، فرید پراچہ اور نظمِ کراچی کے ذمہ داران کے ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہوا تو اسی مقام پر ان کی چارپائی تھی جہاں اس سے قبل وہ بستر پر دراز ہوا کرتے تھے۔اس سے پچھلی ملاقات میں کم از کم انھوں نے ہاتھ تو ملایا تھا اور آنکھیں کھول کر دیکھا بھی تھا۔اس مرتبہ ان سے نہ ہاتھ ملانے کا شرف حاصل ہوا نہ ان کی پیار بھری نگاہیں اٹھ سکیں۔ یہ حسرت ہی رہی۔اب آخرت میں ہی ملاقات ہوگی۔اللہ کے اس نیک بندے سے تعلق اور محبت خالصۃً لوجہ اللہ تھی۔اللہ کا یہ عظیم بندہ دنیوی زندگی میں بھی طے شدہ پروگراموں میں کبھی تاخیر کا روادار نہ ہوا، اس آخری سفر پر تو ہر ایک اپنے طے شدہ لمحے پر لازماً روانہ ہوجاتا ہے۔آہ! وہ سب کو اداس چھوڑ کر خوشیوں اور نعمتوں کے مسکن کی طرف پرواز کر چکے تھے۔ایک عظیم انسان تھا جو پوری قوم کا سرمایہ تھا، جس کی تمام طبقات میں عزت اور قدر تھی اور جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

Marfat.com

شیخ فقیر حسینؒ مرحوم

(۱۹۱۹ء-۱۹۸۳ء)

زندۂ جاوید لوگ

جو لوگ دلوں میں بستے ہیں، وہ امر ہوتے ہیں۔ (بلھے شاہ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا "بلھیا اساں مرناں ناہیں، گور پیا کوئی ہور"۔) شیخ فقیر حسینؒ بھی انھی لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے ۶۴ سال عمر پائی اور اس کا ہر لمحہ با مقصد گزارا۔ ان کو جس شخص نے بھی جتنا زیادہ قریب سے دیکھا، اتنا ہی ان کی خوبیوں کا زیادہ مدّاح و معترف نظر آیا"۔ یکم جنوری ۱۹۸۳ء کو شیخ صاحب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو بہت سی زبانوں پر یہ الفاظ تھے" جماعت اسلامی کو ناظمِ مالیات تو بہت مل جائیں گے مگر شیخ فقیر حسین دوبارہ نہیں ملے گا، سچی بات یہ ہے کہ مرحوم گلدستۂ مودودی میں یکتا و منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جناب شیخ فقیر حسین صاحب جماعت اسلامی کے گلِ سرسبد تھے۔ انھیں سید مودودیؒ کی مردم شناس نگاہوں نے پہچان لیا اور ان سے ان کی صلاحیت اور مہارت کے مطابق کام لیا۔ شیخ صاحب نے مرکزی شعبہ مالیات میں یادگار خدمات سرانجام دیں۔ وہ دورِ اول کے مسلمانوں کی طرح امانت و دیانت اور اصول و ضابطے کا اعلیٰ نمونہ تھے۔

تعارف

شیخ صاحب ۷ / مارچ ۱۹۱۹ء کو ریاست کپورتھلہ کے دوسرے بڑے شہر سلطان پور لودھی کے قریب، دھوری نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے شیخ عبدالرؤف صاحب نے ایک مرتبہ بتایا کہ مرحوم کی تاریخ پیدائش خود ان کی زبانی میں نے اس وقت سنی جب میرا بڑا بیٹا عبدالرافع پیدا ہوا۔ اس وقت ابا جان نے کہا کہ "اب آپ لوگ اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ میری

Marfat.com

بھی سالگرہ منایا کرو گے۔'' یوں دادا پوتا کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے، یعنی ۷ ؍مارچ۔ شیخ صاحب کا سال پیدائش بھی تاریخی ہے۔ کہا کرتے تھے کہ میں اس سال پیدا ہوا جب جلیانوالہ باغ کا خون آشام سانحہ رونما ہوا تھا یعنی ۱۹۱۹ء۔ شیخ صاحب کے والد کا نام رحیم بخش تھا۔ شیخ صاحب کے برادر اکبر شیخ نذر محمد صاحب مولانا مودودیؒ سے قیام جماعت سے پہلے ہی سے واقف اور ان کے مدّاح تھے۔ وہ ان کے درس قرآن کے باقاعدہ اور مستقل سامع بھی تھے۔ جب جماعت اسلامی کا تاسیسی اجتماع ہوا، شیخ نذر محمد صاحب اس میں شامل تھے یوں تاسیسی رکن بنے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے چھوٹے بھائی فقیر حسین صاحب بھی جماعت کی دعوت اور نصب العین سے متعارف ہوئے اور اس پکار پر بخوشی لبیک کہا۔ شیخ فقیر حسین صاحب بھی اپنے بھائی کے ساتھ جماعت کے تاسیسی اجلاس میں شریک ہوئے اور رکنیت بھی حاصل کی۔ یوں وہ نوعمر تاسیسی ارکان میں سے تھے یعنی ان کی عمر اس وقت ۲۲ سال تھی۔ شیخ صاحب کے ایک کزن بھی تاسیسی رکن تھے۔ یوں اس خاندان کے تین قیمتی موتی ۷۵ ہیروں کی مالا میں شامل ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

شیخ صاحب مرحوم بتایا کرتے تھے کہ ان کے خاندانی بزرگان کی روایات کے مطابق ان کے آباؤ اجداد محمود غزنوی کے دور میں افغانستان سے ہندوستان آئے اور مختلف شہروں میں آباد ہوگئے۔ شیخ فقیر حسین صاحب کے بھائی شیخ محمد حسین صاحب کے کہنے کے مطابق آخری شہر (تقسیم سے پہلے) جہاں یہ خاندان آباد ہوا، وہ سلطان پور لودھی ہے جو ریاست کپورتھلہ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ شیخ صاحب کا میاں طفیل محمد صاحب کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ انتہائی مثالی اور قابل رشک تھا۔ دونوں صاحبان ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے اور باہمی احترام بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ حسن اتفاق ہے کہ میاں صاحب کا تعلق بھی ریاست کپورتھلہ سے تھا۔ یوں یہ دونوں تاسیسی ارکان اور قائدین ایک ہی مردم خیز خطے سے دریافت ہوئے۔

Marfat.com

خاندانی پس منظر اور تعلیمی سفر

شیخ صاحب کی ابتدائی تعلیم ریاست کپورتھلہ میں ریاست کے قائم کردہ سکول پرم چیت ہائی اسکول سلطان پور لودھی میں مکمل ہوئی۔ شیخ صاحب ذہین طالب علم تھے اور ان کے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر بہت بڑا انسان بنے گا۔ ان کے نزدیک بڑے انسان سے مراد انگریز سرکار کی نوکری میں اعلیٰ عہدہ حاصل کرنا تھا۔ شیخ صاحب بلاشبہ بڑے انسان بنے مگر انگریز کی خدمت کر کے نہیں، دینِ حق کے سپاہی بن کر! شیخ صاحب نے ہائی سکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے انھوں نے ۳۹-۱۹۳۸ء میں ریاضیات (Maths) میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے کلاس فیلوز میں کئی نمایاں طلبہ شامل تھے جو عملی زندگی میں خوب معروف ہوئے۔ مشہور اساتذہ اور ماہرین تعلیم پروفیسر انجم رومانی صاحب اور ڈاکٹر لال محمد چاولہ صاحب، ان کے ہم جماعت تھے۔ اسی دور میں چودھری غلام جیلانی صاحب، پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب اور ملک غلام علی صاحب بھی اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔ ان سب کی اگرچہ آپس میں شناسائی تھی مگر زیادہ قریبی مراسم نہ تھے۔ یہ سبھی اسلامیہ کالج میں مولانا مودودیؒ کے اسلامی لیکچر سنا کرتے تھے۔

گھریلو زندگی اور اہل وعیال

شیخ صاحب نے تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت شروع کر دی اور پھر جلد ہی ان کی شادی بھی ہوگئی۔ ان کی عائلی زندگی میں خوشیوں کے ساتھ غم بھی قسمت میں لکھے تھے۔ ان کی پہلی تین اولادیں [ایک بیٹا اور دو بیٹیاں] یکے بعد دیگرے اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ شیخ عبدالرؤف صاحب پیدا ہوئے۔ وہ ان کے بچوں میں سے پہلے فرد ہیں جو جوانی کی عمر کو پہنچے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء میں بھی ایک بیٹی اور ایک بیٹا چند سال زندہ رہ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ [انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون]۔ میاں بیوی میں ہم آہنگی، محبت واحترام اور تحریک کے لیے جذبۂ ایثار اس گھر کا حسن تھا۔ ان کی زندگی میں ان کے ہاں جانے کے مواقع ملتے تو ان صفات کا بھرپور

Marfat.com

احساس ہوتا تھا۔ شیخ صاحب کی شادی ۱۹۴۳ء میں اپنی خالہ زاد سے ہوئی۔ شیخ صاحب کے پانچ بچے اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں وفات پا گئے اور پانچ بچے جوانی کی عمر کو پہنچے۔ ان میں چار بھائی، عبدالرؤف، عبدالغفور، صبار احمد اور افتخار احمد اور ایک بہن ہیں۔ چاروں بھائی لاہور (منصورہ) ہی میں رہائش پذیر رہے جبکہ بہن ساہیوال میں مقیم ہے۔ صبار احمد، شیخ صاحب کی زندگی ہی میں دماغی امراض اور ڈیپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ بعد میں ۲۷/ جولائی ۲۰۰۸ء کو وہ وفات پا گیا۔ صبار مرحوم غیر شادی شدہ تھا اور اپنی والدہ کے ساتھ منصورہ میں رہتا تھا۔ باقی سبھی بچے ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں۔ ان کی والدہ محترمہ بیگم فقیر حسین بفضل خدا بقیدِ حیات ہیں۔

رضا کارانہ خدمات

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا کہ شیخ صاحب، ان کے بڑے بھائی نذر محمد صاحب اور ان کے چچازاد بھائی فضل محمد صاحب جماعت کے تاسیسی ارکان میں شامل تھے۔ اس زمانے میں نذر محمد صاحب کی رہائش اسلامیہ پارک لاہور ہی میں تھی اور قریب ہی مولانا مودودی کی رہائش اور ترجمان القرآن کا دفتر تھا۔ شیخ فقیر حسین اپنے سرکاری دفتر سے فارغ ہو کر اکثر شام کے اوقات میں ترجمان القرآن کے دفتر میں رضا کارانہ فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اسلامیہ کالج میں دوران تعلیم بھی مولانا مودودیؒ کے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ خاندانی بزرگان کے بقول جماعت اسلامی کے تاسیسی اجتماع اگست ۱۹۴۱ء میں کچھ مہمان ان کے گھر بھی مقیم رہے۔ اس طرح شیخ صاحب کا تعلق جماعت اسلامی سے ابتدا ہی سے گہرا اور قریبی رہا ہے۔

سرکاری ملازمت سے تحریکی ذمہ داریوں تک!

شیخ صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف سرکاری محکموں میں تھوڑی مدت کے لیے سول ملازمت کی۔ جہاں تک ان کی اس ملازمت کا تعلق ہے تو یہ دراصل ایک ٹرانزٹ پیریڈ تھا۔ کچھ عرصہ لاہور کارپوریشن میں، پھر CMA (سول اینڈ ملٹری اکاؤنٹس) فیروز پور میں ملازم رہے۔ (یہاں ان کا رابطہ ایک تحریکی شخصیت جناب مشتاق احمد اصلاحی صاحب سے رہا۔) اس

Marfat.com

کے بعد آخری سروس اے. جی آفس میں تھی۔ یہ ملازمت قیامِ پاکستان سے قبل ہی شروع کی تھی اور اس میں ترقی کے بڑے مواقع تھے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد حکومت کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ یا جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفا دو یا سرکاری ملازمت چھوڑ دو۔ اس نادر شاہی حکم کے وقت شیخ صاحب اے. جی آفس میں بڑی اہم پوسٹ پر کام کر رہے تھے اور دفتر کے افسرِ اعلیٰ کو ان پر بے پناہ اعتماد تھا۔ وہ ان کو کسی قیمت پر فارغ نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر شیخ صاحب استعفا دے کر ملازمت سے فارغ ہوئے اور گھر آ گئے۔ اس عزم کا اظہار کیا کہ بھوک اور فاقہ منظور ہے مگر تحریک کا ساتھ چھوڑ دینا ہرگز گوارا نہیں! کچھ ہی دنوں بعد مولانا مودودیؒ کا پیغام ملا کہ شیخ صاحب آج کل کیا کر رہے ہو۔ جواب دیا ”کرنا کیا ہے، سرکاری ملازمت سے فارغ ہو گیا ہوں۔ اب اللہ کی توکل پہ جو کچھ بن پڑے گا کروں گا.....“ مرکز جماعت میں ناظم مالیات کے لیے کسی ذمہ دار اور اہل شخص کی ضرورت تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ اولین فرصت میں مرکز جماعت رپورٹ کریں۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۲ء میں انھیں جماعت اسلامی کا باقاعدہ مرکزی ناظم مالیات مقرر کیا گیا اور وہ اپنی وفات یکم جنوری ۱۹۸۳ء تک یہ اہم ترین ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے۔

مولانا مودودی سے رابطہ

جہاں تک مولانا مودودیؒ سے ابتدائی تعارف اور ملاقات کا تعلق ہے تو شیخ صاحب بتایا کرتے تھے کہ اپنے برادر بزرگ کی وجہ سے ترجمان القرآن شروع ہی سے ان کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ مولانا سے غائبانہ تعارف ان کی تحریروں کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا اور ملنے کا اشتیاق تھا۔ ”پہلی دفعہ مولانا کو اس وقت دیکھا جب میں سکول کا طالب علم تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سلطان پور لودھی تشریف لائے تھے۔ ان کا یہ دورہ اہلِ تشیع کے تعزیہ کے تنازعہ کے سلسلے میں تھا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ بھی مولانا مودودی سلطان پور لودھی تشریف لے گئے۔ یہ دوسرا دورہ سلطان پور کی تحریکِ اصلاحِ معاشرہ کی سالانہ تقریب میں مہمان مقرر کے طور پر تھا۔“ شیخ صاحب اوائل عمری ہی سے اپنے شہر کی اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ یہ تحریک خاصی متحرک و فعال تھی اور ہر سال

Marfat.com

اپنے اجتماع کے موقع پر جید علماء کو دعوت دیتی تھی۔ اس کے بعد اسلامیہ پارک میں رہائش کے دوران تو مولانا مودودی سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ یوں مولانا مودودی صاحب اور شیخ صاحب کا تعلق بڑا پرانا اور خلوص پر مبنی تھا۔

معالج کو ہدایات

شیخ صاحب کے بچوں بلکہ ان کی پوری فیملی کے ساتھ بھی مولانا محترم بہت محبت کا سلوک کرتے تھے۔ مولانا محترم کی ہمسائیگی میں رہائش کی وجہ سے دونوں بزرگوں کے بچوں کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ اب بھی یہ باہمی تعلق احترام اور خلوص پر مبنی ہے۔ [تقریباً ۵ سال] شیخ صاحب اچھرہ میں مولانا مودودی محترم کے ہمسائے میں مقیم رہے۔ شیخ صاحب جب بھی بیمار ہوئے، مولانا محترم اور جماعت کے باقی ساتھی جن میں میاں صاحب محترم بھی شامل ہیں، بہت پریشان ہوتے تھے۔ شیخ صاحب یوں تو ابتدائی عمر میں تندرست ہی رہے مگر ان کو بلڈ پریشر کا عارضہ جوانی ہی میں لاحق ہوگیا تھا۔ پھر ایک موقع پر پیشاب کی تکلیف ہوئی تو ٹیسٹ کرانے پر معلوم ہوا کہ پراسٹریٹ (Prostrate Glands) کا مسئلہ ہے۔ اس کے علاج اور آپریشن کے لیے میو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس زمانے میں ایک ہمدرد اور ماہر سرجن پروفیسر عبدالرشید صاحب اس وارڈ کے انچارج تھے۔ بدقسمتی سے وہ مسلسل آپریشن کرنے میں دیر کیے جا رہے تھے اور اس کی کوئی وجہ بھی نہ بتاتے تھے۔ تقریباً ایک مہینہ سے زائد انھوں نے انتظار کروایا۔ آخر ایک دن شیخ صاحب نے ان سے قدرے سخت الفاظ میں ٹال مٹول کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ہر دوسرے تیسرے روز مولانا محترم کا فون آتا ہے اور ان کی ہدایت ہے کہ جب تک بلڈ پریشر نارمل نہ ہو، آپریشن نہ کیا جائے۔

شیخ صاحب کے بزرگان اور مولانا

مولانا محترم نہ صرف شیخ صاحب سے بلکہ ان کے والد شیخ رحیم بخش صاحب سے بھی دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ شیخ رحیم بخش مرحوم کے جنازے میں بھی مولانا بنفس نفیس شامل تھے۔ ان کا

Marfat.com

انتقال قیام پاکستان کے فوراً بعد ہوگیا تھا۔ شیخ صاحب کی والدہ جن کا انتقال نومبر ۱۹۶۳ء میں ہوا، کے جنازے میں بھی مولانا مودودیؒ شریک ہوئے۔ مولانا محترم اکثر مواقع پر شیخ صاحب کے گھر بھی تشریف لے جاتے تھے۔ یہ مواقع عید، علالت و بیماری یا کسی دوسری اہم تقریب کے سلسلے میں ہوتے تھے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب کی خوش دامن صاحبہ سندھ ضلع سانگھڑ سے ان کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ ایک دن وہ کہنے لگیں کہ میں نے مولانا مودودیؒ کا تذکرہ بہت سنا ہے، مجھے ان سے ملاقات کرنی ہے۔ شیخ صاحب نے مولانا کی مصروفیات کا تذکرہ کیا مگر انھوں نے کہا کہ نہیں میں نے تو ضرور مولانا محترم سے ملنا ہے۔ اس پر شیخ صاحب نے کہا کہ میں ان کو کل دوپہر کے کھانے پر بلا لیتا ہوں، اس موقع پر ملاقات ہو جائے گی۔ رات کو جب شیخ صاحب مولانا محترم کے کمرے میں گئے تو مولانا محترم حیران ہو کر پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے جو اس وقت آئے ہو۔ شیخ صاحب نے کہا کہ میں کل آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں، مگر آپ نے کسی سے ذکر نہیں کرنا۔ مولانا محترم کہنے لگے ''اچھا اگر کوئی پوچھے گا تو میں یہ کہوں گا کہ میں نے بتانا نہیں کہ فقیر حسین صاحب کے ہاں دعوت پر جا رہا ہوں۔'' اگلے دن شیخ صاحب بازار سے کچھ سامان خرید کر گھر دے گئے۔ جب مرکز پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہلال عید کے تنازعے کے سلسلے میں ایوبی حکومت کی طرف سے مولانا محترم کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور انھیں بنوں جیل بھیج دیا گیا ہے۔ شیخ صاحب کی ساس مرحومہ یہ سن کر بہت مایوس ہوئیں۔

جیل سے تعزیتی خط

مولانا کی نظر بندی اور بنوں جیل میں اسیری کے دوران فروری ۱۹۶۷ء میں شیخ صاحب کے برادر اصغر شیخ عاشق حسین صاحب کی بڑی بیٹی ایک رکشے کی زد میں آکر وفات پا گئی۔ مولانا محترم کو جیل ہی میں اطلاع ملی اور انھوں نے جیل سے تعزیت کا خط لکھا، جس میں انھوں نے مشہور فقرہ ''ہماری سڑکیں قتل گاہیں بن گئی ہیں'' لکھا تھا۔ یہ فقرہ آج بھی حقیقت کا ترجمان ہے۔ اس وفات کے سلسلے میں شیخ صاحب کی خوش دامن صاحبہ کو تعزیت کے لیے دوبارہ لاہور آنا پڑا۔ اسی دوران

Marfat.com

مولانا محترم کی رہائی ہوگئی تو پھر شیخ صاحب دفتر میں ملاقات کے لیے انھیں مولانا کے پاس لائے۔ ساتھ ہی کہا کہ اب آپ کو دعوت نہیں دے رہا کہ کہیں آپ پھر سرکاری مہمان بن کر سرکار کی دعوت کھانے ڈیرہ اسماعیل خان کا رخ نہ کرلیں۔ مولانا شیخ صاحب کی بات پر مسکرائے اور کہا ''کیا اپنی کرامتوں کا آپ یونہی اظہار کیا کریں گے؟'' مولانا محترم کو جب بھی شیخ صاحب اپنے گھر کھانے پر بلاتے تو مولانا مذاحاً یہ بھی کہا کرتے کہ فقیر حسین صاحب! آپ کی دعوت کھانے کے لیے تو مجھے بنوں جانا پڑتا ہے۔

باہمی مزاح

ایک دفعہ مولانا محترم اور شیخ صاحب ایک ساتھ کسی شادی کی دعوت میں جارہے تھے۔ شیخ صاحب کا بڑا بیٹا عبدالروف بھی ساتھ تھا۔ مولانا محترم کہنے لگے ''ان کو بھی ساتھ لے جارہے ہیں؟ شیخ صاحب نے کہا کہ میں چاہتا ہوں خلافت قائم رہے۔ مولانا محترم نے برجستہ فرمایا ''یہ خلافت تو نہیں ''کھلاوت'' کا معاملہ ہے۔'' عبدالروف کے بقول اس کی شادی کے موقع پر مولانا محترم نے شیخ صاحب کو کچھ رقم عطا کی۔ شیخ صاحب یہ رقم لینے پر راضی نہ تھے۔ مولانا محترم نے کہا یہ میرا فرض ہے۔ اس پر فقیر حسین صاحب کہنے لگے اچھا میں قرض سمجھ کے رکھ لیتا ہوں تو مولانا محترم نے فرمایا فقیر حسین صاحب فرض کو فرض ہی رہنے دیں، نقطے نہ بڑھائیں۔

ایک موقع پر شیخ صاحب نے اپنی یادداشت کے متاثر ہوجانے کے حوالے سے مولانا سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مالیات کا نظام کسی اور کے حوالے کردیا جائے۔ مولانا محترم فرمانے لگے بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر میں دوسرا فقیر حسین کہیں سے نہیں لاسکتا۔ اسی بات کو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک دوسرے انداز میں دہرایا۔ شیخ صاحب کی وفات کی اطلاع اصلاحی صاحب کو ملی تو وہ منصورہ آئے اور شیخ صاحب کی وفات کو جماعت کے لیے ایک بڑا نقصان قرار دیا اور دیر تک ان کے یادگار واقعات بیان فرماتے رہے۔ پھر جنازے کے اجتماع میں بھی مرحوم کا ذکرِ خیر کیا اور تدفین کے موقع پر قبرستان میں اصلاحی صاحب میاں صاحب محترم سے

Marfat.com

فرمانے لگے ''میاں صاحب، آپ چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں گے تو آپ کو فقیر حسین کا نعم البدل نہیں ملے گا، بدل مل جائے گا، ناظم مالیات بھی مل جائے گا مگر فقیر حسین نہیں ملے گا۔''

حاضر جوابی

شیخ صاحب اپنی حاضر جوابی کے لیے تمام تحریکی حلقوں اور ساتھیوں میں بہت معروف تھے۔ ان کے ایسے بے شمار دلچسپ مکالمے اور تبصرے اکثر دوستوں کو یاد ہیں۔ خود مولانا مودودیؒ کے ساتھ بھی ان کا مزاح کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ مولانا محترم کی عادت تھی کہ عید کی نماز کے بعد عام ملاقات کے لیے ۵۔اے ذیلدار پارک کے لان میں بیٹھتے تھے۔ ایک موقع پر مولانا محترم نے کرسیاں لان کے بجائے شیخ صاحب کے دفتر کے باہر ہی لگوا دیں، کیونکہ موسم کے مطابق وہی جگہ بیٹھنے کے لیے مناسب سمجھی گئی۔ شیخ صاحب کے بچے جو اس وقت بچپن کی حدود سے ابھی نکل رہے تھے، بھی ان کے ساتھ مولانا محترم سے عید ملنے آئے اور شیخ صاحب کے ساتھ وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا محترم مزاحاً کہنے لگے ''فقیر حسین صاحب آپ تو اپنے دفتر میں بیٹھیں، کوئی عیدی دینے ہی آجاتا ہے۔'' شیخ صاحب نے برجستہ جواب دیا ''مولانا! راستے میں تو آپ بیٹھے ہیں جو عیدی دینے آئے گا اس سے آپ لے لیں گے اور جو عیدی لینے آئے گا اسے میرے پاس بھیج دیں گے لہٰذا میرے دفتر بیٹھنے کا تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔'' اس پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنسے اور خود مولانا بھی خوب محظوظ ہوئے۔

امیر جماعت، فقیر جماعت

ایک دفعہ مولانا محترم فرمانے لگے فقیر حسین صاحب بیت المال تو اب بہت مالدار ہو گیا ہے۔ آپ اپنا نام بدل کر امیر حسین رکھ لیں۔ جواب میں شیخ صاحب کہنے لگے ''میں آپ کے کہنے کے مطابق نام تو بدل لیتا ہوں مگر خزانہ خالی ہو جائے گا۔'' مولانا محترم کے استفسار پر کہ ایسا کیوں ہوگا؟ انھوں نے کہا کہ فقیروں کا کام ہے مانگنا، ہم نے مانگ مانگ کر بیت المال بھر دیا ہے۔ امیروں کا کام ہے لٹانا، تو جب میں امیر حسین بنوں گا تو ظاہر ہے خزانہ خالی ہو جائے گا۔ مولانا

Marfat.com

محترم مسکرا کر کہنے لگے ”تب فقیر حسین ہی بہتر ہے، فقیر حسین ہی رہیے۔“ اسی طرح ایک مرتبہ مرکزِ جماعت میں کچھ عرب مہمان تشریف لائے۔ مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر امیر صوبہ پنجاب، امیر لاہور اور ایک آدھ دیگر اضلاع کے امرا بھی موجود تھے۔ ان سب لوگوں کا مہمانوں سے تعارف ہوا۔ ہر شخص اپنے نام کے ساتھ امیر فلاں، امیر فلاں کہہ رہا تھا۔ فقیر حسین صاحب کی باری آئی تو کہا ”فقیر حسین، فقیر جماعتِ اسلامی مرکز“۔ خلیل حامدی صاحب نے جب مہمانوں کے سامنے شیخ صاحب کے مزاج کی روشنی میں ان کے منصب کی وضاحت کی تو مہمان بھی بہت محظوظ ہوئے اور کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

خلقِ عظیم

مولانا محترم شیخ صاحب کی قابلیت، کردار اور خوبیوں سے واقف تھے۔ وہ ہر ساتھی کی اس کے مقام و مرتبے کے مطابق عزت و توقیر بھی کیا کرتے تھے۔ شیخ صاحب ہی نہیں ان کے بچوں سے بھی مولانا اظہار محبت فرماتے تھے۔ شیخ صاحب کے بیٹے کہتے ہیں کہ مولانا مرحوم ہمارے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔ شیخ صاحب کے بیمار بیٹے صبار احمد کے ساتھ تو مولانا خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ اگر کبھی وہ دفتر میں نظر آتا تو اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے۔ اسے روزانہ پورے غور سے اخبار پڑھتے ہوئے دیکھ کر یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اخبار بینی کا شوق تو فقیر حسین صاحب کے بچوں ہی میں دیکھا ہے۔ میاں طفیل محمد صاحب محترم کا تعلق بھی شیخ صاحب کے ساتھ احترام و محبت اور شفقت پر مبنی تھا، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اولین اور سابقین کی طرح آج بھی جماعت کے قائدین اور مخلص کارکنان کا آپس میں تعلق خلوص، محبت، احترام اور شفقت پر مبنی ہے۔ سابقون الاولون کو ہم نے ایک دوسرے کے لیے رطب اللسان پایا۔ مرحوم کے بیٹے کا بیان ہے کہ ”چودھری محمد اسلم سلیمی صاحب، چودھری رحمت الٰہی صاحب، میاں طفیل محمد صاحب (مرحوم)، محترم نعیم صدیقی صاحب (مرحوم)، محترم راجہ احسان الحق صاحب (مرحوم)، مولانا ملک غلام علی صاحب (مرحوم)، چودھری غلام جیلانی صاحب (مرحوم)، اکرم قریشی صاحب، صاحب زادہ ابراہیم

Marfat.com

صاحب (مرحوم)، محمد نواز منہاس صاحب، اسعد گیلانی صاحب (مرحوم)، صدیق الحسن گیلانی صاحب (مرحوم)، محترم قاضی حسین احمد صاحب، محترم سید منور حسن صاحب، مولانا عبدالمالک صاحب، حافظ محمد ادریس صاحب، جناب لیاقت بلوچ صاحب، مسعود احمد خاں صاحب اور جماعت کے بہت سے رہنماؤں اور کارکنوں کا والد صاحب سے تعلق بے مثال محبت اور احترام پر مبنی تھا اور خدا کا شکر ہے کہ ان سب کا ہمارے ساتھ بھی اسی محبت اور شفقت پر مبنی تعلق اور سلوک آج تک قائم ہے۔''

میاں صاحب کا خصوصی تعلق

میاں صاحب محترم بھی اچھرہ میں شیخ صاحب کے ہمسائے رہے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ ایک ہی گھر کے دو حصوں میں سے ایک حصے میں شیخ صاحب رہائش پذیر تھے اور دوسرے حصے میں میاں صاحب۔ دونوں بزرگ اور ان کے بچے روزمرہ کاموں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ جماعتی سرگرمیوں کے علاوہ ذاتی امور میں بھی صلاح مشورہ چلتا رہتا تھا۔ عبدالرؤف نے بیان کیا'' میاں صاحب محترم کی اہلیہ نے انتقال (نومبر ۱۹۹۱ء) سے پہلے جس آخری تقریب میں شرکت کی وہ ہماری ہمشیرہ کی رسم نکاح ورخصتی تھی۔'' شیخ فقیر حسین صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ عاشق حسین صاحب فوت ہوئے تو جنازہ رات کے وقت تھا۔ میاں صاحب محترم نے صاحب زادہ ابراہیم صاحب کو فرمایا کہ جنازے پر مجھے جانا ہے اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ ابراہیم صاحب نے کہا'' میاں صاحب رات کو جنازہ تاخیر سے ہونا ہے اور آپ کو تکلیف ہوگی اس لیے آپ نہ جائیں مگر انھوں نے فرمایا کہ نہیں جانا ہے۔ یہ شیخ فقیر حسین مرحوم کا میرے اوپر قرض ہے۔'' میاں صاحب اور شیخ صاحب کے بچوں کے درمیان بھی دوستی بے تکلفی حد درجے کی ہے اور وہ ذاتی مسائل پر بھی ایک دوسرے سے رائے لیتے ہیں۔

شیخ صاحب کی اہلیہ محترمہ اور ان کے بچے مرحوم کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرحوم گھر میں ایک شفیق باپ اور ذمہ دار شوہر کی حیثیت سے رہتے تھے۔ تمام خاندان میں ان کا

Marfat.com

احترام کیا جاتا تھا اور شیخ صاحب ہر رشتہ دار کے ساتھ چاہے اس کے خیالات کچھ بھی ہوں اور مالی حالت کیسی بھی ہو، احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم کا پورا خاندان اور دوسرے رشتہ دار جماعت اسلامی کے ساتھ قلبی تعلق رکھتے ہیں۔

نیامدرسہ اور شیخ صاحب

شیخ صاحب کے بچوں کی تعلیم نیامدرسہ ہائی سکول میں ہوئی۔ شیخ صاحب بچوں کی تعلیمی حالت کے بارے میں رپورٹ حاصل کرنے کے لیے سکول بھی جاتے اور اساتذہ، بالخصوص قاضی ثناء الحق صاحب سے خوب مزاح کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا'' قاضی صاحب شاگردوں کو صرف رٹا ہی لگواتے ہیں یا کچھ مغز میں بھی ڈالتے ہیں۔'' انھوں نے جواب دیا'' آپ امتحان لے لیں '' فرمانے لگے'' اساتذہ کا یا شاگردوں کا'' قاضی صاحب نے بھی برجستہ جواب دیا'' دونوں کا، کیوں کہ آپ تو سبھی کے استاد ہیں۔'' قاضی ثناء الحق صاحب نے منصورہ میں پلاٹ بھی شیخ صاحب کے ساتھ والا ہی پسند کیا۔ دونوں بزرگوں کے گھر پہلو بہ پہلو ہیں۔

تربیت اولاد

شیخ صاحب اپنے بچوں کے ساتھ بھی بڑے بے تکلف تھے۔ ان کے بچوں کے الفاظ ہیں '' تربیت کے حوالے سے یہ بات عرض کرنا ہے کہ ہماری پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی جس میں نیکی، بھلائی اور حسن اخلاق کا حصہ زیادہ تھا۔ والد صاحب نے ہمیں کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی اور نہ ہی کبھی سزا دی، جماعتی سرگرمیوں سے وقت بہت تھوڑا ملتا تھا۔ اسی میں ہماری تعلیمی حالت کو چیک کرتے اور بہتر بنانے کے لیے مدد کرتے۔ امتحانات کے قریب ہمیں پڑھاتے تھے اور زیادہ تر اصول اور عمومی پہلو ذہن نشین کرواتے اور کہتے اب کسی قسم کا بھی سوال آئے گا تو باآسانی کر سکو گے۔''

شیخ صاحب گھر میں اہل و عیال کو تاریخی واقعات، اپنے بچپن کے واقعات، صحابہ کرام کے قصے، رسول اکرمؐ کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات اور قرآنی قصے سنایا کرتے تھے۔ سچے عاشق رسول تھے۔ نبی اکرمؐ سے محبت اور عقیدت بہت زیادہ تھی۔ ساتھ ہی توحید پر کوئی سمجھوتہ نہ کرتے

Marfat.com

تھے۔عموماً کہا کرتے تھے آدمی کو عقائد کے لحاظ سے اہل حدیث، عبادات میں دیوبندی اور عقیدت رسولؐ میں بریلوی ہونا چاہیے۔مولانا مودودی کے تو مرید تھے ہی، علامہ اقبال سے بھی بڑی عقیدت تھی۔بعض اوقات گھر میں کلام اقبال ترنم سے بھی سنایا کرتے تھے۔

گھر میں گپ شپ اور تبادلۂ خیالات

برادرم عبدالرؤف نے اپنے والد مرحوم کے متعلق گھریلو مجالس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ جماعتی سرگرمیوں کے بارے میں تو زیادہ بہتر انداز میں ابراہیم صاحب یا مسعود خان صاحب بیان کر سکتے ہیں کیونکہ دفتر کی زندگی کے بارے میں گھر میں کم ہی بات کرتے تھے۔البتہ اگر میں کبھی کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب ضرور دیا کرتے تھے۔مثلاً ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ کسی معاملے میں کبھی مولانا مودودی محترم سے اختلاف بھی ہوا تو کہنے لگے بہت سے معاملات میں ہوا۔میں ایک دفعہ مولانا سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں مولانا مان لیں تو بہتر ورنہ میں اپنی رائے واپس لے لیتا ہوں۔ایک دفعہ بتانے لگے کہ شوریٰ میں جو معاملات پیش ہوتے ہیں۔ان پر خوب بحث ہوتی ہے۔مختلف آراء سامنے آتی ہیں مگر جو فیصلہ ہو جاتا ہے وہ پھر سب کا متفقہ ہوتا ہے اور ہر کوئی اسے کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے۔

پدری نصیحت

اکثر کہتے: اپنے کردار کو اتنا پختہ بناؤ کہ لوگ اسی سے متاثر ہوں اور یہی جماعت اسلامی کے ورکر کی پہچان ہو۔لٹریچر محض اس تاثر کو بہتر بناتا ہے۔اس کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا عمل بھی ایسا ہی تھا۔جن دنوں اے جی آفس میں تھے تو AG اکثر کہتے تھے تمام مولوی کام چور ہیں سوائے مولوی فقیر حسین کے۔اسی طرح جب والد صاحب نے AG آفس چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تو ان کو اس سے روکنے کی کوشش کے سلسلے میں AG صاحب مولانا محترم سے بھی ملنے کے لیے آئے۔

جب مجھے اسلام آباد میں پہلی سروس ملی تو Join کرنے سے پہلے نصیحت حاصل کرنے اور سلام کرنے کی غرض سے مولانا محترم کے پاس حاضر ہوا۔انھوں نے نصیحت کی کہ رزق اور زندگی اللہ

Marfat.com

کے ہاتھ میں ہے۔ان کے سلسلے میں کبھی کمزوری نہ دکھانا، میاں صاحب محترم نے اس موقع پر مجھے نصیحت کی کہ جہاں بھی جاؤ اتنی محنت اور ذہانت سے کام کرنا کہ لوگ آپ کو ناگزیر (Inevitable) سمجھیں۔"

گرم دمِ جستجو

شیخ صاحب کو مختلف بیماریاں مختلف اوقات میں لاحق ہوتی رہیں۔سب سے پہلے ہائی بلڈ پریشر ۱۹۵۰ء کی دہائی سے لاحق ہوا۔اس کے علاوہ Prostate Gland کے بڑھ جانے کی تکلیف، دل کا عارضہ، شوگر، وقتی طور پر نسیان کی تکلیف اور یرقان وقتاً فوقتاً ہوتے رہے، مگر یہ تمام بیماریاں ان کو جماعتی سرگرمیوں اور روزمرہ کی ذمہ داریوں سے باز نہ رکھ سکیں۔آپ حیران ہوں گے کہ صاحبزادہ محمد ابراہیم (مرحوم) کے بقول زندگی کے آخری روز بھی دفتر میں موجود رہے۔ البتہ اس دن یہ کہا کہ یہ درودیوار جو کبھی بہت مانوس لگتے تھے، آج کچھ اجنبی سے لگ رہے ہیں۔ آخری بجٹ جب ۱۹۸۲ء کی مرکزی شوریٰ میں پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو خاصے نحیف تھے۔کسی صاحب نے کہا کہ آپ بیٹھ کر بجٹ پیش کر دیں تو حس مزاح بھڑک اٹھی۔ کہنے لگے "میں بیمار بجٹ نہیں پیش کر رہا" ایک دفعہ پروفیسر غفور احمد صاحب کہنے لگے "فقیر حسین صاحب آپ کی صحت اب خاصی کمزور ہوگئی ہے، آپ کوئی ہلکی پھلکی ذمہ داری لے لیں" تو مسکرا کر کہا کہ مجھے نائب امیر بنوا دیں۔ پروفیسر صاحب اس زمانے میں مرکزی نائب امیر کے منصب پر فائز تھے۔ وہ بھی اس مزاحیہ جملے سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

شیخ صاحب کے لطائف

شیخ صاحب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے اور حاضر جوابی میں بھی کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔سید مودودیؒ کے ساتھ تو ان کی "گاڑھی چھنتی" تھی۔ایک دفعہ مولانا رحیم یار خان کے دورے پر تشریف لے گئے۔ اتفاق سے ان دنوں شیخ صاحب بھی آڈٹ کے سلسلے میں وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر مولانا کے استقبال کے لیے جو رفقا آئے تھے ان میں شیخ صاحب

Marfat.com

بھی موجود تھے اور سب سے پہلے مولانا کی نظر ان ہی پر پڑی تو مسکرا کر کہا کہ "لو بھئی! یہاں بھی فقراء آئے ہوئے ہیں۔

باقر خاں صاحب، شیخ صاحب اور پروفیسر غفور صاحب

پروفیسر غفور احمد صاحب سے جب میرا ابتدائی تعارف ہوا تو اچھرہ میں شیخ صاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔ پروفیسر صاحب نے مجھ سے کہا کہ پی ایچ ڈی کر لو، میں نے عرض کیا ارادہ تو ہے مگر اس سے کیا ہوگا؟ شیخ صاحب کی حِس مزاح جاگ اٹھی۔ فرمانے لگے پروفیسر صاحب نے چند سال ایک کالج میں پڑھایا، اب دیکھو مستقل طور پر پروفیسران کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ تم بھی ڈاکٹر کہلانے لگو گے......" پروفیسر صاحب اور دیگر احباب بھی محظوظ ہوئے۔ ایک مرتبہ جب شیخ صاحب خاصے بیمار اور کمزور تھے تو پروفیسر صاحب مالیات میں تشریف لائے اور فرمایا "شیخ صاحب اب آپ کوئی ہلکا پھلکا کام اپنے ذمے لے لیں" فوراً جواب دیا "پھر مجھے نائب امیر بنوادیں۔" پروفیسر صاحب اس جواب پر بھی بہت محظوظ ہوئے۔ پروفیسر صاحب اس زمانے میں نائب امیر جماعت تھے۔

ایک دفعہ مرکزی شوریٰ کے اجلاس میں شیخ صاحب نے مرکزی دفاتر کے لیے مزید ٹائپ رائٹر مشین کی ضرورت کا اظہار کیا تو امیر ضلع ملتان خان باقر علی خان صاحب فوراً کھڑے ہوئے اور اعتراض کرتے ہوئے کہا "جب پہلے ایک موجود ہے تو پھر دوسری کی کیا ضرورت ہے؟" اس پر شیخ صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فوراً کہا "خود ان ہی سے پوچھ لیجیے کہ ایک اگر موجود تھی تو دوسری کی کیا ضرورت تھی"۔ یاد رہے کہ باقر علی خان صاحب نے ایک سے زائد شادیاں کر رکھی تھیں۔

اسی طرح عید الفطر کے ایک موقع پر جبکہ مولانا مودودیؒ جامعہ اشرفیہ میں نمازِ عید کی ادائیگی کے لیے تشریف لائے تو شیخ صاحب نے بڑی خاموشی سے مولانا کے کان میں کہا: "مولانا میرا گھر یہاں سے قریب ہے (رحمانپورہ)۔ چلیے کچھ شیرینی ہو جائے۔" مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا: "کیوں نہیں؟" اور بآوازِ بلند دوسرے رفقاء جو ساتھ تشریف لائے تھے یا وہاں اس وقت

Marfat.com

موجود تھے سب کو کہا کہ بھئی شیخ صاحب نے شیرینی کی دعوت دی ہے، آپ لوگ بھی چلیں۔ اس طرح بیس پچیس حضرات کا قافلہ لے کر مولانا، شیخ صاحب کے ہمراہ چل دیے۔ شیرینی کے اختتام پر مولانا مرحوم فرمانے لگے: "بھئی شیخ صاحب عیدیں تو بہت آئیں اور منائیں مگر جو لطف آج آیا ہے کسی عید پر نہیں آیا۔" یہ سن کر تمام رفقا بھی کھکھلا کر ہنس پڑے۔

مولانا مرحومؒ مرکزی رفقا کے ساتھ بہت عزت و احترام سے پیش آتے۔ جماعت کے تمام وابستگان، بالخصوص اپنے ساتھ کام کرنے والے ہمہ وقتی رفقائے کار کے ساتھ بے تکلفی بھی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔

وفات کی اطلاع

شیخ صاحب کی بیماری اور وفات کے وقت راقم کینیا میں تھا۔ ان کی وفات کی خبر روزنامہ جسارت سے ملی۔ بڑا افسوس ہوا کہ ایک چراغ گل ہوگیا، ایک پھول مرجھا گیا اور ایک موتی لڑی سے گر گیا۔ وہاں سے ہمیشہ واپسی پر شیخ صاحب سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہاں کے حالات اور فاؤنڈیشن کے کاموں کی رپورٹ بڑی دلچسپی اور شوق سے سنا کرتے تھے۔ وفات سے قبل میں ایک بار آیا تو خصوصی طور پر گھر پر دعوت کی۔ کھانے کے دوران فرمانے لگے "دو سفید زہر بڑے خطرناک ہیں، ان سے ہمیشہ احتیاط برتنی چاہیے، ایک چینی اور دوسرا نمک۔" مجھے کینیا میں ان کی وفات کی خبر ملی اور میں انتہائی افسردہ ہوا تو میرے دوستوں نے پوچھا "یہ کون شخص تھے؟" میں نے کہا "گلدستۂ مودودی کے گل سرسبد۔" پردیس میں اس خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔

آخری لمحات

مرحوم کے اہل و عیال سے راقم اپنی واپسی پر تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو انھوں نے بتایا کہ آخری روز صبح ہی سے طبیعت کی خرابی کی شکایت کر رہے تھے۔ بظاہر نزلہ زکام لگ رہا تھا۔ ان دنوں منصورہ کے اردگرد میڈیکل سٹور بھی نہیں تھے۔ عبدالرؤف کچھ دوائیاں لینے کے لیے جانے لگا تو کہنے لگے بھئی ان سردیوں میں ریوڑیاں کھائی ہی نہیں۔ چنانچہ میں واپسی پر دواؤں کے ساتھ

Marfat.com

ریوڑیاں بھی لیتا آیا۔ بڑے خوش ہوئے۔ چند ایک کھائیں بھی، باقی جیب میں رکھ لیں۔ (یکم جنوری ۱۹۸۳ء) رات دس بجے کے قریب طبیعت اچانک خراب ہوئی اور پندرہ بیس منٹ ہی میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

جب برادرم عبدالرؤف اپنے والد گرامی قدر کے آخری لمحات کے واقعات سنا رہا تھا تو شیخ صاحب کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ دل نے کہا کہ وہ اللہ کا نیک بندہ تھا۔ دعا ہی یہ کیا کرتا کہ اے اللہ اپنی ذات کے سوا کسی کا محتاج نہ بنانا۔ سو بیماریوں کے باوجود اللہ نے محتاجی سے محفوظ رکھا اور یہ بندۂ نیک چلتا پھرتا ایمان کے ساتھ اللہ کے دربار میں چلا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی اور جماعت اسلامی کے تمام مرحومین، کارکنوں اور رہنماؤں اور تمام بچھڑ جانے والے مسلمانوں کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

Marfat.com

محمد یعقوب خالد مرحوم

(۱۹۱۶-۱۹۹۰ء)

لوحِ حافظہ کا البم

میرے بزرگ وشفیق احباب میں کئی نام ہیں۔ ہر شخصیت کا اپنا رنگ اور اپنی خوشبو ہے۔ تاریخ انسانی کے عظیم فاتحین اور ملوک وسلاطین بھی براجمان ہیں۔ اہلِ علم وتقویٰ بھی تشریف فرما ہیں۔ عام لوگ، سیاح، موجدین، اساتذہ، مزدور، سیاست کار، صنعت کار، جج اور قضاۃ، غرض سبھی طبقوں کے لوگ کوئی نمایاں کام کر جائیں تو تاریخ میں جگہ پا لیتے ہیں۔ نمایاں کاموں میں اچھے کام بھی شمار ہوتے ہیں اور برے کرتوت بھی ریکارڈ ہو جاتے ہیں۔ تاریخ مورخ کے قلم سے لکھی جاتی ہے۔ میں نہ مورخ ہوں نہ تجزیہ کار، البتہ میرے سینے میں اپنے جاننے والی شخصیات کا ایک خوبصورت البم موجود ہے۔ میں اس البم میں وہی تصویریں سجاتا ہوں جن میں خیر و بھلائی پاتا ہوں۔ رہے دوسری نوعیت کے کردار تو ان کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ اچھائی نمایاں اور اجاگر اسی وقت ہوتی ہے جب اس کی ضد بھی سامنے ہو۔ بہر حال میں اپنے البم میں پہلی قسم کی تصاویر ہی سجاتا ہوں۔ آج البم پر نظر ڈالتے ہوئے ایک پیاری تصویر بار بار لوح حافظہ پر ابھری۔ یادوں کے دیپ جلتے چلے گئے اور دل کے ویران کدے میں ایک چراغاں کا سماں پیدا ہو گیا۔ ایک محبّ محترم، شفیق و ہمدرد شخصیت کا تذکرہ آج لوحِ حافظہ پر آ رہا ہے۔ یہ تھے محترم محمد یعقوب خالد۔

پاکستان سے کینیا

جنوری ۱۹۷۴ء کی ایک خوشگوار سہ پہر تھی جب میں جدہ سے نیروبی پہنچا۔ موسم معتدل اور

Marfat.com

نئے ملک کا یہ علاقہ سبزہ زاروں اور پھولوں کی مہک سے دامنِ دل کھینچ رہا تھا۔ نیروبی ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی کچھ مشفق و مہربان دوستوں نے یوں بازو پھیلا کر استقبال کیا کہ اگرچہ انھیں زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر یوں احساس ہوا جیسے ان کے ساتھ جنم جنم کا ساتھ ہے۔ یہ تھے ڈاکٹر محمد سعید صاحب، جناب شفیع میر صاحب، جناب عبدالحلیم بٹ صاحب اور جناب خلیل احمد ملک صاحب۔ آج سے کئی سال قبل یکے بعد دیگرے یہ تمام پیاری شخصیات اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، مگر ان کی شیریں و معطر یادیں دل سے کبھی محو نہیں ہوئیں۔ غالباً میں بدھ کی شام کو نیروبی پہنچا تھا۔ اگلے روز یعنی بروز جمعرات، اسلامک فاؤنڈیشن کے دفتر میں عبدالحلیم بٹ صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا تو ایک ٹیلی فون آیا۔ بٹ صاحب نے بہت بے تکلفی اور خوش طبعی کے ساتھ علیک سلیک کرنے کے بعد فرمایا کہ حافظ صاحب میرے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ براہِ راست ان سے بات کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی بٹ صاحب نے ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری جانب سے ایک گرج دار آواز آئی: ''السلام علیکم، خوش آمدید۔ میرا نام محمد یعقوب خالد ہے۔ اسلامک فاؤنڈیشن والوں سے آپ کا تذکرہ سنا تھا، ملنے کا اشتیاق ہے۔''

وضع دار بزرگ

میں نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ فرمانے لگے: ''کل جمعہ ہے، آپ جامع مسجد ریلوے لانڈھیز میں جمعہ پڑھائیں''۔ میں نے بٹ صاحب کی طرف دیکھا، کیونکہ مجھے محمد یعقوب خالد صاحب کے بارے میں نہ تو پہلے بتایا گیا تھا نہ ہی کوئی تعارف تھا۔ بٹ صاحب نے اشارے سے کہا کہ ہاں جمعہ پڑھاؤ۔ میں نے خالد صاحب سے عرض کیا کہ ان شاء اللہ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ اس پر انھوں نے مجھے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا: ''بھئی یہ حکم نہیں درخواست ہے''۔ میں نے کہا: ''سر آنکھوں پر''۔ میں نے دل میں کہا کہ بزرگ وضع دار آدمی لگتے ہیں۔ جب ٹیلی فون پر بات ہو چکی تو میں نے بٹ صاحب سے پوچھا: ''یہ صاحب کون ہیں؟'' تو انھوں نے فرمایا: ''یہ بہت بھلے انسان ہیں، جس سے محبت کریں اس

Marfat.com

کے لیے ابریشم سے بھی زیادہ نرم ہیں، بڑی خوبیوں کے مالک ہیں مگر طبیعت میں جلالی پن کچھ زیادہ ہے۔ اس لیے جس سے ناراض ہو جائیں تو پھر بہت سخت رویہ اختیار کرتے ہیں''۔ میں نے کہا: ''اللہ خیر کرے گا''۔

پہلی ملاقات

میرے نزدیک اگر کوئی شخص بااصول ہو اور اس کی طبیعت میں محض ہٹ دھرمی، ضد، عناد، حسد اور بغض نہ ہو بلکہ کسی اصول کے تحت وہ خوش ہو اور اسی کے تحت ناراض ہو تو اسے دنیا کے بہترین انسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی فون پر گفتگو سے میرے ذہن میں ایک شخصیت کا تصور ابھرا، لوحِ حافظہ پر ایک تصویر نقش ہو گئی۔ اگلے دن بٹ صاحب کے ساتھ ان کی گاڑی میں جمعہ کی اذان سے قبل جامع مسجد پہنچا تو وسیع و عریض مسجد کے باہر پارکنگ کی کھلی اور سلیقے سے بنائی گئی جگہ پر ایک فربہ جسم، دراز قد اور رعب دار شخصیت سے آمنا سامنا ہو گیا۔ موصوف چہرے پر سنجیدگی و متانت سجائے اپنی گاڑی سے نکلے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور غالباً سو کلوگرام سے زیادہ وزن، موٹی آنکھیں اور جناح کیپ کے ساتھ پاکستانی لباس! موصوف انتہائی اپنائیت کے ساتھ ہماری طرف بڑھے اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ پھر گلے لگا لیا۔ میں نے یعقوب خالد صاحب کا جو تصور اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ کم و بیش ویسے ہی تھے۔ مسجد میں داخل ہوئے تو مسجد کی خوب صورتی اور صفائی دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ طہارت خانے بھی ترتیب سے مسجد کے باہر بنائے گئے تھے جبکہ وضو خانہ مسجد کے صحن میں تھا۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے صحن کے باہر ایک نہایت خوبصورت بارہ دری ٹائپ ڈیوڑھی تھی، جس میں سلیقے سے بینچ رکھے ہوئے تھے۔ مسجد میں آتے اور جاتے وقت نمازی یہاں جوتے بھی اتارتے اور پہنتے اور باہمی تبادلہ خیال کرنا ہوتا تو اس کے لیے بھی آرام و اطمینان سے موقع مل جاتا۔

احباب مسجد

مسجد میں داخل ہوئے تو چند نمازی موجود تھے، جن میں کچھ افریقی تھے اور کچھ ایشیائی۔ میں

Marfat.com

نے دل میں سوچا کہ اتنی بڑی مسجد ہے اور یہ چند نمازی ہیں، مگر جونہی ہم مسجد کے صحن میں داخل ہوئے اور اذان کی آواز بلند ہوئی تو میں نے دیکھا کہ گاڑیوں کی قطار مسجد میں داخل ہو رہی ہے۔ سنتوں سے فارغ ہوئے تو یعقوب خالد صاحب نے ٹائم کے بارے میں بتایا۔ آدھا گھنٹہ تقریر اور اس کے بعد عربی خطبہ۔ پھر ٹھیک گھڑی کی سوئی کے ساتھ ڈیڑھ بجے جماعت کی اقامت۔ الحمدللہ ان کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق بیس پچیس منٹ کی مختصر تقریر، جس کے بعد اذان ثانی، پھر خطبہ اور جماعت۔ تقریر شروع ہونے کے بعد پانچ منٹ تک مسجد میں اچھی خاصی حاضری ہو گئی تھی۔ یعقوب خالد صاحب نے آج کے جمعے کے لیے خصوصی طور پر لوگوں کو بروقت پہنچنے کی تلقین کی تھی۔ طبیعت خوش ہوئی۔ نماز کے بعد بہت سے لوگ ملے، جن سے پہلے کوئی شناسائی نہ تھی مگر بیشتر بعد میں جگری یار بن گئے۔ کس کس کو یاد کروں بے شمار نام ہیں۔ حاجی عبدالستار، عبدالحفیظ، محمد اکرم، چودھری تاج الدین، محمد شریف، محمد بشیر شکاری، ظہور احمد صاحب، محترم لالہ سرور، برادرم ایوب خالد، الطاف احمد اور بے شمار دیگر۔ پہلی ہی ملاقات میں یوں محسوس ہوا جیسے اپنے دیرینہ رفقا کے درمیان آ گیا ہوں۔

وقت کی پابندی

مسجد سے نکلتے ہوئے یعقوب خالد صاحب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور کہا کہ مجھے ڈاکٹر سعید صاحب نے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ الحمدللہ آپ نے اچھی اور موثر باتیں کیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وقت کی مکمل پابندی کی جو پاکستان سے آنے والے علما مشکل ہی سے کر پاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس جلالی بزرگ کے ساتھ تعلقات کا آغاز شیریں اور حسین یادوں کے ساتھ ہوا ہے۔ الحمدللہ یہ آخری دم تک یوں ہی قائم رہا، بہرحال ان کے تبصرے پر میں نے عرض کیا کہ علما کے پاس چونکہ بہت سی علمی باتیں کہنے کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے مختصر وقت میں ان کا احاطہ ممکن نہیں ہوتا۔ میں عامی آدمی ہوں، میرے پاس چند ہی باتیں تھیں سو میں نے دیے گئے وقت کے اندر کہہ دیں۔ کہنے لگے آپ میرے ساتھ میرے گھر تشریف لے

Marfat.com

چلیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا فیصلہ تو بٹ صاحب ہی کر سکتے ہیں جو میرے میزبان ہیں۔ اس پر بٹ صاحب نے کہا: "ہاں، ان شاء اللہ آپ کے گھر آئیں گے مگر آج نہیں، پھر کسی روز۔" یہ تھے محمد یعقوب خالد جن کے ساتھ یادگار ماہ وسال گزرے۔ واقعی وہ بااصول آدمی تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ قریبی ساتھیوں کے درمیان بھی کبھی کوئی ناخوشگوار لمحہ در آتا ہے مگر ان کے متعلق الحمدللہ مجھے ایسا ایک لمحہ بھی یاد نہیں باوجود اس کے کہ وہ انتہائی جلالی طبیعت کے مالک تھے۔

مشرقی افریقہ آمد کی کہانی

محمد یعقوب خالد صاحب کا آبائی شہر لاہور تھا۔ ان کے والد ابراہیم عیدا صاحب بسلسلہ روزگار، ایک برٹش کالونی یعنی غیر منقسم ہند سے ایک اور برٹش کالونی یعنی ایسٹ افریقہ گئے تو اپنی فیملی کو بھی ساتھ لے گئے۔ یہیں پر محمد یعقوب خالد اور ان کے بڑے بھائی حاجی محمد اسماعیل کا بچپن گزرا۔ یعقوب خالد صاحب نے اپنے والد ابراہیم عیدا کی سرپرستی میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ گھریلو تربیت بھی حاصل کی جس میں اسلامی رنگ غالب تھا۔ ان کے والد ۱۹۰۱ء میں کینیا، یوگنڈا ریلوے میں ملازمت کے لیے مشرقی افریقہ آئے تھے۔ یعقوب خالد صاحب نے نیروبی کے مشہور تعلیمی ادارے جمہوری ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں تیل کی کمپنی شیل ایسٹ افریقہ لمیٹڈ میں ملازم ہوگئے۔ یہ پٹرولیم کی مشہور عالمی کمپنی تھی جس میں انھوں نے ۱۹۴۳ء تک کام کیا، پھر برطانوی حکومت کے تحت سپیشل ریزرو پولیس ایسٹ افریقہ میں بطور آفیسر ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت میں انھیں عزت تو بہت ملی مگر ان کی طبیعت اس طرح کے کاموں سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ ماتحت عملے پر تو خوب رعب جمایا جا سکتا تھا مگر افسران بالا جو بھی تقریباً انگریز تھے، کا رعب اور ناز نخرے بھی برداشت کرنا پڑتے تھے، موصوف اس کے عادی نہ تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں محض ایک سال کے بعد سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔

ٹھیکیداری

سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد یعقوب خالد مرحوم نے خود اپنا کام ٹھیکیدار کی حیثیت سے

Marfat.com

شروع کیا۔ پہلے کوئی تجربہ نہ تھا مگر ذہین اور اچھے منتظم تھے، اس لیے اس میں کامیاب رہے۔ وہ کینیا ریلوے کو لکڑی اور دیگر میٹریل فراہم کیا کرتے تھے۔ اس دوران مختلف اوقات میں کینیا کے مختلف خوب صورت علاقوں میں انھیں رہایش اختیار کرنے کا موقع ملا اور مختلف قبائل کے کلچر کو قریب سے دیکھ کر انھیں احساس ہوا کہ افریقی لوگ فطرت کے بہت قریب ہیں۔ اگر انھیں اسلام کے آفاقی پیغام سے روشناس کرایا جائے تو بہت جلد وہ اسے قبول کر سکتے ہیں۔ جن علاقوں میں انھیں کام کرنے کا موقع ملا ان میں رونگائی، ایل برگن، ماجی مزوری اور گلگل شامل ہیں۔ میں نے اپنے قیام کینیا کے دوران یہ تمام مقامات دیکھے ہیں۔ یہ بہت ہی خوب صورت تفریحی مقامات، جنگلوں میں گھرے ہوئے، شکار گاہوں کے لیے معروف اور قدرتی مناظر سے بھی مالا مال ہیں۔ پولیس میں اپنی ایک سالہ ملازمت کے دوران یعقوب خالد صاحب کو ممباسا میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ممباسا کینیا کا دوسرا سب سے بڑا شہر، بہت بڑی بحری بندرگاہ اور مسلمان اکثریت کا علاقہ ہے۔ مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں مکمل طور پر عربی اور اسلامی کلچر پایا جاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں مسلمان تاجر صدر اول میں آ گئے تھے۔ یوں اسلامی تعلیمات پہلی صدی ہجری سے اس مقامی آبادی کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئی تھیں۔ ممباسا اور اس سے آگے مختلف جزائر میں جائیں تو یہی احساس ہوتا ہے کہ کسی عرب ملک میں آ گئے ہیں۔

اسلامی و دینی خدمات

۱۹۶۹ء میں کینیا کی آزاد حکومت نے کینیا آئل کمپنی لمیٹڈ قائم کی تو اسے اس فیلڈ میں تجربہ کار ملازمین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ یعقوب خالد صاحب کو کنٹریکٹ پر اس کمپنی میں چیف اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ جب پہلی ملاقات ہوئی تھی اس وقت موصوف اسی کمپنی میں ملازم تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۷ء تک یہاں کام کیا اور پھر ریٹائرمنٹ لے لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اپنی پوری زندگی اسلام اور مسلم کمیونٹی کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ اپنی ملازمت اور کاروبار کے دوران انھوں نے اپنے بڑے بھائی حاجی محمد اسماعیل اور کینیا کی مشہور

Marfat.com

کاروباری شخصیت حاجی عبدالستار چودھری کے ساتھ مل کر نیروبی کی جامع مسجد ریلوے لانڈھیز تعمیر کی تھی۔اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی مساجد اور مدارس تعمیر کیے۔اپنے بھائی کی وفات کے بعد انھوں نے ان تمام منصوبوں کو اپنی تحویل اور نگرانی میں لے لیا۔ان کے لیے وہ اپنی جیب سے فراخ دلی کے ساتھ خرچ کیا کرتے تھے اور اپنے حلقۂ احباب سے بھی معاونت وصول کرتے تھے جو بڑا کارنامہ اور تزکیۂ نفس کا بہترین نصاب ہے۔یعقوب خالد صاحب کا حلقہ یاراں بہت وسیع تھا مگر بہت ہی شدید اصول پسندی کی وجہ سے ان کے مخالفین کی بھی کمی نہیں تھی۔وہ کسی مخالف اور مخالفت کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں لگے رہتے۔

کینیا کا بابائے قوم

کینیا کی خوب صورت ترین مساجد میں ایک مسجد کینیا یونیورسٹی کالج کے قریب فوجی گیریژن میں تعمیر کرائی۔مرحوم مجھے خصوصی طور پر یہ مسجد دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔بعد میں مجھے خود کئی مرتبہ شوقِ دید اس مسجد کی طرف لے جاتا رہا۔یہ مسجد واقعی قابل دید ہے۔کینیا کے بابائے قوم مزے جوموکنیاٹا (Mzee Jomo Kenyatta) نے دسمبر ۱۹۷۳ء میں اس مسجد کا افتتاح کیا یعنی میری یہاں آمد سے صرف ایک ماہ قبل۔صدر کنیاٹا نے یعقوب خالد اور ان کے بھائی حاجی محمد اسماعیل صاحب کی بڑی تحسین کی۔انھوں نے اس موقع پر اپنی تقریر میں اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی بڑی تعریف کی۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے بائبل کے مقابلے میں اس کی حقانیت و صداقت کا زیادہ یقین ہے۔بلاشبہ یہ تاریخی خطاب تھا۔اگر صدر جوموکنیاٹا پر مزید کام کیا جاتا تو وہ مسلمان ہو جاتا۔اس شخص نے انگریزوں کے خلاف سیاسی ہی نہیں، مسلح جدوجہد بھی کی تھی اور سال ہا سال بغاوت کے کیس میں جیل میں رہا۔اس مسلح جدوجہد کا نام ماؤماؤ تحریک (Mao Mao Movement) تھا۔صدر کنیاٹا یورپی اقوام کے استعماری حربوں کی وجہ سے ان سے شدید نفرت کرتا تھا۔اس کا ایک مشہور قول ہے کہ جب یہ گورے یورپین مشنری بن کر یہاں آئے تو ان کی بغل میں بائبل تھی اور

Marfat.com

ہمارے پاس زمین۔ جب ہم نے ان کو یہاں سے نکالا تو ہمارے ہاتھ میں بائبل تھی اور ان کے قبضے میں زمین! کینیا اور دیگر زرخیز افریقی ممالک میں استعماری قوموں نے وسیع وعریض آباد اراضی اپنے قبضے میں کر لی تھی اور مقامی آبادی کو محرومی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ آنجہانی صدر سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، راقم الحروف کی ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ دل سے اسلام کو سچا جانتا اور مانتا تھا مگر اہل اسلام کی غفلت و بے توجہی اور اپنی بدنصیبی سے اس کا اقرار اور اعلان نہ کر سکا۔

گھریلو معاملات میں مشورے

یعقوب خالد صاحب کے ساتھ میرا تعلق اتنا قریبی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کی طرح مجھے ذاتی اور گھریلو معاملات میں بھی کئی مرتبہ شریک کر لیا کرتے تھے۔ میرے ان کے پانچوں بیٹوں سے بہت اچھے اور دوستانہ تعلقات تھے مگر سب سے بڑے بیٹے ایوب خالد اور راقم الحروف تو واقعتاً یوں یک جان دو قالب ہو گئے تھے کہ حقیقی بھائیوں جیسی محبت واخوت ہو گئی تھی۔ مرحوم کے دیگر بیٹوں کے نام زکریا، شرحبیل، (شرح بیل جسے لوگ شرجیل کہتے ہیں۔ یہ بھی شرجیل ہی کے نام سے معروف ہے۔) ادریس اور الیاس ہیں۔ سبھی بھلے لوگ ہیں۔ یعقوب خالد صاحب کئی مرتبہ مجھے اپنے گھر میں کھانے اور چائے کی دعوت دیتے۔ میرے پاس اپنی گاڑی تھی اور میری رہائش سے ان کے گھر کا فاصلہ پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو سے زیادہ نہیں تھا مگر شام کو جو مجلس لگتی تو عشاء کے بعد تک جاری رہتی۔ ایسے مواقع پر وہ اصرار کرتے کہ میں واپس اپنی رہائش گاہ قرآن ہاؤس جانے کی بجائے انھی کے ہاں قیام کروں۔ انھوں نے ایک کمرہ بھی میرے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ ان کے اصرار پر مجھے کئی مرتبہ ان کے گھر میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ مرحوم کی اہلیہ کو ہم امی جی کہتے تھے۔ ان کا نام حمیدہ بیگم تھا اور وہ بھی لاہور ہی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایسی نیک سیرت، مہمان نواز اور منکسر المزاج خواتین آج کے دور میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ ان کے گھر میں میرا قیام ہوتا تو بچوں کے ذریعے دودھ، پھل، مٹھائی اور نہ معلوم کیا کیا نعمتیں میرے کمرے کی میز پر سجا دیتیں۔ حق تعالیٰ ان میاں بیوی کے درجات بلند فرمائے۔

Marfat.com

محبت بھرا ماحول اور اپنائیت

میرے کینیا جانے کے چار پانچ ماہ بعد میرے تایا جان کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے گاؤں میں اس زمانے میں فون کی سہولت میسر نہ تھی۔ خط کے ذریعے سے ان کے انتقال کی اطلاع ملی تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ جوں جوں دوستوں کو معلوم ہوتا گیا وہ میرے پاس تعزیت کے لیے آنے لگے۔ یعقوب خالد صاحب دیر تک میرے پاس رہے اور پھر بڑا اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ دو تین دن تک اتنی مرتبہ میرا غم بانٹا کہ میں ان کی اس عظمت کو آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ یہ ان کی محبت ہی کا دام بمعنی جال نہ کہ بمعنی درھم تھا کہ لانڈھیز مسجد میں خطبۂ جمعہ کا جو سلسلہ شروع ہوا تو میرے کینیا کے قیام کے دوران مسلسل جاری رہا۔ انھی کے اصرار پر میں نے ہر سال نمازِ تراویح میں جامع مسجد ریلوے لانڈھیز میں قرآن پاک مکمل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ تراویح کے بعد خلاصۂ مضامین قرآن بھی پیش کیا جاتا تھا جسے اکثر شائقین اپنے طور پر ریکارڈ بھی کر لیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۴ء ہی میں اس عظیم الشان جامع مسجد میں بعد نماز مغرب ہر بدھ کے دن درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا گیا، جس میں دور دور سے لوگ شریک ہوتے تھے۔ کئی سالوں میں مجھے دو مرتبہ اول سے آخر تک لوگوں کے سامنے درس قرآن دینے کا شرف حاصل ہوا۔ میرے کینیا سے واپس آنے کے بعد میرے دوست شیخ محمد امین زاہد صاحب نے اس کارِ خیر کو جاری رکھا۔ اب معلوم نہیں کیا صورتِ حال ہے۔

طلبہ کے درمیان مقابلے

یعقوب خالد صاحب نے دینی مدارس کے طلبہ بالخصوص تحفیظ القرآن کے شعبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ملکی سطح پر مقابلۂ حفظ قرآن اور محافل تجوید و قرأت اور حمد و نعت منعقد کرنا شروع کیں۔ اس میں پہلی پانچ پوزیشن لینے والے طلبہ کو نقد انعام کے ساتھ سند اور شیلڈ بھی پیش کی جاتی تھی جبکہ دیگر طلبہ کو بھی آمد و رفت کے لیے وسائل فراہم کیے جاتے تھے۔ یہ پروگرام بہت مقبول ہوا۔ اس پروگرام کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں جو تین جج ہوتے تھے، ان میں سے مجھے

Marfat.com

ہر سال بطور چیف جج شامل کیا جاتا۔ میں نے پہلے سال معذرت کی کیوں کہ ہمارے ادارے جو اسلامک فاؤنڈیشن کے تحت چلتے تھے، تعداد میں بھی بہت تھے اور معیار کے لحاظ سے بھی الحمدللہ فائق تھے۔ میں نے کہا کہ چونکہ ان اداروں کا نگران و منتظم ہوں، اس لیے مجھے یہ ذمہ داری نہ سونپیں مگر یعقوب خالد صاحب نہ مانے۔ ہر سال ہمارے ادارے ہی زیادہ نمایاں پوزیشن حاصل کرتے تھے مگر ایک خاص بات یہ تھی کہ ہمارے طلبہ کو میرے ساتھ دیگر دونوں جج صاحبان کے دیے گئے نمبر مجھ سے زیادہ ہوتے تھے۔ ان پروگراموں میں حاضری بھرپور ہوتی تھی اور تمام شرکا کے لیے ظہرانے کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔

محکم اصول

یعقوب خالد صاحب نے زندگی میں اپنے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ ان کی پانچویں اور آخری بیٹی کے نکاح کا مرحلہ آیا تو مجھ سے فرمائش کی کہ میں نکاح پڑھادوں۔ میں نے ہامی بھرلی تو فرمایا کہ ہم نے دوپہر ایک بجے کا وقت مقرر کیا ہے اور میری عادت ہے کہ ہر کام ٹھیک وقت پر کیا کرتا ہوں۔ میں نے کہا شادیوں میں دعوت ناموں میں جو وقت دیا جاتا ہے اس کے بعد لکھا جاتا ہے کہ پابندیٔ وقت عظمت کی دلیل ہے وغیرہ وغیرہ مگر اس کی پابندی کبھی نہیں ہوتی اور تقریب کا آغاز بہت دیر سے ہوتا ہے۔ فرمانے لگے میں نے اس سے قبل دو بھتیجیوں اور تین بیٹیوں کو گھر سے رخصت کیا ہے، میرے ساتھ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کبھی تاخیر ہوئی ہو۔ میں بارات والوں کو پہلے سے پابند کر دیتا ہوں اور آپ حیران ہوں گے کہ میری پہلی بیٹی کی تقریب نکاح میں مدعو کیے جانے والے مہمانانِ گرامی اپنی روایت کے مطابق ڈیڑھ دو گھنٹے تاخیر سے آئے تو ہم بیٹی کو رخصت کر کے سامان سمیٹ رہے تھے۔ میرا اصول ہے کہ وقت پر آنے والوں کو سزا نہ ملے جو تاخیر سے آئیں وہ خود اپنے کیے کو بھگتیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ میری تقریبات میں لوگ لیٹ نہیں ہوتے۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے کہ مجھے معلوم ہے کہ میری انھی عادات کی وجہ سے کئی لوگ مجھے ہٹلر کہتے ہیں مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ اصول اصول ہے اور اصول کی

Marfat.com

پابندی لازمی ہے۔ان کی بیٹی کی شادی میں میں نے دیکھا کہ ٹھیک ایک بجے نکاح کا رجسٹر میرے ہاتھ میں تھا اور تقریب شروع ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ دونوں طرف سے مہمان بھی تشریف لے آئے تھے۔ساری تقریب سمیٹنے میں ایک گھنٹہ لگا۔

محبت فاتح عالم

یعقوب خالد صاحب دمے کے مریض تھے۔انہیلر (Inhaler) اپنے پاس رکھتے تھے مگر کسی کو وقت دیا ہوتا تو اپنی تکلیف کے باوجود اس میں کبھی تاخیر نہ کرتے۔دور دراز کے علاقوں میں انھوں نے جو مساجد اور مدارس تعمیر کیے تھے،ان کی طرف کئی مرتبہ ہم نے اکٹھے سفر کیا۔میں نے دیکھا کہ وہ بہت اچھے ہمراہی تھے۔اپنے ساتھیوں کے آرام کا پورا خیال رکھتے تھے۔جب میں کینیا سے پاکستان واپس آ گیا تو ان کے بے پناہ اصرار پر اور ان کی بے لوث محبت کی بدولت مجھے تین سال مزید ماہِ رمضان میں وہاں کا سفر درپیش رہا۔ایک مرتبہ یعقوب خالد صاحب پاکستان آئے تو ہمارے ہاں منصورہ میں بھی تشریف لائے۔وہ مرکز کے سارے سیٹ اپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔وہ جماعت اور مولانا مودودیؒ کے پہلے ہی سے مداح تھے،مگر یہاں کے اداروں کو دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ خوش ہوئے۔میرے پاکستان چلے آنے کے بعد کبھی کبھار خط و کتابت یا فون سے ان کی خیر خیریت کا پتا چلتا رہتا تھا۔

اچھے جانشین

۷ ردسمبر ۱۹۹۰ء کو ان کی وفات ہوئی،جس کی اطلاع مجھے کافی تاخیر سے ملی۔میں نے ان کے لیے خصوصی دعا کی اور دل میں کہا کہ تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا ہے۔اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔انھوں نے اپنے پیچھے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں بیسیوں پوتے پوتیاں،نواسے نواسیاں اور ان کی اولاد چھوڑی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے اپنے پیچھے وہ مراکز صدقہ جاریہ کے طور پر چھوڑے ہیں جو ان کے لیے ہمیشہ نفع بخش ثابت ہوں گے۔محمد یعقوب خالد صاحب کے بیٹے بیٹیوں میں سے کئی ایک کینیڈا اور دیگر ممالک میں مقیم ہیں۔مجھے کئی سال قبل

Marfat.com

مرحوم کی زندگی میں امریکہ اور کینیڈا جانے کا اتفاق ہوا تو ان کے بیٹے بیٹیوں نے اسی محبت و اپنائیت کا اظہار کیا جس کا مظہر ان کے عظیم والدین تھے۔ اسی طرح مرحوم کی وفات کے بعد جب بھی میں کینیا گیا تو وہاں بھی محمد ایوب خالد اور محمد ادریس خالد نے پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ اچھے والدین کی اولاد میں ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ یعقوب خالد کی اولاد ان کی سچی جانشین ہے۔ ان کے قائم کردہ اداروں کو نہ صرف قائم رکھا ہے بلکہ ان میں مزید بہتری اور ترقی کا اہتمام بھی کرتے رہتے ہیں۔ مرحوم کی وفات کے بعد راقم جب بھی کینیا گیا، ان کے قائم کردہ دینی و تعلیمی اداروں، مدارس و مساجد اور دارالایتام دیکھے تو دل سے یہ آواز اٹھی کہ مرحوم کی نیک صلبی اولاد کی طرح یہ تمام ادارے بھی ان کے جانشین ہیں۔ انھوں نے صدقۂ جاریہ بھی چھوڑا، علمِ نافع کے سوتے بھی جاری کیے اور سعادت مند اولاد بھی ان کی قائم مقام ہے۔ یہی کسی انسان کی حقیقی بچت اور مفید و مثمر نفع ہوتا ہے۔ مرحوم عظیم انسان اور دردِ دل سے مالا مال مسلمان تھے۔ مرحوم کے تمام احباب اس کے گواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور ان کی انسانی لغزشوں سے درگزر فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

Marfat.com

فضیلۃ الشیخ علی طنطاویؒ

(۱۹۰۸ء-۱۹۹۹ء)

حسنِ خَلق اور حسنِ خُلق

۴ر ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۹ر جون ۱۹۹۹ء بروز ہفتہ، عالم اسلام کے مایہ ناز سپوت، ادیب، فقیہہ، محقق، مصنف، مبلغ اور عالم دین شیخ علی طنطاوی جدہ میں انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحوم کی یادیں تازہ کرتے ہوئے میں یہ تذکرہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب سے میں ۱۹۸۵ء میں بیرون ملک سے واپس وطن آیا اور منصورہ میں مقیم ہوا تو عالم عرب اور عالم اسلام کی معروف دینی شخصیات کی وفات پر مرحوم حضرت مولانا خلیل حامدی اور راقم باہمی تبادلہ تعزیت کیا کرتے تھے۔ مولانا حامدیؒ کی وفات کے بعد برادر گرامی مولانا فیض الرحمان ہمدانی مرحوم کے ساتھ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کا وجود بسا غنیمت تھا مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ زیادہ عرصہ ہمارے ساتھ رہیں۔ اتفاق سے شیخ علی طنطاوی کی وفات سے دو روز قبل ۱۷ر جون کو ہمدانی صاحب بھی دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے جانے والے ہیں۔ کیا معلوم کب بلاوا آ جائے۔ اللہ تعالیٰ ایمان اور اسلام کے ساتھ زندہ رکھے اور اسی کے ساتھ اٹھائے۔ شیخ طنطاوی مرحوم اپنی اسلامی خدمات کی وجہ سے تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ وہ شکل وصورت میں بھی بہت حسین وجمیل تھے اور سیرت وکردار میں بہت پاکیزہ اور قابل تحسین تھے۔

علمی خاندان

شیخ علی طنطاوی کا تعلق شام سے تھا۔ وہ ۱۲ر جون ۱۹۰۸ء کو دمشق میں پیدا ہوئے۔ ان کے

Marfat.com

والد شیخ محمد طنطاوی ایک علمی شخصیت تھے، جب کہ ان کے ماموں شیخ محب الدین الخطیب تو عالمی شہرت کے حامل مصنف اور ادیب تھے۔ شیخ طنطاوی نے ابتدائی تعلیم دمشق میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم بھی جامعہ دمشق سے ۱۹۳۵ء میں مکمل کی۔ انھوں نے ادب، لٹریچر اور قانون کے مضامین میں ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۹۳۶ء میں انھوں نے کچھ عرصے کے لیے ایک مدرسے میں بطور استاد کام کیا مگر جلد ہی وہ مصر، لبنان اور عراق میں مزید حصول علم کے لیے چلے گئے۔ شیخ علی طنطاوی کو دار العلوم قاہرہ میں سید قطب کے ساتھ ایک کلاس میں پڑھنے اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان ممالک سے حصول علم اور پھر فراغت کے بعد تدریس کے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا۔ چند سالوں کے بعد واپس دمشق آ کر شیخ علی طنطاوی نے محکمہ قضا میں خدمات سرانجام دیں۔ وہ دمشق کے معروف ججوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ ۱۹۶۳ء تک اس منصب پر فائز رہے۔

مجاہدِ حریت

شیخ علی طنطاوی نے دورِ شباب میں کم و بیش تمام عرب ممالک کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ عراق میں برطانوی سامراج کے خلاف ۱۹۵۰ء کے عشرے میں حریت پسند مجاہدین میں ان کا نام بھی ملتا ہے۔ اسی دوران تیونس، الجزائر اور مراکش میں مسلمان فرانسیسی استعمار کے مقابلے پر سیاسی و عسکری جدوجہد کر رہے تھے۔ علی طنطاوی نے اپنے خطابات اور تحریروں کے ذریعے ان تحریکوں کے حق میں لسانی و قلمی اور مالی جہاد کیا۔ اس دور میں وہ ان تحریکوں کے لیے مالی امداد بھی جمع کرتے اور مجاہدین تک پہنچاتے تھے۔ بیش تر ملکوں میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے انھوں نے مجاہدین کے ساتھ وقت بھی گزارا اور ان کی مشکلات و مسائل کے متعلق براہِ راست معلومات حاصل کیں۔ ان تمام ممالک میں شیخ کے عقیدت مند کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

صلاحیت و قابلیت

مصر میں ان کا قیام بڑا مفید تھا۔ اس عرصے میں شیخ نے اپنے وطنِ عزیز شام کے سیاسی امور

Marfat.com

اور معاملات میں بھی دل چسپی لی۔ جیسا کہ اوپر تذکرہ ہوا ہے، وہ اپنے دورِ شباب میں ان تمام احتجاجی تحریکوں کے روح رواں رہے جو شام اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک سے فرانسیسی اور انگریزی استعمار کے خاتمے کے لیے منظم کی جاتی رہیں۔ شیخ علی طنطاوی شعلہ نوا مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے منتظم بھی تھے۔ احتجاجی تحریکوں کے دوران جب بھی کوئی مشکل وقت آتا، ان کے ساتھی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انھی کی طرف رجوع کرتے اور وہ مشکل عقدوں کو چٹکیوں میں حل کر دیتے۔ اپنے پرجوش خطابات کے ذریعے لوگوں کے جذبات کو ابھارنے اور اپنی حکمت اور تدبر کے ذریعے انھیں ایک خاص سمت میں لے کر چلنے کا ملکہ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو خوب عطا فرمایا تھا جس کا انھوں نے بھرپور استعمال کیا۔ وہ اپنے دوستوں کی امیدوں پر ہمیشہ پورا اترے۔

معرکۂ انتخابات میں

مصر ہی میں قیام کے دوران شیخ طنطاوی اخوان المسلمون سے بہت قریب رہے۔ اخوان پر اگرچہ پابندی تھی مگر وابستگان تحریک مشکل حالت میں بھی عزیمت کے دیپ جلاتے رہے تھے۔ شیخ نے سیاسی امور پر کافی مطالعہ بھی کیا تھا اور عالم عرب کی ہر تحریک حریت میں رول بھی ادا کیا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ فکر راسخ ہوگئی تھی کہ عرب ممالک میں موثر آواز اٹھانے اور کلمہ حق ادا کرنے کے لیے مجالس قانون ساز کے اندر جانا ضروری ہے۔ اسی سوچ کے تحت شیخ علی طنطاوی نے ۱۹۵۴ء کے شام کے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے حلقے میں ان کی مقبولیت بہت زیادہ تھی اور عموماً لوگوں کی رائے یہ تھی کہ شیخ علی طنطاوی کو کوئی بھی نہیں ہرا سکتا مگر بااثر طبقات ان کے خلاف متحد ہو گئے۔

زمانے کی ریت

اس کے نتیجے میں ان کے بعض قریبی ساتھی بھی سازش کا شکار ہوئے اور ان کا ساتھ چھوڑ کر ان کے مخالف امیدوار سے جا ملے۔ شیخ علی طنطاوی اپنی یادداشتوں میں اس واقعے کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور اس کی تلخ یادوں کو نہایت مزاحیہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ اس سے قاری

Marfat.com

لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور دنیا داروں کی اس عمومی روش پر اظہار افسوس بھی کرتا ہے۔ لوگ پیسے اور اثر و رسوخ کے پیچھے چلتے اور چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں بلکہ تاریخ کے ہر دور میں ایسا ہوتا رہتا ہے کہ لوگوں کے دل حسینؓ کے ساتھ ہوتے ہیں اور تلواریں یزید کے ساتھ! مخالف امیدوار کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اس لیے شیخ علی طنطاوی ان انتخابات میں ہار گئے، مگر دمشق میں ہر شخص کی زبان پر تھا کہ وہ ہارے نہیں ہروائے گئے ہیں۔ یہی دمشق تھا جب واقعۂ کربلا کے بعد ہر گھر میں لوگ کہتے تھے کہ حسینؓ قتل نہیں ہوا، زندۂ جاوید ہو گیا ہے اور یزید کامیاب نہیں ہوا ذلیل و رسوا ہو گیا ہے۔ زمانے کی یہ ریت عجیب ہے مگر کافی پرانی ہے۔

شیخ اور اخوان

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، شیخ علی طنطاوی اخوان المسلمون کی تحریک سے متاثر تھے اور ان کے مختلف پروگراموں میں ان کی کھل کر حمایت کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود کبھی کبھار بعض معاملات میں وہ اپنے تحفظات و اختلاف رائے کا بھی اظہار کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اختلافی بات کو بھی اتنے خوب صورت انداز اور شیریں لہجے میں پیش کرتے کہ کوئی آدمی ان کی کسی بات سے کبھی خفا ہوا اور نہ کسی کے جذبات مجروح ہوئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بعض لوگوں کو خاص اوصاف ودیعت کیے جاتے ہیں جو دعوت کے میدان میں ان کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ شیریں مقال شیخ علی طنطاوی ہمیشہ مسکراتے چہرے کے ساتھ لوگوں سے ملتے تھے۔ شیخ نے اپنی بیٹیوں کے رشتے بھی اخوانی نوجوانوں سے کیے۔

جلاوطنی

شیخ علی طنطاوی جس طرح غیر ملکی استعمار کے خلاف جدوجہد کرتے رہے، اسی طرح انھوں نے شام میں قائم ملکی آمریت کے خلاف بھی جہاد جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگے اور اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ ظالم حکمران شیخ کو راستے سے ہٹانے کے لیے قتل کی سازش کریں گے۔ ان حالات میں شیخ کے لیے جب اپنے وطن کی سرزمین تنگ ہو گئی تو

Marfat.com

انھوں نے بادل ناخواستہ ۱۹۶۳ء میں سعودی عرب کی جانب ہجرت کی اور اپنی باقی ماندہ زندگی جلاوطنی ہی میں گزار دی۔ شیخ کا انتقال جدہ میں ہوا۔ ''بادل نخواستہ'' کا جو لفظ میں نے استعمال کیا ہے شیخ کی اکثر تحریروں میں اس کی جھلک ہی نہیں مکمل ترجمانی نظر آتی ہے۔ اپنے وطن سے محبت، بچپن کی یادیں، دمشق اور اس کے خوبصورت ماحول کا تذکرہ، اپنے آباؤاجداد اور پیاروں کی قبروں کا ذکر اور دمشق کی جامعہ امویہ کی تصویر کشی، پھر حسرت ویاس! قاری ان کی تحریر کو پڑھ کر ان کا درد خوب محسوس کر سکتا ہے۔ شیخ دمشق سے دوری پر مختلف انداز میں اپنی اس محرومی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ کو پڑھتے ہوئے بے ساختہ میر تقی میر یاد آ جاتے ہیں جو دلی کا رونا روتے اور ہجر و فراق کے مرثیے لکھتے رہے۔ میر تقی میر دلی سے لکھنؤ گئے تھے۔ واپسی میں کوئی امر مانع نہ تھا جب کہ شیخ علی طنطاوی پر شام کے دروازے بند تھے۔

فصاحت و بلاغت

قادر الکلام ادیبوں اور شعلہ نوا خطیبوں کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ قاری اور سامع کو اپنے ساتھ یوں لیے پھرتے ہیں کہ جو چیز وہ خود محسوس کریں قاری اور سامع بھی وہی محسوس کرتا ہے۔ شیخ علی طنطاوی کو اللہ تعالیٰ نے وسیع علم بھی عطا فرمایا تھا اور فصیح و بلیغ عربی زبان میں لکھنے اور بولنے کا بھی ایسا ہنر بخشا تھا کہ لوگ ان پر رشک کرتے تھے۔ ان کا خطاب سننے والے اور ان کی تحریر پڑھنے والے اس موضوع میں کھو جاتے جو شیخ اپنے قارئین، سامعین اور ناظرین کے سامنے پیش کر رہے ہوتے۔ شیخ نے ہر موضوع پر لکھا حتیٰ کہ شیخ نے جہاں سنجیدہ دینی موضوعات پر قلم اٹھایا اور ان کا حق ادا کیا ہے وہیں انھوں نے ڈرامے، کہانیاں، افسانے اور ناولٹ بھی لکھے ہیں۔ شیخ نے جگہ جگہ اپنی تحریروں میں طنز و مزاح کا ایسا رنگ پیدا کیا ہے کہ اس کی چاشنی سے قاری مسکرانے اور بعض اوقات قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ شیخ کی تحریروں کو پڑھ کر قاری جہاں قہقہے لگانے لگتا ہے وہیں بعض اوقات اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بھی بہنے لگتے ہیں۔

Marfat.com

صاحب تصنیف بزرگ

شیخ کی یادداشتیں جو انھوں نے کئی قسطوں میں لکھیں اور مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتی رہیں اور جو کتابی صورت میں آٹھ جلدوں کے اندر مرتب ہوئیں، بڑے خاصے کی چیز ہیں۔ اسی طرح شیخ کی کتاب من نفحات الحرم بھی بہت موثر تحریر ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت وہیبت بھی سامنے آتی ہے اور اس کی بے پایاں رحمت ومحبت بھی مجسم صورت میں نظر آتی ہے۔ تاریخ اسلامی کے ایمان افروز واقعات بھی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں اور اسلاف کی عظمت کے سامنے دورِ حاضر کے ننگ اسلاف مسلمان عبرت کا نمونہ بنے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بعض جگہوں پر تو شیخ جب اللہ کے سامنے اپنی عاجزی وانکسار کا تذکرہ کرتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے رحم کو آواز دیتے ہیں تو بے ساختہ اس منظر اور رقت آمیز کیفیت میں قاری بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر اشکوں سے وضو کرنے لگتا ہے۔

مبلغ اور خطیب

شیخ علی طنطاوی جب سعودی عرب آئے تو وہ غیر معروف انسان نہیں تھے بلکہ اس وقت تک پوری عرب دنیا میں ان کا نام معروف ہو چکا تھا۔ ایک ادیب اور عالم کی حیثیت سے بھی اور ایک قانون دان اور جج کی حیثیت سے بھی بچہ بچہ ان کو جانتا تھا۔ اس کے علاوہ دمشق ریڈیو سے ان کے جو اسلامی، تاریخی اور ادبی پروگرام نشر ہوتے تھے وہ پوری عرب دنیا میں بڑے شوق سے سنے جاتے تھے۔ سعودی عرب میں آنے کے بعد شیخ کچھ عرصہ ریاض میں اور اس کے بعد مکہ مکرمہ میں ایک کالج میں پڑھاتے رہے۔ شیخ مختلف یونی ورسٹیوں میں بھی لیکچر دیتے رہے۔ خاص طور پر ریاض کی معروف یونی ورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود ان کے خصوصی محاضرات کا اہتمام کرتی رہتی تھی۔

شیخ اور ذرائع ابلاغ

شیخ نے سعودی عرب میں قیام کے دوران پچیس تیس سال تک مسلسل ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پروگرام پیش کیے جن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی شیخ کا کوئی پروگرام نہ ہو پاتا تو سعودی عرب

Marfat.com

اوراس کے باہران کے مداحین اس پر سراپا احتجاج بن جاتے اور انتظامیہ کو مراسلے اور فون موصول ہونے لگتے تھے۔شیخ کے پروگرام جو اس سارے عرصے میں باقاعدگی سے نشر ہوتے رہے تین قسم کے تھے۔ان کا ایک پروگرام تو روزانہ ہوتا تھا اور اس کا موضوع تھا:''مسائل ومشکلات''۔اس میں لوگوں کے سوالات کے جوابات ہوتے تھے۔معاشرے کے اندر عمومی نوعیت کی مشکلات کا تذکرہ بھی ہوتا تھا اور وہ پوری دنیا میں انسانیت کو درپیش مسائل، پریشانیوں اور پیچیدگیوں پر بھی رہنمائی دیتے تھے۔دوسرا پروگرام ہفتہ وار ہوتا تھا اور اس کا موضوع تھا:''نوروہدایہ''۔یہ تذکیر کا پروگرام ہوا کرتا تھا۔قرآن وسنت، سیرت نبویؐ، سیرت صحابہؓ، سیرت سلف صالحین اور مشاہیر اسلام کی مثالیں بھی ہوتی تھیں اور جذبۂ خیر وتحریک عمل کا لوازمہ بھی۔اسی طرح ماہ رمضان میں روزانہ ان کا ایک پروگرام ہوتا تھا جس کا موضوع تھا''علی مائدۃ الافطار''ان سب پروگراموں کو لوگ پوری فیملی کے ساتھ اجتماعی طور پر دیکھا اور سنا کرتے تھے۔جب شیخ اپنی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے یہ پروگرام پیش کرنے سے قاصر ہوگئے تو ان کے مداحین نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذمہ داران سے مطالبہ کیا کہ شیخ کے سابق پروگراموں کی کیسٹ چلادی جایا کرے۔چنانچہ ان کے پروگرام اس عرصے میں اسی طرح جاری رہے اور شاید اب ان کی وفات کے بعد بھی لوگوں کے اصرار پر یہ سلسلہ جاری رہے۔

ذاتی مشاہدہ

شیخ علی طنطاویؒ کو جس شخص نے بھی دیکھا اور سنا ہے وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے چہرے میں ایک خاص قسم کی کشش رکھی تھی۔ہمارے شامی بھائی ویسے بھی شکل وصورت کے لحاظ سے خوب صورت ہوتے ہیں۔ان کے اندر بہت سی دوسروں خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ ہے کہ عام عربوں کے مقابلے میں ان کا لب ولہجہ زیادہ ملیّن، شیریں اور کانوں میں رس گھولنے والا ہوتا ہے۔شیخ علی طنطاوی اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادہ انعام کے مستحق سمجھے گئے اور انھیں اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔مجھے دو مرتبہ شیخ کی

Marfat.com

زیارت کا موقع ملا، دونوں مرتبہ حرم مکی بیت اللہ میں۔ ایک بار غالباً ۱۹۸۱ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۴ء میں۔ وہ حرم شریف میں درس دے رہے تھے۔ دور سے ان کا چہرہ دیکھ کر میرا دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ ان کے خطاب میں جو چاشنی تھی، اس کا احساس آج تک میرے دل میں موجزن ہے۔ روشن نورانی چہرہ اور شہد سے میٹھی زبان، ہر شخص محویت کے عالم میں گوش بر آواز تھا۔ ان دو مواقع میں سے ایک موقع پر شیخ نے بیان کے آخر میں دعا فرمائی۔ دعا کے دوران میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہر شخص پر رقت طاری تھی۔ وہ کہہ رہے تھے: ''اے رحمان ورحیم! تیرے بندے تیرے در پہ حاضر ہیں، نادم وشرم سار، تجھ سے اپنی خطاؤں کی معافی چاہتے ہیں، تو سب کی مغفرت فرما دے۔ اے داتا و منّان! تیری مخلوق میں بھی تیرے کچھ بندے تیری توفیق سے سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے، تُو تو پھر تُو ہے۔ تیری رحمت بے کنار اور تیری عطا بے حدو حساب ہے۔ تیرے دسترخوان پہ تیری رحمت کے بھوکے خطا کار آ بیٹھے ہیں، تو ان سب کو سیراب فرما دے......''۔ شیخ کی دعا کے دوران کئی شامی نوجوانوں کی ہچکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ منظر آج تک یاد ہے۔

اولادِ صالح

شیخ علی طنطاوی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قابل، ہونہار، نیک طینت بیٹیاں دیں مگر اولادِ نرینہ سے محروم رکھا۔ ان کی سبھی بیٹیاں تعلیم یافتہ اور اسلامی اخلاق واقدار کی علم بردار ہیں مگر ایک بیٹی دنیا میں بہت معروف ہوئی جس نے دعوت وتبلیغ کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ یہ تھی بنانِ طنطاوی جو مشہور شامی اخوانی رہنما جناب شیخ عصام العطار کی بیوی تھیں۔ میاں بیوی اپنے بچوں سمیت شام سے جلاوطن ہو کر کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم تھے۔ جرمنی میں جہاں عصام العطار مختلف پروگراموں کے ذریعے اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرتے تھے وہیں ان کی اہلیہ بنان العطار بھی ان کے شانہ بشانہ خواتین کے حلقے میں مصروفِ عمل رہتی تھیں۔ عربی کے علاوہ جرمن زبان میں بھی وہ اپنے پروگرام لوگوں تک پہنچاتے تھے اور یہ پورا گھرانہ گویا کہ جرمنی میں اسلام کا ایک لائٹ ہاؤس تھا۔ بنان اور عصام دونوں میاں بیوی جلاوطنی میں بھی شام کی اسلامی

Marfat.com

تحریک کے نمایندے اور شام میں مسلط بدترین آمریت کے نقاد تھے۔ شام کی بعثی ونصیری حکومت نے عصام العطار کو قتل کرنے کے لیے کئی مرتبہ ان پر حملے کروائے۔ اسی طرح کا ایک حملہ ۱۷ر مارچ ۱۹۸۱ء کو شام کے حکومتی ایجنٹوں کے ذریعے سے کروایا گیا۔ اس روز عصام العطار گھر میں موجود نہ تھے۔ محترمہ بنان گھر پر تھیں۔ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا اور انھیں نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔

لختِ جگر کی یادیں

شیخ طنطاوی کو اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی وفات کا ذکر وہ اپنی تحریروں میں اکثر کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی یادداشتوں کی قسط نمبر ۱۹۹ جو ایک عید کے دن لکھی گئی، اسی بیٹی کے لیے وقف ہے۔ اس میں جس طرح وہ اپنی بیٹی کی مظلومانہ شہادت کا تذکرہ کرتے ہیں اور کسی اجنبی قبرستان میں اس کی قبر، جس پر عید کے دن حاضری دینا بھی ان کے لیے ممکن نہیں، اس کا نقشہ کھینچتے ہیں، اس کو پڑھتے ہوئے قاری غم میں ڈوب جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو رواں ہو جاتے ہیں: ''اے میری لختِ جگر، نورِ نظر، تو میرے گھر میں ایک روشن ستارا تھی جو اللہ نے افق سے زمین پر اتار دیا تھا۔ تو ایک پھول تھی جس کی خوشبو سے میرا گھر اور میرا دل معطر ہوا۔ تو اسلام کی داعیہ تھی جس سے میرا سینہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ ظالم قاتلوں نے تجھے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو کسی اجنبی جگہ پر مدفون ہے۔ تیری قبر تو اللہ کی جنت کا باغ بن گئی ہوگی مگر میرے ویران دل میں خیال آتا ہے کہ میں تیری آخری زیارت بھی نہ کر سکا۔ تیری قبر پر مٹھی بھر مٹی بھی نہ ڈال سکا۔ آج عید کے روز بھی تیری لحد پر نہ آسکا۔ کوئی بات نہیں میرے دل کی ٹھنڈک، میرے جگر کا سکون! قیامت بہت قریب ہے۔ فراق ختم ہونے والا ہے، وصال دائمی ہوگا۔ اس روز تجھ سے پوچھا جائے گا 'بِاَیِّ ذَنۢبٍ قُتِلَتْ٥'۔''

روحانی اولاد

شیخ علی طنطاوی کے صلبی بیٹے اگرچہ نہیں تھے مگر عالم اسلام میں ان کے روحانی فرزندوں کا

Marfat.com

جال پھیلا ہوا ہے۔ان کی وفات پر عربی پریس میں اس قدر مضامین آرہے ہیں اور ایسی عقیدت کا مظہر ہیں کہ خوش گوار حیرت ہوتی ہے۔ان کی بیٹیوں کو اللہ تعالیٰ نے اولاد نرینہ سے نوازا ہے اور ان کے دسیوں نواسے مختلف بیٹیوں کے بطن سے اس وقت دنیا میں موجود ہیں جو عالم اسلام میں اپنی علمی فضیلت اور اپنی عملی جدوجہد میں مصروف بھی ہیں اور معروف بھی۔شیخ علی طنطاویؒ کے عقیدت مند آج بھی ان کو اپنا روحانی باپ گردانتے ہیں اور بلا مبالغہ یہ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہیں۔مرحوم عرب نوجوانوں اور بزرگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔

کنگ فیصل ایوارڈ

شیخ علی طنطاوی کو سعودی عرب میں اگرچہ بڑی شہرت حاصل ہوئی، بااثر لوگ ان سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے تھے اور ان کے ہاں حاضری دے کر ان کی عزت افزائی بھی کرتے رہتے تھے اس کے باوجود شیخ کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ وہ اپنے ملک سے جلاوطن ہیں اور ایک دوسرے برادر اسلامی ملک میں پناہ گزیں ہیں۔شیخ کو ۱۹۹۰ء میں شاہ فیصل عالمی ایوارڈ بھی دیا گیا۔یہ ایوارڈ ان کی دعوت اسلامی میں یادگار خدمات کے صلے کے طور پر دیا گیا تھا۔اس سلسلے کا پہلا انعام عالم اسلام کی عظیم شخصیت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو دیا گیا تھا۔شیخ علی طنطاویؒ سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ملاقات بھی ہوئی تھی، شیخ مولانا کے مداحین اور عقیدت مندوں میں سے تھے۔ان کے نزدیک اس صدی کی عظیم اسلامی شخصیات میں مولانا مودودیؒ کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔حق تعالیٰ ان تمام عظیم شخصیات کے درجات بلند فرمائے اور ان کی جہود کو شرف قبولیت بخشے۔(آمین)

Marfat.com

فیض الرحمان ہمدانی

(۱۹۳۷ء-۱۹۹۹ء)

درویشِ خدامست

۱۷ جون ۱۹۹۹ء کو ایک شفیق بھائی، مخلص تحریکی ساتھی اور ٹوٹ کر محبت کرنے والا دوست داغِ مفارقت دے گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ یہ درویش خدامست عام لوگوں کی نظروں میں کچھ زیادہ اہم نہ ہوگا مگر وہ اللہ کو بہت محبوب ہوگا کیوں کہ اس کا اوڑھنا بچھونا ہی غلبۂ دین تھا۔ یہ تھے جناب فیض الرحمان المعروف ہمدانی صاحب۔ فیض الرحمان ہمدانی دارالعروبہ کے اہم رکن اور جماعتِ اسلامی کے مرکز میں جانی پہچانی شخصیت تھے۔ ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ وابستگانِ جماعت اور مداحینِ سید مودودیؒ ان سے متعارف و واقف تھے۔ ان کا تعلق قصور کے مشہور روحانی خاندان، آلِ ہمدان سے تھا۔ ان کے والد دیوبندی عالمِ دین جناب مبارک علی ہمدانی تھے۔ وہ علمِ دین کی ترویج کے ساتھ ساتھ پیرِ طریقت بھی تھے جو توحید اور عقیدے کی درستی پر بڑا زور دیتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے جناب سید طیب ہمدانی نے قصور میں ایک مرکز علوم اسلامیہ بھی قائم کیا تھا۔ جناب مبارک علی ہمدانی کے سات بیٹے تھے جن میں فیض الرحمان صاحب کا پانچواں نمبر تھا۔ یہ خاندان اصلاً ضلع فیروز پور سے تعلق رکھتا تھا مگر قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے قصور میں مقیم ہوگیا تھا۔ فیض الرحمان صاحب نے ابتدائی تعلیم قصور سے حاصل کی۔ اس کے بعد کامونکی میں حافظ عبدالشکور صاحب کے مدرسے میں کچھ وقت گزارا، پھر انھی کے مشورے سے جامعہ عربیہ گوجرانوالہ میں درسِ نظامی مکمل کیا۔ یہاں انھیں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد چراغ رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی و رہنمائی حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں وہ محض کتابی علوم میں مہارت کی بجائے

Marfat.com

دینِ حق کے سچے علم بردار اور سپاہی بن گئے۔ یہاں تعلیم کے دوران ہی ان کا مولانا خلیل حامدی صاحب سے تعارف ہوا جو مولانا محمد چراغ صاحب کے شاگردوں میں سے درخشندہ ستارہ تھے۔

مرشد کے حضور!

جامعہ عربیہ سے فراغت کے بعد فیض الرحمان صاحب ریلوے سٹیشن کے قریب ایک مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرنے لگے۔ یہاں خلیل حامدی صاحب بھی ان سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے جو اس وقت مرکز جماعت میں قائم شعبہ دارالعروبہ میں ہمہ وقتی کارکن کے طور پر کام کر رہے تھے۔ فیض الرحمان صاحب نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کا نہ صرف نام سن رکھا تھا بلکہ دل سے جماعت کے قدردان اور مولانا کے عقیدت مند تھے۔ اس کے باوجود جماعت کا کوئی بنیادی لٹریچر انھوں نے اس وقت تک نہیں پڑھا تھا۔ خلیل حامدی صاحب نے انھیں مولانا کی کتاب دینیات دی۔ اس کتاب کا پڑھنا تھا کہ فیض صاحب کے اپنے بقول ''چودہ طبق روشن ہوگئے''۔ خلیل صاحب سے کہا کہ مولانا کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ خلیل صاحب اپنے ساتھ انھیں اچھرہ لائے۔ جب طالب صادق نے مولانا کو ایک نظر دیکھا تو ایسے گرویدہ ہوئے کہ پھر اسی گھاٹ کا زندگی بھر پانی پیا اور اسی کو اپنا گھر اور مسکن بنالیا۔

تحریکی رشتہ

۱۹۶۳ء میں خلیل حامدی صاحب نے فیض الرحمان صاحب کو اپنے ساتھ دارالعروبہ میں ہمہ وقتی کارکن کے طور پر متعین کرالیا۔ اس وقت تک ہمدانی صاحب مجرد تھے۔ خلیل صاحب ہی نے ان کا رشتہ طے کرایا۔ ہمدانی صاحب کے لیے یہ رشتہ بھی ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔ ان کے سسر حکیم محمد علی فیروز پوری جماعت اسلامی کے تاسیسی ارکان میں سے تھے۔ خلیل صاحب کا تعلق بھی چونکہ حامد ضلع فیروز پور سے تھا، اس لیے وہ حکیم محمد علی صاحب سے پہلے سے متعارف تھے۔ کچھ عرصہ حکیم صاحب نے انھیں اپنے پاس گھر میں بھی رکھا تھا اور ان کی تعلیم وتربیت کے لیے ان کی مدد و رہنمائی بھی کی تھی۔ حکیم صاحب شالیمار کے علاقے میں مقیم تھے اور جماعت کا ایک بہت بڑا

Marfat.com

اثاثہ شمار ہوتے تھے۔ان کی بیٹی آپا خالدہ سے فیض صاحب کا رشتہ طے ہوا۔وہ ان کے نکاح میں آئیں تو تنگی وعسر اور فقر وفاقہ کے ادوار میں بھی میاں بیوی اس قدر خوش وخرم رہے کہ ان کو جاننے والے ان پر رشک کیا کرتے تھے۔مرحومہ بھی جماعت کی انتھک کارکن تھیں۔

دار آخرت کا طلبگار

فیض الرحمان صاحب کو اللہ نے چار بیٹے اور دو بیٹیاں عطا فرمائیں جو الحمدللہ سب خوش وخرم اپنے اپنے گھروں میں آباد اور صاحبِ اولاد ہیں۔اس وقت سبھی منصورہ سے مختلف مقامات پر منتقل ہو چکے ہیں،صرف مرحوم کے بیٹے خلیل الرحمان ہمدانی مرکز کے شعبہ امور خارجہ میں کام کر رہے ہیں۔فیض صاحب خود دار انسان تھے۔جس زمانے میں منصورہ مرکز کی زمین خریدی گئی تھی اس زمانے میں اپنے جاننے والے کسی بھی صاحبِ خیر سے اشارتاً بھی بات کرتے تو پلاٹ خریدنا اور گھر بنانا چنداں مشکل نہ تھا مگر فیض صاحب نے ہمیشہ یہی سوچا کہ جب اپنے پاس وسائل ہوں گے تو پلاٹ اور مکان کی فکر بھی کرلیں گے۔فیض صاحب تو اس دنیا میں حقیقی معنوں میں مسافر بن کر رہے۔"کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" حدیث اکثر پڑھا بھی کرتے تھے اور خود بھی بلاشبہ اس کا مصداق تھے۔۱۹۶۲ء میں وہ رکن جماعت بنے اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

خاندان ہمدان

فیض صاحب نے اپنے پورے خاندان کو جماعت کی دعوت سے روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی۔انھی کی کاوشوں سے ان کے خاندان میں جماعت کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔اگرچہ اپنے دیوبندی پس منظر اور مسند نشینی کی وجہ سے باقی ارکانِ خاندان کشتیاں جلا کر تو اس قافلے کا حصہ نہ بنے مگر موقع بموقع جماعت کی حمایت کرتے رہے۔میں جس زمانے میں جماعت میں امارتِ صوبہ پنجاب کی ذمہ داریاں ادا کر رہا تھا،قصور شہر میں کئی بار دعوتی اور سیاسی جلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔مولانا طیب ہمدانی اکثر جلسوں میں سٹیج پر تشریف لاتے اور جماعت کے لیے فیض الرحمان صاحب کے اخلاص اور وارفتگی کو خراجِ تحسین پیش کرتے۔فیض صاحب کی زندگی

Marfat.com

میں ان سے بڑا قریبی تعلق رہا مگر پہلی بار ان سے ۱۹۶۷ء میں اچانک ملاقات اور تعارف ہوا۔

پہلی ملاقات

ہوا یوں کہ ۱۹۶۷ء کا ایک دن تھا جب میں نیو ہاسٹل گورنمنٹ کالج لاہور سے ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ آیا۔ اس زمانے میں ہم لوگ اسلامی جمعیت طلبہ کے زیرِ اہتمام خواتین یونیورسٹی کے قیام کی تحریک چلا رہے تھے۔ ملک میں فوجی آمر ایوب خان کی حکومت قائم تھی اور مغربی پاکستان کا گورنر سخت گیر، منتقم مزاج اور متکبر وڈیرا ملک امیر محمد خان آف کالا باغ تھا۔ وہ حکومت مخالف کسی آواز کو سننے کا روادار تک نہیں تھا۔ میں اچھرہ پہنچا تو ابھی عصر کا وقت نہیں ہوا تھا۔ ۵۔اے ذیلدار پارک میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو تنومند اور دراز قد تھے، چہرے پر مسکراہٹ اور خالص پنجابی لہجہ، باہمی تعارف نہیں تھا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے خود اپنا تعارف کرایا، فرمانے لگے: ''اچھا، آج ہی نوائے وقت میں مدیر کے نام خطوط کے کالم میں آپ کا مراسلہ پڑھا تھا۔'' میں نے کہا: ''آپ کا اسمِ گرامی؟'' فرمانے لگے: ''میرا نام فیض الرحمان ہمدانی ہے اور میں دارالعروبہ میں کام کرتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''استاذ خلیل حامدی صاحب کے ساتھ؟'' کہا: ''جی بالکل'' میں نے کہا: ''مراسلے ہی کا موضوع، یعنی خواتین یونیورسٹی کا قیام ہی، آج میری آمد کا مقصد ہے۔ میں مولانا مودودیؒ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔'' کہنے لگے: ''مولانا تو ابھی آرام کر رہے ہیں، عصر کے بعد ان سے ملاقات ہوگی، آیئے آپ کو ٹھنڈا پانی اور چائے پلاتے ہیں۔'' پھر مجھے اپنے ساتھ ۴۔اے ذیلدار پارک لے گئے جہاں دارالعروبہ کا دفتر تھا اور ترجمان القرآن کا بھی۔ کچھ کمرے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل اسلامی جمعیت طلبہ اور جمعیت طلبہ عربیہ کے مرکزی دفاتر ہیں۔

مومن کی صفات

فیض الرحمان ہمدانی صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ان کے چہرے پر داڑھی کے چند بال تھے جن میں سے بیشتر تو ٹھوڑی کے اوپر ہی تھے اور چند کنپٹیوں سے ذرا نیچے، جبکہ ان کے گال

Marfat.com

بالکل صاف تھے، جہاں کوئی بال اگا ہی نہیں تھا۔خلیل حامدی صاحبؒ سے پہلے سے ملاقات تھی کیونکہ وہ اسلامی جمعیت طلبہ کی تربیت گاہوں میں وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہتے تھے اور ان کی کئی تحریریں بھی پڑھنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔پہلی ملاقات کے بعد فیض الرحمان صاحب سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ان کی طبیعت میں بڑی سادگی، اخلاص اور اپنائیت تھی۔حدیث میں مومن کی جو صفت بیان کی گئی ہے کہ ''المومن الیفٌ ، مالوفٌ'' اور ''المومن غِرٌّ کریمٌ'' ہوتا ہے، [یعنی مومن خود بھی دوسروں سے محبت کرتا ہے اور دوسروں کے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔اور مومن سادہ دل اور کرم کرنے والا ہوتا ہے۔] موصوف اس کے عین مطابق تھے۔

جب مجھے بطور ناظم لاہور جمعیت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں تو یہ دور بڑا پر آشوب اور ہنگامہ خیز تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جلسہ،جلوس، احتجاجی مظاہرہ اور پھر اس کے نتیجے میں لاٹھی چارج، آنسو گیس اور گرفتاریاں۔اس عرصے میں جب بھی ہمدانی صاحب سے ملاقاتیں ہوتیں۔وہ حوصلہ بڑھاتے اور جمعیت کی سرگرمیوں کے حوالے سے اخبارات میں چھپنے والی تصاویر اور خبروں کا حوالہ دے کر دلجوئی کرتے۔میری جب بھی گرفتاری ہوئی، بورسٹل جیل فیروز پور روڈ میں ہی مجھے محبوس کیا گیا۔ اس کا نام اب کیمپ جیل ہے اور یہ مرکزِ جماعت، اچھرہ سے بہت قریب ہے۔فیض صاحب دیگر دوستوں کے ساتھ کبھی کبھار ملاقات کے لیے تشریف لاتے تو حوصلہ افزائی اور تشجیع فرمایا کرتے۔

دوہرا تعلق

جب مجھے بیرونِ ملک ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ ہوا تو مولانا مودودیؒ نے حامدی صاحب کو ویزے اور سفر سے متعلق تمام امور نپٹانے کی ذمہ داری سونپی۔فیض الرحمان صاحب نے حامدی صاحب کے معاون کی حیثیت سے اس کام میں میرے ساتھ بڑا تعاون کیا۔سعودی عرب کا ویزہ لگوانے، ہوائی جہاز کی بکنگ، ہیلتھ سرٹیفکیٹ اور دیگر امور میں انھوں نے رہنمائی فرمائی۔ کینیا میں ہمارے دوست شیخ محمد امین زاہد جو اسلامک فاؤنڈیشن کے مرکز، اسلامی انسٹی ٹیوٹ مچاکوس میں بطور منتظم وصدر مدرس فرائض ادا کر رہے تھے،فیض الرحمان صاحب کے دورِ طالب علمی کے

Marfat.com

دوست تھے۔اس حوالے سے فیض الرحمان صاحب سے ان کی وجہ سے اور ان سے فیض صاحب کی بدولت مزید قرب پیدا ہوگیا۔اس دور میں ہم مساجد و مدارس، اسلامی مراکز و دارالایتام اور طبی امداد کے مراکز مختلف علاقوں میں قائم کر رہے تھے۔اس ضمن میں تعمیرات کے بہت بڑے بڑے منصوبے زیرِ تکمیل تھے۔ہمیں پاکستان سے تعمیرات کے کام میں ماہر مستری اور معمار درکار تھے۔ فیض صاحب نے اس کام میں بھی ہمارے ساتھ بڑا تعاون کیا۔

عربی زبان میں مہارت

کینیا میں قیام کے دوران ہماری خواہش تھی کہ فیض صاحب کبھی ہمارے پاس وہاں تشریف لاتے۔جس زمانے میں وہ سعودی عرب میں کچھ عرصے کے لیے عربی زبان کی تعلیم کے لیے مقیم تھے، انھوں نے کینیا آنے کا وعدہ بھی کیا مگر ان کا یہ سفر ممکن نہ ہوسکا۔خلیل حامدی صاحب کے دستِ راست کی حیثیت سے فیض الرحمان صاحب بیرونِ ملک سے آنے والے تمام مہمانوں، بالخصوص عرب شیوخ وعلما اور مخیّر حضرات کی بہت خدمت اور دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ہوٹلوں میں ان کے قیام کا انتظام، پھر مرکزِ جماعت میں ان کو لانا اور پاکستان میں قیام کے دوران ان کے تمام پروگراموں کو ترتیب دینا ان کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔قاری منہاج الدین صاحب کے ساتھ مل کر وہ یہ کام بہت حسن وخوبی سے انجام دیا کرتے تھے۔ان کی خدمات کا تمام بیرونی مہمان ہمیشہ اعتراف کیا کرتے تھے۔عرب مہمانوں کے ساتھ بات چیت کے نتیجے میں ان کی عربی زبان خاصی بہتر ہوگئی تھی۔اس کے باوجود انھیں یہ احساس تھا کہ انھیں عربی زبان میں مزید مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ ۱۹۷۰ء میں ہمارے یونیورسٹی کے استادِ گرامی قدر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب نے فیض الرحمان صاحب کو مصری کلچرل سنٹر میں باقاعدگی سے جانے اور مختلف کورسز میں شرکت کی ترغیب دی۔خلیل حامدی صاحب نے بھی اس تجویز کی تحسین فرمائی اور یوں فیض الرحمان صاحب نے ان کورسز کے ذریعے مصری لب ولہجے میں بول چال کی مہارت حاصل کی۔ اسی زمانے میں انھیں ریاض یونیورسٹی سعودی عرب بھیجا گیا جہاں سے انھوں نے ایجوکیشن میں

Marfat.com

ایک ڈپلومہ حاصل کیا اور پھر واپس دار العروبہ میں آکر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

تحریکی کتب کے تراجم

دار العروبہ میں فارسی، ترکی اور پشتو زبانوں میں مولانا مودودیؒ کی کتب کے تراجم کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس کی ذمہ داری اور نگرانی فیض صاحب کے سپرد ہوئی۔ عربی زبان میں ترجمے کا کام خلیل حامدی صاحب کی براہِ راست نگرانی میں، سعودی عرب میں وہاں کی مشہور علمی و ادبی شخصیت جناب صلاح الدین صاحب کے ذریعے ہو رہا تھا۔ وہ جدہ اور سعودی عرب کے دیگر مقامات سے نکلنے والے مشہور عربی روزنامے ''المسلمون'' میں باقاعدگی سے مضامین لکھا کرتے تھے۔ آج کل ''المدینه'' میں لکھتے ہیں۔ مولانا کی اٹھائیس کتب انھوں نے عربی زبان میں شائع کی ہیں۔ ان کا اشاعتی ادارہ ''دار السعودیه للنشر و التوزیع'' سعودی عرب کے معروف اشاعتی اداروں میں سے ہے۔ فیض الرحمان صاحب نے فارسی اور پشتو میں ترجمے کرانے کا بیڑا اٹھایا تو بڑی محنت کے ساتھ اس میں خاصی پیش رفت کی۔ مولانا مودودیؒ کی چھ درجن سے زائد تصانیف فارسی میں اور اس سے کچھ کم پشتو میں ترجمہ ہو کر چھپیں۔ اس کے علاوہ روسی اور ترکی زبانوں میں بھی کچھ کتب کے تراجم کرائے گئے اور جہادِ افغانستان کے دوران یہ کتب روس اور ترکستان کے کئی علاقوں میں پہنچیں اور انھوں نے ان علاقوں میں فکری انقلاب برپا کر دیا۔ الحمدللہ اب ان تمام علاقوں میں جماعت کی دعوت اور مولانا مودودیؒ کی فکر جڑیں پکڑ چکی ہے جہاں آہنی پردوں کی وجہ سے کافی عرصے تک اس فکر کا پہنچنا ناممکن تھا۔ فارسی زبان میں جن کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں ان کے سلسلے میں فیض الرحمان کئی مرتبہ ایران اور افغانستان بھی گئے۔

اہل نظر قلیل ہیں

فیض صاحب نے چونکہ درس نظامی کے ساتھ مولوی فاضل اور عربی کورس کے کئی ڈپلومے بھی حاصل کیے تھے اس لیے انھیں عربی زبان میں خاصی مہارت حاصل ہوگئی۔ دار العروبہ کی طرف سے مرکز جماعت میں عربی زبان میں ایک مجلّہ ''المنصورہ'' جاری ہوا جو عربی زبان میں چھپتا تھا۔

Marfat.com

اس کے مدیر اعلیٰ خلیل حامدی صاحب تھے۔ مولانا حامدی صاحب کے ساتھ اس مجلّے کی ادارت اور طباعت میں بھی فیض صاحب نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ فیض صاحب کو جاننے والے ان کی خوبیوں کے معترف ہیں مگر بدقسمتی سے جماعت کے عام کارکنان ان سے اس طرح واقف نہیں ہیں کہ ان کی صحیح قدر و منزلت کو پہچان سکیں۔ لوگ چکا چوند کے عادی ہو گئے ہیں۔ اہلِ نظر گودڑی کے لعل کو بھی جانتے ہیں مگر وہ قلیل ہوتے ہیں۔ فارسی زبان میں مولانا مودودی کی کتابوں کے تراجم کئی فاضل علما و ادبا نے کیے مگر بیشتر کتب کے ترجمے خانوادۂ مودودیہ چشتیہ کے سجادہ نشین سید احمد مودود چشتی مودودی نے کیے ہیں۔ چشتی صاحب فیض الرحمان صاحب سے بہت قریبی اور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ ان کی وفات پر انھوں نے جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد صاحب اور مرحوم کے خاندان کے علاوہ جماعت کے تمام وابستگان سے دلی اظہارِ تعزیت کیا اور کہا کہ میں ایک جگری یار کی محبتوں سے محروم ہو گیا ہوں۔

ایک دوست کا خراجِ تحسین

جناب محمد شریف قریشی قصور کے معروف سکول ٹیچرز میں سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ جماعت کے پرانے رکن اور قصور میں مقامی جماعت کے امیر بھی رہے۔ بعد میں سید مودودیؒ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ وحدت روڈ لاہور میں کئی سالوں تک بطور ڈائریکٹر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ فیض صاحب کو قریب سے جانتے تھے۔ انھوں نے فیض صاحب کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا، وہ قابل مطالعہ ہیں۔ ''وہ سچے غم خوار، بے لوث خدمت گزار، ایثار پیشہ اور پُرخلوص خصوصیات کی حامل نہایت عمدہ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سراپا عجز و انکسار تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ حالات کیسے بھی ہوں انھوں نے صبر و استقامت کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ انھیں سید مودودیؒ سے بے حد عقیدت اور تحریک اسلامی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ انھوں نے تادم مرگ اپنے اس جذبہ عشق کو نبھایا۔ اس راہ میں دنیاوی مال و متاع کو بھی انھوں نے ٹھکرا دیا۔ ان کے والد ایک باا ثر سیاسی اور دینی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا حلقہ عقیدت بھی وسیع

Marfat.com

تھا۔ اگر ان کی گدی سنبھالنا مطلوب ہوتا تو سیادت و قیادت ان کے قدم چومتی اور دنیاوی اعتبار سے جاہ و حشمت کی کمی نہ ہوتی۔ لیکن یہ مردقلندر، حق کا سپاہی ان سب چیزوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ دین حق کی خدمت میں انھیں لطف محسوس ہوتا تھا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔"

مصائب و امراض

فیض صاحب کی صحت شروع میں بہت اچھی تھی اور وہ بہت انتھک اور فعال کارکن کے طور پر معروف تھے۔ آخری سالوں میں صحت کچھ کمزور ہوگئی اور مختلف عوارض کی شکایت کرنے لگے۔ ان کی اہلیہ بھی فالج کی وجہ سے بستر پر گر گئیں اور بڑے بھائی بھی بیمار ہو گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے ان دونوں عزیز ترین رشتہ داروں کی وفات ہوئی۔ یہ فیض صاحب کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ اسی دوران ۱۹۹۷ء میں خود فیض الرحمان صاحب پر بھی فالج کا حملہ ہوا۔ مرحوم کے یہ ایام بڑی مشکل اور پریشانی میں گزرے۔ جب اہلیہ اور بھائی کی وفات ہوگئی تو فیض صاحب غم سے نڈھال تھے مگر ہمیشہ اللہ سے یہ دعا کرتے کہ پروردگار! میری صحت بحال کردے میں اپنے زیر تکمیل تحریکی کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ پھر مجھے اپنے پاس بلا لینا۔ فالج کی وجہ سے ان کی بینائی بھی تقریباً ختم ہوگئی تھی اس وجہ سے وہ ذہنی طور پر خاصے پریشان اور جسمانی طور پر مضمحل رہنے لگے۔ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں: "نظر کی کمزوری کی وجہ سے پورا ایک مہینہ ایسا گزرا کہ میں کوئی کام نہ کر سکا۔"

آپا خالدہ

فیض صاحب کی اہلیہ آپا خالدہ مرحومہ کا تذکرہ نہ کرنا بڑی کوتاہی ہوگی۔ ہمارے منصورہ آنے کے بعد ہمارے بالکل قریبی ہمسایوں نے تو ہمیں جو محبت اور پیار دیا وہ یادگار ہے ہی مگر دفاتر کے مغربی جانب چھوٹے کوارٹرز میں مقیم آپا خالدہ نے سب سے زیادہ اپنایت و انسیت کا مظاہرہ کیا۔ وہ کم و بیش ہر روز ورنہ ایک دو روز بعد گھر میں تشریف لاتیں اور اہلیہ اور بچوں کا حال احوال، خیر خیریت جاننے کے ساتھ بلاناغہ پوچھتیں کہ کوئی مسئلہ ہو تو بلا جھجک بتا دیا کریں۔ میری بیٹی سمیہ اس

Marfat.com

وقت چھٹی کلاس میں تھی وہ آپا خالدہ کو اپنے گھر اور خاندان ہی کا ایک فرد سمجھتی تھی۔ آپا خالدہ کی دونوں بیٹیاں بھی ہمارے گھر آیا کرتیں اور بالکل یوں لگتیں جیسے ہماری ہی بچیاں ہیں۔ میری اہلیہ اگر کبھی بیمار پڑ جاتی تو آپا خالدہ گھر کی مختلف ذمہ داریاں سنبھال کر کبھی احساس نہ ہونے دیتی کہ ہم اپنی فیملی سے دور ہیں۔ وہ جماعت کی ایک مثالی کارکن تھیں۔ جماعت کے ہر پروگرام کے لیے تمام گھروں میں دعوت نامے پہنچانا اپنی ذمہ داری سمجھتی تھیں۔ ہمارے گھر کے تمام افراد مرحومہ کو اب تک یاد کرتے ہیں۔ وہ عظیم باپ کی عظیم بیٹی تھیں۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔

صحت، پھر مرض الموت

اللہ نے اپنے بندے کی دعائیں سنیں اور ان کی نظر آہستہ آہستہ بحال ہونے لگی۔ اب اپنے نامکمل کاموں کی تکمیل میں پوری دلجمعی سے لگ گئے۔ کئی کام مکمل ہو گئے مگر کچھ ابھی باقی تھے۔ تاہم اللہ کو یہی منظور تھا کہ وہ اپنے بندے کو اپنے پاس بلا لے۔ چنانچہ ۲۳ اپریل ۱۹۹۹ء کو فالج کا دوبارہ حملہ ہوا جو پہلے سے شدید تر تھا۔ اس مرض میں کافی عرصہ تک وہ بے ہوش رہے اور بالآخر ۱۷ جون ۱۹۹۹ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس بیماری کے دوران یقیناً اللہ نے اپنے اس بندے کے گناہوں کو معاف فرمایا ہوگا اور ان کے درجات کی بلندی کا سامان کیا ہوگا۔ حدیث کے مطابق مومن کی بیماری گناہوں کے کفارے اور درجات کی بلندی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مرحوم کی اولاد ماشاء اللہ پھل پھول رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے عظیم مورث کا سچا جانشین بنائے۔ ان سطور کی تحریر کے وقت ان کے چار بیٹے، دو بیٹیاں اور دو درجن کے لگ بھگ پوتے، پوتیاں اور نواسے، نواسیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو سلامت رکھے اور گلستانِ فیض ہمدانی پھلا پھولا رہے۔

Marfat.com

شعیب احمد نیازی شہیدؒ (عمر مختار)

(۱۹۷۴ء-۱۹۹۹ء)

شہدا کی بستی

جماعت اسلامی کے مرکز منصورہ کو شہدا کی بستی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انعام اللہ شہید، مظفر نعیم شہید، شعیب نیازی شہید، عبداللہ شہید اور قاسم شہید، سبھی اس بستی کے گل ہائے خوش رنگ وعطر بیز تھے۔ آج شعیب نیازی شہید کے احوال پر قلم اٹھایا تو سوچا کہ اس کی شہادت کے وقت جو کچھ قلم برداشتہ تحریر کیا تھا اور پھر اس پر ''دریچۂ دل'' میں جو تبصرے آئے تھے، ان کو بھی دیکھ لیا جائے۔ ساتھ ہی دل میں خیال آیا کہ شہید کے والد سے تقاضا کروں کہ وہ کچھ مزید واقعات سے نوازیں تاکہ یہ تذکرہ جب کتاب عزیمت کے راہی کا حصہ بنے تو ایک جامع مضمون میں یہ قیمتی یادیں محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ یہ بکھری بکھری تحریریں یک جا کی جا رہی ہیں۔ الحمدللہ ان سب میں باہمی ربط بھی ہے اور واقعات کا تنوع و تسلسل بھی۔

خاندان کا درخشاں ستارا

ہفت روزہ ایشیا کی ۲۸ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں ہم نے ''دریچۂ دل'' میں لکھا تھا ''رفیق محترم محمد انور خان نیازی عزیمت کا پہاڑ ہیں۔ میں نے ہمیشہ انھیں عظیم ساتھی اور صاحب استقامت رفیق گردانا مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ بلند اور ہماری رائے سے کہیں عظیم تر نکلے۔ نیازی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے پانچ بیٹے عطا فرمائے۔ سبھی اپنی اپنی جگہ پر قیمتی نوجوان ہیں، مگر ان میں منجھلا بیٹا شعیب نیازی سب سے نمایاں اور ممتاز تھا، شکل و صورت میں بھی اور سیرت و کردار میں بھی۔ اپنے بیٹے شعیب نیازی کو جہاد میں بھیجنے کے بعد

Marfat.com

دونوں میاں بیوی قرونِ اولیٰ کے صاحب عزیمت مسلمانوں کی تصویر بن گئے۔ تاریخ نے ایسے عالی ہمت جوڑے کئی بار دیکھے ہیں۔ دورِ جدید میں بھی آج اسلاف کی یادگار ایسے لوگ پوری امت کے محسن ہیں۔ اس سال چند دنوں کے لیے ناروے کا سفر درپیش رہا۔ ماہ ستمبر کی ایک رات میں نے ناروے میں فون پر شعیب نیازی کی شہادت کی خبر سنی۔

تعزیت کے لیے حاضری

شعیب نیازی کی پیدائش سے لے کر جہاد پر روانگی تک کے تمام لمحات پلک جھپکنے میں لوحِ حافظہ پر فلم کی صورت میں گھوم گئے۔ نیازی صاحب کو فون کیا تو احساس ہوا کہ میں کوہ استقامت سے ہم کلام ہوں۔ ناروے سے گھر پہنچا تو سب سے پہلے نیازی صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ عشاء کے بعد کا وقت تھا۔ پورے گھر پر سکینت کی چادر تنی ہوئی تھی، اور طمانیت کی اس کیفیت نے کس قدر متاثر کیا! الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ شہید کے والدین اور سب بہن بھائی اسلاف کی تاریخ دہرا رہے تھے۔ نہ آہ و بکا نہ شکوہ و شکایت، شہادت کی خبر بھی اس وقت ملی جب شہید کی والدہ اور بہن بھائی اسلام آباد کی خواتین ریلی میں شرکت کے لیے (۲۲ر ستمبر) شاہراہ دستور پر نعرہ حق بلند کر رہے تھے۔" یہ تحریر چھپنے کے بعد قدرے تاخیر سے ہمیں دو خطوط ملے جو ایشیا کے ۲ر دسمبر ۱۹۹۹ء کے شمارے میں چھپے۔

خونِ جگر سے لکھی تحریر

"ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہماری محفل میں شعیب نیازی شہید کے والد گرامی جناب محمد انور خاں نیازی اور شہید کے ایک مجاہد ساتھی شریک ہو رہے ہیں۔ محترم محمد انور خاں نیازی صاحب ایشیا کے قاری اور قدردان ہیں۔ وقتاً فوقتاً اپنی قیمتی آراء سے نوازتے رہتے ہیں۔ اس مرتبہ ان کا مکتوب موصول ہوا تو میں نے اسے دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ یہ کسی عام قاری کا خط نہیں جو قلم سے لکھ دیتا ہے بلکہ یہ اس شخص کی تحریر ہے جس نے اپنا لختِ جگر راہ حق میں قربان کیا اور جو زبانِ حال سے بھی اور زبانِ قال سے بھی کہتا رہتا ہے

Marfat.com

جاں دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ان کی یہ تحریر خون جگر سے لکھی ہوئی ہے۔ اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

داغ ہائے سینہ

''۲۸ / اکتوبر کے ایشیا میں ''دریچہ دل'' نظر سے گزرا۔ ''سانحات غم'' کے عنوان سے آپ نے جن عزیز از جان شہدا کا تذکرہ کیا ہے اسے پڑھ کر داغ ہائے سینہ تازہ ہو گئے۔ کتنے قیمتی اور پیارے ساتھی تھے جو ہم سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان بچھڑنے والے ساتھیوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے سرفراز فرمائے۔ آمین! یہ قصہٗ پارینہ نہیں ہے ان شاء اللہ ہمیشہ ایمان اور روح کی بالیدگی کا سامان بنا رہے گا۔

اس کالم میں ''شعیب نیازی شہید'' کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے میرے اور میرے گھر والوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ درحقیقت آپ کا حسن ظن ہے جو آپ میرے اور میرے اہل خانہ کے بارے میں رکھتے ہیں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے اہل وعیال کو فی الواقع اس کا مصداق بنائے۔ یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے ورنہ میں تو بہت ہی کمزور اور گنہگار انسان ہوں۔ یہ خدا کا فضل خاص ہے جس نے میرے بیٹے شعیب نیازی شہید کو جہاد کی توفیق بخشی اور اسے شہادت کے بلند مرتبے پر فائز کیا۔ اس کے لیے ہم سب گھر والے رب ذوالجلال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس قربانی کو قبول فرمائے اور اسے ہماری نجات کا ذریعہ بنائے اور ان قربانیوں کے صدقے ہمارے کشمیری مسلمان بھائیوں کو ظلم وجبر سے نجات دلائے اور انھیں آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔ اسی عرصے میں شعیب نیازی شہید کے مجاہد ساتھی جو مقبوضہ وادی کشمیر میں ان کے ساتھ رہے کا تفصیلی خط کل ہی موصول ہوا ہے جس میں شہادت کا تفصیلی واقعہ لکھا ہوا ہے آپ کے مطالعہ کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے بھی ''دریچہ دل'' میں شائع کر سکتے ہیں'' (محمد انور خاں نیازی)

Marfat.com

میدان جہاد سے موصولہ مکتوب

شعیب نیازی شہید کے والد گرامی محمد انور خاں نیازی صاحب کی اس پر عزم تحریر کو ہم قارئین ایشیا اور ادارے کے لیے عظیم ہدیہ تصور کرتے ہوئے بصد احترام ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اب ملاحظہ فرمایئے شعیب نیازی شہید کے مجاہد ساتھی کا خط جو جہاد کے میدانوں سے آیا ہے اور اسلاف کی یادیں تازہ کر دیتا ہے۔ ''بعد از سلام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور آپ لوگوں کی دعاؤں سے ہم بالکل خیر و عافیت کے ساتھ ہیں۔ اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ سب لوگ خیر و عافیت کے ساتھ ہوں گے اور ہم ہمیشہ یہی دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہم سب کو اپنے دین پر ثابت قدم اور صحیح سلامت رکھیں۔ (امین ثم آمین)۔

دیگر صورت احوال یوں ہے۔

شہید کا جہادی نام عمر مختار

پہلے تو میں آپ لوگوں سے معافی چاہتا ہوں کیونکہ خط تھوڑا لیٹ لکھا، وجہ یہ ہے کہ موقع نہیں ملا امید ہے معاف کر دیں گے۔ باقی آپ لوگ بخوبی واقف ہے کہ کچھ دن پہلے ہمارا یہ عظیم اور سگے بھائیوں سے پیارا عمر بھائی شہید ہوئے اور وہ بھی اس طرح بہادری کے ساتھ شہید ہوئے کہ دشمن عمر بھر یاد رکھیں گے کہ ایک مومن کیا ہوتا ہے اور صرف یہ نہیں اس سے پہلے بھی شعیب بھائی نے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ وہ بھی دشمن عمر بھر یاد رکھیں گے اصل میں یہ تو اس کی ایمان کی مضبوطی تھی۔ شعیب نیازی ایک نڈر اور پاک باز مجاہد تھا اور مجاہدین اور عوام میں ہر دلعزیز تھا اور ہمیشہ دلعزیز رہے گا۔ خیر وہ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اور آپ لوگ ہم سے زیادہ علم رکھنے والے اور سمجھ دار ہے۔

حسین یادیں

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شہید کا کیا مرتبہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے شہید کے ساتھ کن کن نعمتوں کا وعدہ کیا ہے اس لیے آپ لوگوں کو اس طرح کے باتوں کا لکھنے کی ضرورت نہیں ہیں

Marfat.com

بہرحال وہ آپ لوگوں کا لخت جگر تھا اور اس کے ساتھ خون کا رشتہ تھا اس لیے لازمی بات ہے کہ دکھ تو محسوس ہوتا ہے مگر جتنا مجھے پتہ ہے اور امید ہے کہ آپ سب اس کے شہادت پر خوش ہوں گے کیونکہ آپ سب جانتے ہیں کہ شہادت کا موت کن لوگوں کو ملتا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے خوش نصیب بندوں کو ملتا ہے مگر پھر بھی ماں، باپ اور بہنوں، بھائیوں کو ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا بیٹا یا بھائی جدا ہو گیا ہے۔ میں بھی آپ لوگوں کا بیٹا یا بھائی ہوں اس لیے اگر عمر بھائی میرا بھائی تھا تو اس کے ماں، باپ اور بہنیں، بھائی وہ میرے اپنے ہی ہیں۔ اس لیے اگر ایک شعیب نیازی شہید ہو گیا تو آپ لوگوں کا دوسرا شعیب نیازی کشمیر میں موجود ہے اس لیے میرے طرف سے ماں، باپ اور بہنوں بھائیوں سب کو ہی عرض ہے کہ کوئی غم یا پریشانی نہ رکھیں۔ اور عمر بھائی اور باقی سب شہدا کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے شہادتوں کو اپنے دربار میں قبول و منظور کر دیں آمین۔

تمنائے شہادت

باقی عمر بھائی سے شہید ہونے سے پہلے ایک دن سیٹ پر بات ہوئی تو مجھے کہا کہ ملاقات کریں گے تو میں اس وقت اس سے کافی دور تھا اس لیے اس کو میں نے کہا کچھ دن بعد ملاقات کریں گے۔ پھر وہ مطمئن ہوا، ملاقات کا وہ اس لیے زور دے رہا تھا کیونکہ اس سے کچھ دن پہلے حافظ گلزار بھائی شہید ہوئے تھے اس لیے سب ساتھیوں کو بہت صدمہ تھا۔ عمر بھائی اور اس کے ساتھ جو دوسرا شہید ہوا ان دونوں نے سیٹ پر کافی ٹائم میرے ساتھ بات کی اور دونوں نے بتایا کہ سب مجاہد شہید ہوئے اور ہم گنہگار اب بھی ادھر ہی ہے۔ بس پھر ایک ہی دن ہوا تھا کہ دونوں دوسرے دن شہید ہوئے۔ واقعہ کچھ اس طرح ہوا یہ دونوں سنگ لن ایک گاؤں آتا ہے یہ علاقہ کوٹھار (اسلام آباد) کشمیر میں ہے ادھر ۹۹-۸-۲۱ بروز ہفتہ کریک ڈاؤن ہوا۔ کریک ڈاؤن میں یہ دونوں گھیرے میں آگئے پھر یہ دونوں ایک نالے کے اندر چھپ گئے۔ پھر صبح کے تقریباً چھ بجے فوجی چائے بنانے لگے، اس لیے فوج کے کچھ بندے اکٹھے ہو گئے جب انھوں نے دیکھا کہ فوجی اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے اکٹھے اندھا دھند فائرنگ کیا۔ جدھر موقع ہی پر کافی سارے فوجی

Marfat.com

مردار اور زخمی ہوئے۔ اور پھر بعد میں لڑائی شروع ہوگئی اور دونوں زبردست بہادری کے ساتھ لڑتے رہے اور پھر تقریباً دن کے ایک بجے تک دونوں شہید ہوئے۔

کامیاب جہاد، شاندار تدفین

شہید ہونے سے پہلے انھوں نے تقریباً ۱۵ فوجی مردار کیے جن میں ایک میجر اور دو صوبیدار بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بہت سارے فوجی زخمی ہوئے۔ بعد میں پھر مقامی لوگوں نے لاشیں اٹھائی اور جوش وخروش کے ساتھ ان کا نماز جنازہ پڑھا اور اچھی طرح دفنایا۔ عمر بھائی کو (شانکس) کوٹھار میں دفن کر دیا اور صلاح الدین بھائی ساکنہ دیر (تتری بل) میں دفن کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کے شہادتوں کو قبول ومنظور کر دے اور جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائیں۔ اور ہمیں ان کے مشن کو آگے بڑھانے اور صبر کرنے کا توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین) باقی کوئی خاص بات نہیں کہ لکھوں میرے طرف سے سب کو پھر ایک عرض کہ ہم کو اپنے نیک دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیں اور تحریک اسلامی کے ساتھ جتنا ممکن ہو تو مدد کریں اور میرے طرف سے ماں، باپ اور بہنوں اور بھائیوں کو بہت ہی بہت سلام ودعا قبول کریں۔ باقی خط میں دو تصویریں روانہ خدمت ہے، ایک میرا اور عمر بھائی کا اکٹھا ہے اور دوسرا عمر بھائی کا الگ ہے۔ اور خط کا جواب اس کے ملتے ہی لازماً اور لازماً روانہ فرمائیں۔

نوٹ: میرے گھر کا پتہ یہ ہے اگر ہو سکے چکر لگا دینا اگر ممکن نہ ہو تو خط ضرور روانہ کریں۔ ارشد عرف کاشف گاؤں جنگوں، ڈاکخانہ تازہ گرام، تحصیل چکدرہ، ولدیت امانت یار) ضلع دیر، ملاکنڈ ڈویژن، صوبہ سرحد۔"

قابل مبارک باد

قارئین محترم پشتو نما اردو میں یہ خط کس قدر ایمان افروز اور مسحور کن ہے! کیوں کہ یہ سر سے کفن باندھ کر میدان میں ڈٹ جانے والے غازی کی تحریر ہے! ہم نے اسے جوں کا توں شاملِ اشاعت کر دیا ہے۔ اس اندازِ تحریر کا اپنا لطف ہے۔

Marfat.com

قابل صد مبارک باد ہیں وہ خاندان جن کے آنگن میں ایسے پھول کھلے جو حقیقت میں جنت کے پھول تھے مگر تھوڑی سی دیر کے لیے اس دھرتی کو اپنی خوشبوؤں سے معطر کر گئے اور بہار جاں فزا دکھلا کر مرجھائے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے تر و تازہ ہو گئے۔ وہ زندہ ہیں، خوش و خرم ہیں اور اپنے اقرباء کے لیے جنت کے دروازوں پر بازو پھیلائے منتظر ہیں! شہداء ہمارا سرمایہ ہیں۔ مجاہدین اور غازی ہمارا وقار ہیں اور شہادت ہم سب کی آرزو اور تمنا ہے۔'' (ہفت روزہ ایشیا ۲ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

میری یادیں

شعیب نیازی ہماری آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا۔ میرے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ آغاز میں وہ ایک کھلنڈرا اور شرارتی بچہ تھا۔ اس نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول وحدت روڈ سے پاس کیا اور ایف اے سائنس کالج وحدت روڈ سے کیا۔ بچپن سے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ساتھ وابستہ رہا۔ کرکٹ کا شوقین اور بہترین کھلاڑی تھا۔ سکول و کالج کی ٹیموں میں نمایاں تھا۔ کالج کے زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھیوں کی توجہ سے اس کا رجحان دین کی طرف کافی زیادہ ہو گیا تھا۔ اسی دوران اس نے ماہِ رمضان میں جامع مسجد منصورہ میں اعتکاف کیا۔ مسجد میں اس سے ملاقات ہوتی تو مختلف سوالات بھی پوچھتا تھا۔ اعتکاف کے بعد اس کی زندگی یکسر بدل گئی۔ اس نے البدر کے مجاہدین کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

ابتدائی تعارف

برادرم محمد انور نیازی صاحب نے بتایا کہ شعیب احمد خان نیازی ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو گنگا رام ہسپتال لاہور میں پیدا ہوا۔ حسن اتفاق سے جماعت اسلامی کی بزرگ خاتون رہنما آپا زبیدہ بلوچ صاحبہ کسی عزیزہ کو دیکھنے ہسپتال گئیں تو انھیں پتہ چلا کہ میری اہلیہ بھی اسی ہسپتال میں ہیں۔ چنانچہ وہ انھیں دیکھنے گئیں۔ بچے کی پیدائش پر مبارکباد دی۔ میری اہلیہ نے ان سے درخواست کی کہ بچے کو وہ اپنے ہاتھ سے شہد چٹائیں اور اس کے لیے دعا بھی کریں اللہ تعالیٰ اسے مجاہد اور دین کی خدمت کرنے والا بنائے۔ آپا زبیدہ بلوچ مرحومہ نے اس کو شہد چٹا کر دعا دی۔ قبولیت کی گھڑی

Marfat.com

تھی اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے لیے چن لیا اور جوانی میں شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اس کی زندگی مسلسل نیکی و پاکیزگی میں ڈھلتی چلی گئی۔ اس کے اندر جہاد کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ اس نے ماں سے کہنا شروع کر دیا کہ میں نے کشمیر جانا ہے مجھے اجازت دے دیں۔ ماں اسے کہتی پہلے تعلیم مکمل کر لو پھر جہاد پہ چلے جانا۔ وہ ماں کا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ جاتا اور تکرار کرتا کہ اسے جہاد پر جانے کی اجازت دی جائے۔

غیرتِ مسلم زندہ ہے

اخبارات میں کشمیری ماؤں بہنوں کے ساتھ ہندو فوجیوں کی زیادتیوں اور امت مسلمہ کی عفت مآب بیٹیوں کی عصمت دری کے واقعات عام رونما ہو رہے تھے۔ ذرائع ابلاغ سے یہ اطلاعات پاکستان میں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ غیرت مند نوجوانوں کا خون کھول اٹھتا تھا جب وہ یہ واقعات پڑھتے اور سنتے تھے۔ شعیب نیازی ان دنوں اپنی ماں سے کہتا" ماں وہاں ہماری مائیں بہنیں ظلم کا شکار ہیں اور ہم یہاں آرام سے رہ رہے ہیں۔ مجھے جانے کی اجازت دے دیجیے"۔ بالآخر ماں نے اسے اس شرط پر جانے کی اجازت دے دی کہ ایف اے کا امتحان پاس کر لو تو پھر چلے جانا۔ ایف اے کے پیپر ختم ہوتے ہی اس نے بڑی شدت سے ماں سے تقاضا کیا کہ اب اسے اجازت دے دی جائے۔ ماں نے کہا کہ رزلٹ آنے کے بعد اجازت ملے گی۔ کہنے لگا ماں میں نے امتحان دے دیا ہے، اب رزلٹ آپ ہی سنتی رہنا مجھے اجازت دے دیں۔ پھر ایک دن ماں نے اسے کھلے دل کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔"

مراحلِ جہاد

نیازی صاحب نے بیٹے کی شہادت پر بتایا۔" اپنی ماں سے اجازت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا ابو مجھے امی نے اجازت دے دی ہے اب آپ بھی مجھے اجازت دے دیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اگر تیری ماں نے تجھے اجازت دے دی ہے تو میری طرف سے بھی تجھے اجازت ہے۔ اس کے شب و روز دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جذبہ جہاد اور شوق شہادت سے سرشار

Marfat.com

ہے۔ تعلیم کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے رہا اس لیے اسے مزید روکنا مناسب نہیں۔ اجازت ملنے کے بعد پہلے وہ پشاور گیا جہاں ابتدائی ٹریننگ حاصل کی اس کے بعد مظفر آباد جا کر ٹریننگ مکمل لی۔ ٹریننگ سے فارغ ہونے کے بعد دو دن کے لیے گھر آیا تا کہ آخری بار والدین اور بہن بھائیوں سے ملاقات کر لے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک ایسا نوجوان جو تمام بہن بھائیوں میں زیادہ تن آسان ہے، خوش لباس اور خوش خوراک ہے، وہ کیسے اتنا کٹھن راستہ اور پہاڑوں کو عبور کر سکے گا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اس کی ماں نے بتایا کہ وہ روزانہ صبح فجر کے بعد کئی میل تک دوڑ لگاتا تھا۔ اس کی الماری سے ورزش کا سامان بھی برآمد ہوا ہے۔ اس نے لائن آف کنٹرول پار کرنے سے پہلے وائرلیس پر اپنی ماں اور مجھ سے بات کی اور بتایا کہ وہ اب وادیٔ کشمیر کی طرف روانہ ہو رہا ہے، آپ لوگ میری کامیابی اور شہادت کے لیے اللہ سے دعا کیجیے اور مجھ سے جو غلطیاں اور نافرمانیاں ہوئی ہیں، معاف کر دیجیے۔''

یہ جولائی ۱۹۹۷ء کی کوئی تاریخ تھی جب اس نے اپنے گھر والوں سے بات چیت کی۔ اس دوران والدین اور تمام بہن بھائی شعیب کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ لائن آف کنٹرول پار کرنے سے پہلے اہل خانہ کو اس کا ایک خط موصول ہوا جس میں اس نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کو چند نصیحتیں کی تھیں۔ یہ جامع خط ملاحظہ فرمائیں:

جامع خط

''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ۔

وہ ہستیاں جن کے بغیر گھربار، زندگی کی رعنائیاں، بچپن کے دکھوں سے پاک لمحات، مستقبل کے حسین تصورات گزارنا بہت مشکل اور دشوار گزار ہوتا ہے جن سے بچھڑ جانے کا تصور انسان کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے، ان سے بھی بچھڑنا پڑ جاتا ہے۔ مگر جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم اور

Marfat.com

پیارے نبی ﷺ کا فرمان آ جائے بس پھر وہاں پر صبر اور حوصلے سے کام لینا پڑتا ہے۔ پھر یہ گھر بار، زندگی کی رعنائیاں، مستقبل کے حسین تصورات، پیار بھرے مسکن اور اس آغوش کو جس میں دنیا کی ہر تکلیف کا علاج ہوتا ہے، بھی چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ آنے والا وقت بہت ہولناک ہے اس دن ہر شخص کی خواہش ہو گی کہ وہ فلاح پا جائے۔ اس دن ہر شخص اپنے آپ کو رحم کا امیدوار سمجھے گا۔ پھر ہر ایک کو اپنے گزرے ہوئے دن یاد آئیں گے۔ پھر اس سورت کا مفہوم بھی سمجھ میں آئے گا" القارعة ،ماالقارعة، وماادراک ماالقارعة ۔اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے۔ آمین۔"

بہن بھائیوں کو یہ ایمان افروز نصیحت کرنے کے بعد اس نے اپنے والدین کو یوں مخاطب کیا:

والدین سے خطاب

"محترم ابو جان اور امی جان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

میں بالکل خیریت سے ہوں اور اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ سب لوگوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، خوش و خرم رکھے اور اللہ کے علاوہ کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین

میں اس وقت بارڈر پر بیٹھا ہوا ہوں اور چند گھنٹوں کے بعد انشاء اللہ لائن آف کنٹرول (LOC) کراس کر کے ہم لوگ وادی میں چلے جائیں گے اور پھر اللہ کی بتائی ہوئی تجارت شروع کر دیں گے۔ آپ نے مجھے سبق دیا تھا جو مجھے یاد ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (الصف ٦١: ١٠-١١)

اس تجارت میں اگر میں کامیاب ہو گیا تو اللہ نے چاہا تو آپ لوگوں کا استقبال جنت کے دروازے پر کروں گا (انشاء اللہ)۔ یہاں کا موسم بہت اچھا ہے اور رات کو سردی ہوتی ہے۔ آج

Marfat.com

پہلی رات بارڈر پر درختوں کے نیچے گزاری ہے اور گھر کے نرم بستر بھی تھوڑے بہت یاد آئے۔ امی جان آپ کی فون پر مجھ سے آخری بار کی گئی باتیں مجھ کو بہت حوصلہ دیں گی اور ہر ماں کو ایسے ہی حوصلے اور ہمت سے اپنے جوان بیٹوں کو اللہ کی راہ میں تیار کرتے ہوئے بھیجنا چاہیے۔ آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا اور آپ میرے لیے دعا کرتے رہنا اور تمام مجاہدین کے لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی سربلندی کے لیے ہم سب کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ دشمن کے ساتھ مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھے اور ہمارے ہاتھوں دشمن دین کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے۔ آمین

اب جب کہ مجھے آپ لوگوں کا سہارا بننا تھا، میں اللہ کے راستے میں نکل کھڑا ہوا آپ لوگوں کو چھوڑ کر آ گیا ہوں تو اس میں ہم سب کا بھلا ہے کیونکہ یہ زندگی تو چند روز کی ہے اور دائمی، نہ ختم ہونے والی زندگی تو آنے والی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آخرت میں ہم سب اکٹھے مل جائیں گے۔ وہاں پر اللہ کے نبیؐ ہوں گے، ابراہیمؑ اور دیگر ہوں گے۔ تمام انبیائے کرام ہوں گے، صحابہ کرامؓ ہوں گے۔ اللہ کے محبوب بندے وہاں پر موجود ہوں گے اور سب سے بڑی چیز یہ کہ اللہ تعالیٰ، تمام جہانوں کا رب اپنی رحمت اور اپنی رضا کے ساتھ ہوگا۔ تو ہمیں نہ غم کرنا چاہیے اور نہ ہی پریشان ہونا چاہیے۔ ہم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں اور پھر ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اب ہم پر یہ سارا دارومدار ہے کہ جب ہم اس کی طرف جائیں تو کس حالت میں اس کے سامنے پیش ہوں۔

بھائیوں کے نام پیغام

باتیں لکھنے کو بہت دل کر رہا ہے لیکن وقت کم ہے اور ہم نے تیاری پکڑنی ہے تو اختصار کے ساتھ کچھ باتیں عرض خدمت ہیں۔ پہلے بڑوں کا احترام ہو جائے۔ حافظ صاحب [بڑے بھائی حافظ جنید احمد] کا کیا حال ہے۔ خیریت سے ہے۔ کاروبار اور چکی تو خوب چل رہی ہے۔ ادھر میں نے بھی بڑا پلانٹ لگایا ہے، چکی کا، ہندوؤں کے لیے۔ دیکھتے ہیں کہ زیادہ نفع کون کماتا ہے۔ اگر میرے ساتھ حصہ ڈالنا ہے تو اس طرف آ جا اگر نہیں تو ہم لوگوں کے لیے پیچھے سے سپلائی

Marfat.com

کا کام کریں اور خلوص نیت کے ساتھ یہ نہ ہو کہ اچھا مال خود رکھ لے اور دوسرا.......... مطلب تو سمجھ گیا ہوگا اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔

نصیر نیازی [دوسرے نمبر پر، شعیب سے بڑا بھائی]، سدا خوش رہو کیونکہ آپ ہی مجھ کو سب سے پہلے ٹریننگ کروانے کے لیے اپنے ساتھ افغانستان لے کر گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ راہ دکھانے کا اجر دے اور اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اس راہ کا مسافر بنائے۔ آمین۔ تمام جمعیت والوں کو سلام کہہ دینا اور اگر کوئی غلطی، کوتاہی یا غفلت برتی ہو تو آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اپنے دین کے کام کے لیے چن لے اور یہ آپ لوگوں کی راہ نجات کا ذریعہ بن جائے۔ آمین

زبیر نیازی [شعیب سے چھوٹا بھائی]، پڑھائی کے ساتھ ساتھ آخرت کے لیے بھی کچھ توشہ جمع کر کے رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ دنیا کی ڈگریاں لیتا جائے اور آخرت کی ڈگری کے لیے کوششیں نہ کرے۔ ماں باپ کی خدمت میں ہی راہ نجات ہے اور مجھے امید ہے کہ تو اس راہ میں ہم سب سے بازی لے گیا ہے اور آئندہ بھی اپنی برتری کا لوہا منوائے گا۔ جمعیت میں بھی تھوڑا سا وقت دیا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

جمشید نیازی [سب سے چھوٹا بھائی]، تیری سمجھ نہیں آتی ہے کبھی تو تو بہت محنتی اور گھر کا راج دلارا لگتا ہے اور جب تیری دوسری رگیں پھڑکتی ہیں تو شرارتوں والی دنیا کی دوسری مخلوق لگتا ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ مثبت سرگرمیوں میں حصہ لیا کرو، جمعیت کا کام کیا کرو۔ اور البدر میں ٹریننگ ضرور کرو اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے وقف ہو جاؤ۔ نمازیں پابندی سے باجماعت ادا کیا کر۔ سستی اور کاہلی چھوڑ کر ہونہار سرگرمیوں کی طرف گامزن ہو جا۔ قرآن کا مطالعہ اور لٹریچر اور احادیث کا مطالعہ بھی کیا کر۔ تیرے ساتھ تو میری کافی دفعہ لڑائی ہوئی ہے۔ اگر زیادہ لڑنے کا شوق رکھتا ہے تو تھوڑی سی ہمت دکھا کر کشمیر کا رخ ضرور کر۔ اگر کوئی غلطی یا تیرے ساتھ زیادتی کی ہو تو بڑا بھائی سمجھ کر معاف کر دیجیو۔ اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت دے اور دین کو سمجھنے اور اس پر

Marfat.com

عمل کرنے کی توفیق دے۔آمین''

بھائیوں کے بعد بہنوں کے نام لکھا'' تمام بہنوں کو سلام۔''

بہنوں کو نصیحت

وقت بہت کم ہے مگر حق حقوق بہت زیادہ ہیں۔ انشاءاللہ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو وادی کے اندر سے تمام کو علیحدہ علیحدہ خط بھیجوں گا۔ نمازوں کا پابندی سے خیال رکھنا اور وقت پر۔ ٹی وی کے ڈرامے وغیرہ کام نہیں آئیں گے۔ رحمت کا فرشتہ ہونے کا ثبوت دو اور ماں باپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کیا کرو اور تمام مجاہدین کے لیے خصوصی دعا کیا کرو۔ انسان تو غلطی کا پتلا ہے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اس سے کوئی غلطی یا کوتاہی نہ ہو، اگر مجھ سے غلطی یا کوتاہی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔ صدق دل سے اور تم لوگ جہاں بھی رہو خوش رہو اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھاؤ۔ آمین۔

میرے لیے دعا کرتے رہنا۔ اچھا اب اجازت

شعیب نیازی

۹۷-۸-۷

لائن آف کنٹرول''

سلسلہ وار خطوط

دو ماہ بعد شعیب نے مقبوضہ وادی سے ایک اور خط اپنے والدین کے نام بھیجا جس میں ایک دوست ارشد (جو گوجرہ کا خوبرو نوجوان تھا اور دو ماہ بعد ہی شہید ہو گیا) کے ساتھ تصاویر تھیں۔ سیبوں کے باغ میں سیب کھاتے ہوئے اور کندھے پر ایک پیٹی سیبوں کی اٹھائے ہوئے تصاویر کھینچی گئی تھیں۔ خط میں لکھا تھا کہ ہمارا ''سیبوں کا کاروبار'' بہت اچھا جا رہا ہے، خوب منافع ہو رہا ہے۔ راستے کی مشکلات، بلند و بالا پہاڑ عبور کرنے کا ذکر تھا۔ کشمیری مسلمانوں کی مہمان نوازی اور دل نوازی کا ذکر تھا۔

کچھ ہی عرصے بعد اس کا تیسرا خط موصول ہوا جس میں یہ اطلاع تھی کہ وہ سوپور سے بار

Marfat.com

برداری کے ایک ٹرک میں بیٹھ کر اسلام آباد (اننت ناگ) پہنچ گیا ہے۔ اننت ناگ اور اس کے گردونواح میں بھارتی افواج کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اس کے بعد خطوط کا سلسلہ کافی عرصہ بند رہا۔

چند ماہ بعد اس کا ایک اور خط موصول ہوا، جس میں لکھا تھا ''تین ماہ پہلے عمر (اس کا جہادی نام تھا) زخمی ہو گیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں اس کی ران میں گولی لگی تھی جس سے شدید زخم آیا تھا۔ اس حالت میں اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ وہ ایک برساتی نالے کے اندر پڑا تھا، ہوش آنے پر وہ قریبی گاؤں میں گھسٹتا ہوا پہنچا۔ گھر کے مکینوں نے کپڑا جلا کر اس کے زخم کو راکھ سے بھر دیا اور گھر میں پناہ دی۔ انھوں نے کسی طرح مجاہدین سے رابطہ کر کے اطلاع دی چنانچہ مجاہدین آ کر اسے لے گئے اور اس کا علاج شروع کر دیا۔ دو ماہ بعد وہ ٹھیک ہو گیا۔'' گویا عمر مختار (شعیب نیازی) نے خود ہی اپنے جہادی نام کے حوالے سے خبر دی تھی۔

اس کے بعد بھی اس کے خاندان کو اس کے لکھے ہوئے خطوط موصول ہوتے رہے۔ انور نیازی صاحب کے بقول ''اس کی شہادت سے چند ماہ پہلے غالباً مارچ ۱۹۹۹ء کی کوئی تاریخ تھی، راولپنڈی میں مجاہدین کے ہیڈ آفس سے وائرس لیس پر اس سے رابطہ ہوا۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک اس نے میرے ساتھ اور اپنی ماں کے ساتھ بات کی۔ بار بار اس بات کو دہراتا تھا کہ ''میرے لیے اور باقی تمام مجاہدین کے لیے دعا کریں۔ اس کی ماں نے اسے بہت دعائیں دیں اور بڑے حوصلے سے بات کی۔''

جانب شہادت رواں دواں

نیازی صاحب کی اہلیہ باجی ثریا ایک باہمت خاتون ہیں۔ ان کے والد راجہ احسان الحق اور والدہ دونوں جماعت کے ابتدائی دور سے اس قافلے میں شامل ہوئے تھے۔ دونوں صاحبِ عزیمت تھے۔ راجہ صاحب سید مودودی کے انتہائی معتمد رفقا میں شمار ہوتے تھے۔ طویل عرصے تک سکیورٹی، امور عمومی اور ٹرانسپورٹ کے شعبوں کو تنہا بڑی کامیابی اور مکمل ذمہ داری کے ساتھ

Marfat.com

چلاتے رہے۔ بیگم راجہ احسان الحق حلقۂ خواتین میں اپنی خدمتِ خلق اور جرأت و استقامت کی وجہ سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ باجی ثریا کے اندر بھی اپنے عظیم والدین کا ایک اثر جھلکتا اور محسوس ہوتا ہے۔

نیازی صاحب کو اللہ نے پانچ بیٹے دیے تھے۔ شعیب قد کاٹھ اور سرگرمیوں میں سب سے ممتاز تھا۔ اس کے گھر سے چلے جانے کے بعد یقیناً اہل خانہ ہی نہیں اہل منصورہ بھی اس کی کمی محسوس کرتے تھے مگر وہ اللہ کی راہ میں نکلا تھا، اس لیے ہر شخص اس کے لیے دعا گو رہتا تھا۔ اس کے والدین اس کے ساتھ رابطے کی کوشش کرتے۔ نیازی صاحب کے الفاظ میں ''ہمارا رابطہ راولپنڈی میں مجاہدین کے مرکز سے رہتا تھا۔ شعیب کی شہادت سے ایک روز قبل میں نے فون پر مجاہدین سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ آج اپنے مشن سے واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔ ایک ماہ سے وہ رابطے میں نہیں تھا۔ اسی رات بھارتی فوج نے ان کے ٹھکانے کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ صبح اٹھے تو چاروں طرف فوج تھی۔ دیر (صوبہ سرحد) کا صلاح الدین بھی اس کے ہمراہ تھا، دونوں نے گرفتاری دینے کے بجائے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح ۶ بجے مقابلہ شروع ہوا جو دوپہر تک جاری رہا۔ ایک بجے دونوں شہید ہو گئے۔ بی بی سی نے اپنی خبروں میں اس مقابلے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا: ''مقبوضہ وادی کشمیر میں بھارتی فوج کے ساتھ جھڑپ میں دو مجاہدین شعیب نیازی اور صلاح الدین ہلاک ہو گئے ہیں جبکہ بھارتی فوج کے ایک میجر، تین افسران اور کئی سپاہی زخمی ہوئے ہیں۔'' میرے ایک کزن میانوالی کے ایک گاؤں میں بی بی سی پر خبریں سن رہے تھے، انھوں نے جب یہ خبر سنی تو بیٹوں سے کہا ''شعیب شہید ہو گیا ہے'' بیٹوں نے کہا کہ یہ کوئی اور شعیب ہوگا اور انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا جو ہم سے رابطہ کرتے۔''

شہادت کی اطلاع

میں حسب معمول اپنے دفتر پہنچا تو اپنے رفیق کار منصور جعفر کو دفتر میں دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ

Marfat.com

انھیں اسلام آباد جانا تھا جہاں فیصل مسجد کے سامنے جماعت اسلامی حلقہ خواتین کے زیر اہتمام بہت بڑی ریلی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ منصور جعفر نے اس کی کوریج کرنی تھی ۔ ہمارے سیکرٹری اطلاعات امیر العظیم صاحب نے انھیں روک لیا کہ وہ دفتر میں موجود رہیں۔ دراصل انھیں رات کو ہی شعیب نیازی کی شہادت کی خبر مل چکی تھی ۔ منصور جعفر کے ذمے لگا کہ وہ مجھے شعیب نیازی کی شہادت کی خبر کسی طرح دے دے لیکن اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ یہ خبر مجھ تک کیسے پہنچائے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حزب المجاہدین لاہور کے ذمہ داران کا ایک وفد میرے دفتر ملنے آیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد انھوں نے کہا ''آپ کا بیٹا شعیب نیازی مقبوضہ کشمیر میں جہاد پر گیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے شہادت کا رتبہ عطا فرمایا ہے،'' ساتھ ہی اس کی وصیت اور ایک ویڈیو میرے حوالے کی ۔ مجھے یہ خبر سنتے ہی ایک کرنٹ سا لگا، لیکن فوراً ہی میرے اللہ پاک نے میرے دل پر سکینت نازل فرما دی اور میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا اور ان کے ساتھ مل کر شہادت کی قبولیت کی دعا کی ۔ کچھ ہی دیر بعد محترم سید منور حسن صاحب (قیم جماعت اسلامی) اور دیگر اکابرین تعزیت کے لیے میرے دفتر آنا شروع ہو گئے۔

عظیم بیٹے کی عظیم ماں

ادھر اسلام آباد جہاں خواتین کی ریلی منعقد ہو رہی تھی، میری اہلیہ، بیٹیاں اور بیٹے ریلی میں شرکت کے لیے جا چکے تھے صرف ایک بیٹا گھر پر تھا۔ اس دوران محترم قاضی حسین احمد صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے تعزیت اور شہادت کی قبولیت کی دعا کی ۔ ریلی میں اسٹیج پر شعیب نیازی کی شہادت کا اعلان ہو گیا تھا۔ منصورہ کی ایک بچی نے میری اہلیہ سے جو کچھ فاصلے پر تھیں اور انہیں ابھی شہادت کی خبر نہیں پہنچی تھی، سوال کیا کہ شعیب کب شہید ہوا ہے۔ میری اہلیہ یہ سن کر ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گئیں اور اس بچی سے پوچھا کہ واقعی؟ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ اس بچی نے انھیں کہا کہ آپ کے لیے بار بار اعلان ہو رہا ہے کہ اسٹیج پر آ جائیں ۔ میری اہلیہ بتاتی ہیں کہ جب میں اسٹیج پر پہنچی تو تمام خواتین رو رہی تھیں ۔ اس موقع پر شہید کی ماں خود تمام خواتین کو تسلی دے رہی

Marfat.com

تھیں اور چپ کرا رہی تھیں۔ یہ سب اللہ کریم کا فضل خاص تھا۔ مجھے یہ فکر دامن گیر ہو رہی تھی کہ خدا جانے اس کا کیا حال ہو۔ [وہ شوگر کی مریضہ بھی ہیں]

امیر العظیم صاحب نے میری اہلیہ کو پیشکش کی کہ ان کی گاڑی حاضر ہے وہ اس میں بیٹھ کر لاہور چلی جائیں، انھوں نے جواب دیا کہ وہ پروگرام میں آئی ہیں اور پروگرام کر کے ہی واپس اسی بس پر بہنوں کے ساتھ جائیں گی جس پر وہ آئی تھیں۔ رات ڈھائی بجے ان کی واپسی ہوئی۔ اتنی تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ راستے میں بس ڈرائیور بھٹک گیا تھا اور کہیں دوسری طرف نکل گیا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ وہ تو میانوالی کی طرف جا رہا ہے۔ یہ احساس ہونے کے بعد وہ دوبارہ جی ٹی روڈ کی طرف واپس لوٹا۔ میری اہلیہ نے گھر پہنچتے ہی مجھے بیٹے کی شہادت کی مبارکباد دی۔ شہید کی بہنیں بھی صبر و شکر کا پیکر بنی ہوئی تھیں۔ نہ رونا دھونا نہ آہ و بکا۔ سب گھر والوں نے اپنے رب کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

سکینت

مختلف مواقع پر میں نے شہدا کے والدین کے بارے سنا تھا اور مشاہدہ بھی کیا تھا کہ شہدا کے والدین کو اپنے شہید پر آنسو بہاتے نہیں دیکھا حالانکہ یہ فطری بات ہے۔ میں حیران ہوتا تھا لیکن جب خود اس حالت سے گزرا تو میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے اور اس کی طرف سے نازل کی گئی سکینت ہے جس کی وجہ سے صبر آ جاتا ہے۔ میرے ایک رشتے کے بھتیجے کیپٹن عامر شعیب کی شہادت سے دو تین ہفتے قبل گلگت میں جیپ دریا میں گرنے سے شہید ہو گئے تھے ان کی والدہ بہت روتی تھیں۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ کا بیٹا شہید ہو گیا ہے آپ صبر کریں اس کا اجر ملے گا۔ کہنے لگی میرے بیٹے کی لاش مجھے لا کر دو تو میں پھر نہیں روؤں گی۔ دو ہفتے کے بعد اس کی لاش مل گئی۔ لاش گھر لائی گئی جنازہ اور تدفین ہو گئی لیکن میری اس عزیزہ کو پھر بھی صبر اور چین نہ آیا اور وہ کافی عرصہ تک بیٹے کے غم میں روتی رہیں۔ چند سال پہلے وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ شعیب نیازی شہید کی شہادت کی خبر سن کر وہ ہمارے گھر آئیں اور جب ہمارے گھر کا ماحول دیکھا

Marfat.com

کہ یہاں تو سکون اور اطمینان ہے کوئی آہ و بکا اور رونا دھونا نہیں تو حیران ہو کر کہنے لگی تم لوگ پتھر کے ہو۔ بیٹا شہید ہو گیا ہے اور تمھیں کوئی غم اور افسوس نہیں ہے۔ میری اہلیہ نے کہا افسوس کس بات کا اللہ تعالیٰ نے ہمارے بیٹے کے سر پر شہادت کا تاج رکھا ہے اور یہ اعزاز کی بات ہے۔ باقی رہا غم تو بچھڑنے کا غم اور افسوس تو ہوتا ہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے سب گھر والوں کو سکون کی ایسی دولت عطا کی ہے کہ جسے بتایا نہیں جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

شہدا و غازیوں کے قافلے

قارئین محترم! شہادتوں کا قافلہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے دور سے تاریخ کی گزرگاہوں میں رواں دواں ہے۔ ہر دور میں اللہ کے بندے، محمد عربیؐ کے جاں نثار اور شمعِ حق کے پروانے اس فہرست میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ شہدا زندہ ہوتے ہیں، مرتے نہیں۔ صرف ہم سے جدا ہو جاتے ہیں۔ ان پر بین کرنا اور بے صبری کا مظاہرہ درست نہیں ہوتا۔ ہاں جدائی اور فراق کا فطری غم اپنی جگہ بالکل بجا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آنا بھی اسی کا حصہ ہے۔ شہدا کے گھروں میں اللہ کی طرف سے خصوصی سکینت نازل ہوتی ہے۔ ہم نے بے شمار شہدا کے اہل و عیال سے ان کی شہادتوں کے مواقع پر ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ہر جگہ اس سکینت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ نے شہید شعیب نیازی کے والدین کے جذبات و تاثرات اور ردّ عمل جو اس مضمون میں دیکھا ہے، وہ بھی اسی کی علامت و مظہر ہے۔ اللہ شہدا کی قربانیوں کو شرفِ قبولیت بخشے اور جن مقاصد کے لیے انھوں نے جانوں کی بازی لگائی، اللہ اس امت کے حق میں وہ مقدر فرما دے۔ شعیب نیازی اور دیگر تمام شہدا پر اہلِ منصورہ کو فخر ہے۔ اللہ ان شہدا کے لواحقین کو قرآن و حدیث میں دی گئی بشارتوں کا مصداق و مستحق بنا دے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

Marfat.com

حاجی فضل رازق مرحوم

(۲۰۰۹ء-۱۹۳۱ء)

غائبانہ تعارف

حاجی فضل رازق صاحب کا تذکرہ پہلی بار ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ زمانے میں سنا۔ اس وقت وہ اپنے علاقے میں مقامی طور پر معروف شخصیت تھے مگر اس کے باہر زیادہ تعارف نہ تھا۔ حاجی صاحب کے ایک چھوٹے بھائی حمید الرازق اسلامی جمعیت طلبہ کے رفیق اور سرگرم کارکن تھے اور لاہور میں وٹرنری کالج میں زیر تعلیم تھے۔ میں اس زمانے میں اس کالج کے قریب ہی گورنمنٹ کالج لاہور (موجودہ جی سی یونی ورسٹی) میں بی اے کا طالب علم اور جمعیت کا رکن تھا۔ وٹرنری کالج میں جمعیت کی پہچان دو پختون طلبہ میر کابل بھائی اور حمید الرازق بھائی تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے آبائی علاقے اور خاندان کا تذکرہ کیا تو معلوم ہوا کہ حاجی فضل رازق ان کے بڑے بھائی اور بہت فعال تحریکی ساتھی ہیں۔

تاخیر، معذرت

حاجی صاحب سے بالمشافہ ملاقات ۱۹۸۵ء کے بعد ہوئی۔ اس وقت وہ پاکستان پارلیمنٹ کے رکن اور جماعت کے اہم راہ نما تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہوگئے اور پھر ان کی زندگی کے آخری ایام تک یہ تحریکی محبت قائم ودائم اور روز افزوں رہی۔ موصوف کی وفات کی خبر ملی تو بڑا صدمہ ہوا، جنازے میں شرکت ممکن نہ تھی البتہ اہل وعیال سے تعزیت کی۔ مرحوم حاجی صاحب سے تعلق کی بدولت میرے ذمے یہ قرض چلا آ رہا تھا کہ ان پر قلم اٹھایا جائے مگر سستی حائل رہی۔ ان کے علاقے سے جب بھی تحریکی ساتھی ملتے وہ اس کوتاہی کی یہ

Marfat.com

شکایت کرتے۔ان کے اہل خاندان نے بھی اس ضمن میں اپنے جذبات کئی بار پہنچائے۔اب قدرے تاخیر سے حاجی صاحب مرحوم کے بارے میں یہ سطور مرحوم کے دوست اور عقیدت مند برادرم اکبر خان ایڈووکیٹ اور مرحوم کے برادر عبدالیونس صاحب کی فرمائش پر حوالہ قرطاس کی جارہی ہیں۔ان دونوں بھائیوں نے حاجی صاحب کے خاندانی پس منظر کے بارے میں معلومات بھی فراہم کی ہیں جن پر میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔مرحوم ۲۲ رجون ۲۰۰۹ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے تھے، اس لیے احبابِ بونیر کا اصرار ہوا کہ اس موقع پر یہ مضمون تحریکی جرائد میں ضرور چھپنا چاہیے۔

دین حق کا سپاہی

حاجی فضل رازق بونیر کے گاؤں چینہ میں ایک متوسط درجے کے کسان گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۲۲ رجون ۲۰۰۹ء کو ۸۷ برس کی عمر میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔وفات کے وقت وہ مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان اور صوبائی مجلس شوریٰ صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) کے رکن تھے اور ضلعی جماعت کے امیر تھے۔نماز جنازہ جماعت اسلامی پاکستان کے سابق امیر قاضی حسین احمد صاحب نے پڑھائی جب کہ جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے صوبائی قائدین کے علاوہ کثیر تعداد میں سیاسی اور سماجی شخصیات جنازے میں شریک ہوئیں اور ان کو اشک بار آنکھوں سے ان کے زرعی فارم کے ایک کونے میں سپرد خاک کر دیا۔اللہ تعالیٰ ان کی لحد پر تا قیامت رحمتیں نازل فرماتا رہے۔مرحوم اللہ کے دین کے مخلص سپاہی اور خلق خدا کے سچے خادم تھے۔جن دنوں قومی اسمبلی کے رکن تھے، اسلام آباد میں پارلیمنٹ لاجز میں ان کی رہائش گاہ پر مہمان خانے کا سماں ہوتا تھا۔ان کے علاقے کا عام آدمی اور ووٹر بھی معزز مہمان شمار ہوتا تھا۔

بچپن اور تعلیم

مرحوم حاجی فضل رازق نے بچپن ہی سے زندگی کی تلخیاں برداشت کرنے کا سلیقہ اپنے اندر پیدا کر لیا تھا۔ان کا حوصلہ بلند اور قلب ونظر میں وسعت تھی۔وہ موضع چینہ ضلع بونیر کے ایک متوسط

Marfat.com

گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اپنے گاؤں کے معروف عیسیٰ خیل خاندان کی شاخ خان خیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عبدالمستعان اپنے وقت کے مشہور عالم دین تھے۔ ان کا خاندان ایک علمی خاندان چلا آ رہا ہے۔ ارکان خاندان کے ناموں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا پسِ منظر خاصا علمی تھا۔ ان کے دادا عبدالحنان بھی اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ مرحوم فضل رازق نے ۱۹۳۱ء میں اسی علمی خاندان میں آنکھ کھولی۔ اس زمانے میں بونیر میں کوئی سکول نہیں تھا اس لیے پرائمری اور ابتدائی تعلیم انھوں نے ضلع مردان کے گاؤں رستم کے سکول میں حاصل کی۔ وہ چار بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی عبدالرازق صاحب کے ہمراہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی چلے گئے۔ وہاں پر دینی تعلیم مدرسہ فتح پوری اور مدرسہ عبدالرب میں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت وہاں سے واپس گھر آئے اور صرف ۱۶ سال کی عمر میں اپنی والدہ اور بھائیوں کے لیے حصول معاش میں لگ گئے۔ سوات کے ایک مشہور ٹھیکیدار شیر داد صاحب کے پاس ملازمت اختیار کی اور اپنی خداداد صلاحیت اور ایمانداری کی بدولت اس کمپنی کے انچارج بنا دیے گئے اور شانگلہ کے علاقے غوربند میں لکڑی کے بہت بڑے ڈپو پر ڈیوٹی دینے لگے۔

ابتلا اور جلاوطنی

۱۹۴۹ء میں ریاست سوات کے بادشاہ عبدالودود نے اپنی حکومت کو اپنے بیٹے عبدالحق، جہان زیب کے حوالے کیا۔ بونیر بھی اسی ریاست کا حصہ تھا۔ سیاسی لحاظ سے نیا والیٔ سوات بھی اپنے باپ کی طرح ایک آمر حکمران تھا۔ ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی۔ کوئی سیاسی جماعت سوات میں کام نہیں کر سکتی تھی۔ ہر جگہ حکمران کا طوطی بولتا تھا اور ہر مسجد میں والیٔ سوات کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ بنیادی حقوق نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ جناب تاج الملوک، مولانا غلام رحمانی، جناب عثمان غنی، ڈاکٹر زین العابدین اور بہت سے دیگر وابستگانِ جماعت شدید ابتلا کا شکار ہوئے اور آخر جلاوطن کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں نوجوان فضلِ رازق نے مولانا مودودی اور جماعت

Marfat.com

اسلامی کا نام سنا اور مولانا کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان کے اپنے بقول انھیں ۱۹۵۳ء میں غوربند کے مقام پر مولانا مودودی کی کتب پڑھنے کا موقع ملا۔ جس ٹھیکیدار کے پاس کام کرتے تھے، اسی کے دوسرے اہل کار طالع مند صاحب، (سوات) جو الحمدللہ اب بھی بقید حیات ہیں، کے ذریعے انھیں یہ کتابیں ملتی رہیں۔ انتہائی ذہین اور سنجیدہ ہونے کی وجہ سے جو پڑھا، اسے خوب ذہن نشین کیا اور جو سمجھا اسے دل و جان سے قبول کیا اور اسی وقت سے جماعت اسلامی کے کارکن بنے۔ تاج الملوک مرحوم اور زین العابدین مرحوم، حاجی عثمان غنی صاحب، شیر علی خان مرحوم کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم قائم تھے۔ ان بزرگان کی پرعزم زندگیوں نے حاجی صاحب کو بہت متاثر کیا۔ اب انھوں نے مکمل وارفتگی کے ساتھ جماعت اسلامی کا کام شروع کیا اور آخری دم تک یہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ وہ اپنے علاقے میں جماعت اسلامی کی پہچان بلکہ چلتی پھرتی زندہ و متحرک تحریک تھے۔

دعوت کے میدان میں

جماعت اسلامی کے کام کے سلسلے میں آپ کا طریقۂ دعوت، منہج نبوی کے مطابق اسلامی، موثر اور عوامی تھا۔ بونیر کے تمام بااثر خاندانوں میں دعوت پھیلانے کو اپنا ہدف بنایا۔ مرحوم دعوتی پمفلٹ ایک تھیلے میں لے کر چل نکلتے اور اپنے ہدف پر پہنچتے۔ ان کے ساتھ کھانا کھا کر وہیں رات گزارتے اور اپنی دعوت کو مختلف آسان پیرایوں میں بیان کرتے، ہر قسم کے اشکال اور سوالوں کے جواب دیتے اور کتاب ان کے پاس چھوڑ کر واپس آ جاتے۔ وہ باہمت اور ان تھک راہنما تھے۔ آرام کوشی کے بجائے دوسرے دن دوسری طرف چل نکلتے اور یوں پورے بونیر میں اس اکیلے انسان نے تمام بااثر خاندانوں کو جماعت اسلامی کی دعوت پہنچائی۔ ان کی باعمل زندگی کی بدولت اس علاقے میں وہ تمام لوگ جن کی وہ نمایندگی کرتے تھے، آج تک جماعت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ الحمدللہ یہ علاقہ دیر کی طرح اب جماعت کا مضبوط و محفوظ قلعہ بن گیا ہے۔

Marfat.com

جرأتِ مومنانہ

حاجی صاحب انتہائی نڈر انسان تھے۔ ایک دفعہ بونیر کے ایک دور افتادہ گاؤں فولادی، جو ضلع شانگلہ کی سرحد پر واقع ہے، میں جماعت اسلامی میں چند بااثر خاندانوں کی شمولیت کی تقریب کی دعوت ملی۔ وہاں جاتے ہوئے اس وقت تقریباً بیس، پچیس کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ راستہ پہاڑی تھا۔ دعوت کے ساتھ مخالفین کی طرف سے یہ دھمکی بھی آئی کہ راستے میں پیشہ ور قاتل مفروروں کے گروپس بٹھائے جائیں گے۔ اس اطلاع پر انھوں نے ساتھیوں کا اجلاس طلب کیا اور مشورہ چاہا۔ بعض ساتھیوں نے کہا کہ سوات کے راستے ضلع شانگلہ کی طرف سے ہو کر وہاں جانا مناسب ہوگا۔ خواہ مخواہ آزمائش کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، مگر انھوں نے ایک زوردار تقریر کی اور کہا کہ اگر ایک دفعہ اس مصلحت کے شکار ہوئے تو مخالفین دلیر ہو کر بھیڑیے بن جائیں گے اور جماعت کی ہوا اکھڑ جائے گی اور ساکھ ختم ہو جائے گا۔ حاجی صاحب نے دو درجن ساتھیوں کو ساتھ لے کر اس دشوار گزار پہاڑی راستہ پر وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور مخالفین حیران و ششدر ہو کر رہ گئے، جب یہ قافلہ مقررہ تاریخ کو بروقت وہاں پہنچ گیا۔ یہ ہے جرأت مومنانہ!

والی کا نادر شاہی حکم

ایک مرتبہ والی سوات سے مکالمہ کرتے وقت جب والی سوات نے کہا کہ اگر کسی نے تمھیں مار ڈالا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ انھوں نے جواب دیا میں تو مر چکا ہوں گا اور مجرم سے قتل کا جرمانہ وصول نہ کر کے تم خود اپنا نقصان کرو گے۔ اس کے بعد والی نے دوسری دھمکی دی کہ میں تمھارے بھائی کی وٹرنری کی ریزرو سیٹ کینسل کرا دوں گا۔ تم اس کو آزمائش میں کیوں ڈال رہے ہو؟ اس مرد مومن نے جواب دیا۔ سیٹ آپ نے دی ہے اور آپ اس کے کینسل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ آپ جو چاہیں کر گزریں۔ سیٹ تو کینسل نہ ہوئی مگر حاجی صاحب کے بھائی کا ماہوار وظیفہ بند کر دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں جب پاکستان میں فیلڈ مارشل

Marfat.com

ایوب خان نے جماعت اسلامی کے خلاف انتقامی مہم کا آغاز کیا تو اس کا اثر ریاست سوات پر بھی ہوا۔ والیِ سوات کا ایوب خان کے ساتھ خاندانی تعلق تھا بلکہ اس کے دو بیٹے جرنیل صاحب کے داماد تھے۔ وہاں پر جماعت اسلامی کے کارکنوں کے خلاف بار بار کریک ڈاؤن کیا گیا۔ سیاسی پابندیوں کی وجہ سے کوئی باقاعدہ جماعت تو نہ تھی البتہ منتشر کارکن ہر جگہ موجود تھے۔ حکومت نے ان کو گرفتار کرنا شروع کیا۔ حاجی فضل رازق کو بھی والیِ سوات نے اپنے حضور بلایا اور اس کے ساتھ دل چسپ سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ اس نے تحکمانہ انداز میں پوچھا: ''کیا تم مودودی بن گئے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''مودودی تو لاہور میں مقیم، پاکستان بلکہ عالم اسلام کے ایک بہت بڑے لیڈر اور اجل عالمِ دین ہیں اور اچھرہ میں رہ رہے ہیں۔ میرا نام فضل رازق ہے اور چینہ، بونیر کا باشندہ ہوں''۔ اس بے ساختہ اور صریح جواب پر والی صاحب بہت غصے ہوئے اور کہا کہ اگر کسی نے تجھے مار ڈالا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ ساتھ ہی فوراً ریاست سوات کی حدود سے نکل جانے کا نادر شاہی حکم صادر کر دیا۔ وہ وہاں سے مردان منتقل ہوئے اور ۱۹۶۴ء کے آغاز میں جب جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی گئی تو وہ مردان کے شاہین پٹرول پمپ پر ملازمت کر رہے تھے۔ عدالتی چارہ جوئی کے بعد جب اکتوبر ۱۹۶۴ء میں جماعت پر پابندی ختم ہوئی تو حاجی صاحب واپس بونیر چلے آئے۔

قومی اسمبلی کا وفد

۱۹۶۳ء میں ریاست سوات میں بنیادی انسانی حقوق کی معلومات کے سلسلے میں قومی اسمبلی پاکستان کے ممبران کا ایک وفد سوات آیا جس میں اپوزیشن کی طرف سے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ممبر قومی اسمبلی مولانا اے کے ایم یوسف صاحب بھی شامل تھے۔ مرحوم نے مولانا یوسف کو بونیر آنے کی دعوت دی اور چینہ میں عوام کے ایک جرگے سے ان کی ملاقات کرائی۔ پھر مولانا کے مشورے سے بنیادی انسانی حقوق کی مہم کے سلسلے میں عوام کے دستخطوں کے حصول کے لیے دن رات کام کر کے ہزاروں لوگوں سے ایک محضر نامے پر دستخط حاصل کیے۔ وہ جہاں بھی گئے

Marfat.com

لوگوں نے ان کی دعوت وترغیب پر بلا جھجک دستخط کر دیے۔ سوات کے پاکستان میں ادغام میں اس مہم نے بھی بڑا کردار ادا کیا۔

ریاست کا پاکستان میں ادغام

۱۹۶۹ء میں جب ریاست سوات کا پاکستان میں ادغام ہوا اور جماعت اسلامی نے کھل کر کام شروع کیا تو الحمدللہ جماعت اسلامی بہت جلد ایک بڑی جماعت بن کر ابھری کیونکہ اس کے لیے ابتدائی اور اساسی کام مضبوط بنیادوں پر کیا جا چکا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں ایک بڑا جلسہ عام سواڑی کے مقام پر ہوا، جس میں امیر جماعت اسلامی صوبہ سرحد، خان سردار علی خان صاحب اور صوبہ کے مایہ ناز عالم دین مولانا گوہر رحمان صاحب نے خطاب کیا اور جماعت اسلامی کی دعوت نہایت موثر انداز میں عوام کے سامنے پیش فرمائی۔ ۱۹۶۹ء میں کمیونزم اور سوشلزم کا غلغلہ ملک بھر میں ہر جگہ بلند ہو رہا تھا۔ بونیر میں بھی ہر محاذ پر اس سے تحریک اسلامی کا مقابلہ رہا اور ہر میدان میں اللہ نے اس ازم کو شکست سے دوچار کیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سوات سے جماعت کے راہنما شیر علی خان صاحب بونیر سے قومی اسمبلی کی سیٹ پر انتخابات میں کھڑے ہوئے۔ جماعت کا یہ پہلا انتخاب تھا، شیر علی خان مرحوم تیسرے نمبر پر رہے۔

حلقۂ درس قرآن ودعوت

ریاستی دور میں آپ نے اپنے محلے کی مسجد میں نماز عشاء کے بعد پشتو میں درس قرآن کا ایک مستقل حلقہ قائم کیا۔ مسجد کے امام صاحب کو اعتماد میں لے کر ان سے لفظی ترجمہ کراتے اور اس کے بعد خود تفہیم القرآن سے اس کی تشریح کرتے۔ بہت سے ایسے بالغ نوجوان جنھوں نے ناظرہ قرآن پاک بھی نہیں پڑھا تھا، درس قرآن کے اس حلقہ میں شامل ہوئے۔ ان کے لیے اپنے ایک ساتھی کی ذمہ داری لگائی کہ ہر روز نماز عصر کے بعد ان کو ناظرہ قرآن پڑھائیں اور رات کو ان کو درس قرآن سننے کے لیے تیار کریں۔ یوں کئی نوجوانوں نے ناظرہ قرآن مجید بھی پڑھ لیا اور قرآن فہمی کے قابل بھی ہو گئے۔ ان لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ نے جماعت کو دانش خان صاحب

Marfat.com

چینہ، ارسلا خان صاحب ڈھیری، حاجی مسکین صاحب ڈھیری اور سراج خان صاحب ڈھیری جیسے باصلاحیت اور مخلص رفیق دیے، جنھوں نے زندگی بھر ان پڑھ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے ان کے ساتھ رفاقت نبھائی۔ وہ جماعت اسلامی کے ارکان بن گئے۔ سراج خان اور ارسلا خان صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، جبکہ باقی دو اب بھی پوری تندہی سے بحیثیت ارکان جماعت اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں۔ حاجی صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے مولانا مودودیؒ کی کتاب خطبات کا خود پشتو ترجمہ کیا اور اپنی مسجد میں باقاعدہ طور پر نماز جمعہ کے خطبات میں سناتے رہے۔

نہایت ہی باحیا آدمی تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے تھے۔ بہت کم کھایا کرتے تھے اور خوب چبا کر کھایا کرتے تھے۔ صبح اٹھ کر قضائے حاجت، وضو اور غسل کرنے کے لیے غسل خانہ جاتے تو تقریباً ایک گھنٹہ میں فارغ ہو کر نکلتے اور پھر سارا دن باوضو رہتے تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا حاجی صاحب آپ ہمیشہ باوضو رہتے ہیں؟ انھوں نے کہا: ”جی ہاں، الحمدللہ! بڑے بڑے شیطانوں سے مقابلہ ہے، بغیر وضو کیسے رہ سکتے ہیں؟“

تحریکی گھرانہ

حاجی صاحب مرحوم کی خانگی زندگی ایک مثالی بھائی چارے اور اخوت کی زندہ مثال ہے۔ تین بھائیوں کے بال بچوں پر مشتمل تیس سے زائد بالغ اور دس بارہ نابالغ افراد کے ایک مشترک خاندان کا ایک ہی گھر میں، ایک ہی باورچی خانہ سے کھانا پینا، سب کے مزاجوں کے مطابق خوراک و پوشاک کا انتظام کرنا، سب کو ایک ساتھ رکھنا اور ان کے مابین مساوات اور برابری کا تعلق قائم رکھنا خاندان کے سربراہ کے لیے ایک کڑا امتحان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو مزاج شناسی، معاملہ فہمی اور بروقت مناسب قدم اٹھانے کی جو صلاحیت دی تھی، اس کی بدولت خاندان میں مکمل یکجہتی رہی اور اتفاق و اتحاد کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔ مرحوم تمام اہم معاملات میں بھائیوں کو شریک مشورہ کرتے۔ ان کو اعتماد میں لے کر کوئی قدم اٹھاتے۔ ان کے بھائی بھی سراپا سمع واطاعت رہے اور ان کے دست و بازو بنے رہے۔ اجتماع اہلِ خانہ منعقد کرنے پر سختی سے عمل پیرا

Marfat.com

تھے۔ اڑوس پڑوس سے رشتہ دار خواتین کو جمع کر کے خود درس قرآن دیتے اور ضروری ہدایات ارشاد فرماتے تھے۔ اس لیے پورے خاندان میں تحریک کے ساتھ مکمل ذہنی ہم آہنگی قائم رہی۔

خاندانی نظامِ قیادت

حاجی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں نے مل کر باہم مشاورت سے ان کی زندگی کے ساتھی، سفر وحضر میں ان کے رفیق، ان کے دست راست، پرائیویٹ سیکرٹری، شاگرد خاص اور راز دار عبدالیونس صاحب ایم اے۔ بی ایڈ۔ ہیڈ ماسٹر (ریٹائرڈ) کو ان کا جانشین اور خاندان کا سربراہ نامزد کیا۔ ۷ رجولائی ۲۰۰۹ کو جب سید منور حسن صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان تعزیت کے لیے تشریف لائے تو خاندان کے حجرے میں ایک بہت بڑے اجتماع میں انھوں نے مرحوم کی قراقلی ٹوپی خاندان کی سربراہی کے نشان کے طور پر عبدالیونس صاحب کو پہنائی۔ اب تک وہ یہ مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان کو ہمت وتوفیق سے نوازے۔ وہ مرحوم کے چچازاد اور ان سے چھوٹے ہیں۔ حاجی صاحب بہت علم دوست انسان تھے۔ بہت سے ایسے طالب علم جن کو تعلیم کے حصول میں مشکلات کا سامنا تھا۔ مرحوم نے ان کی بھرپور مدد کی۔ تحصیل چغرزئی، مارتونگ اور چکسیر کے کئی معزز گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم ان کا ڈیرہ بطور ہوسٹل استعمال کرتے تھے اور الحمدللہ اب وہ زندگی کی دوڑ میں بہت آگے اور اسلامی تحریک کے بہترین خادم اور سپاہی ہیں۔

معرکۂ انتخاب میں

صوبائی نظم جماعت نے ۱۹۷۰ء سے حاجی فضل رازق مرحوم کو جماعت کی اہم ذمہ داریوں پر فائز کیا۔ اس وقت سے ۱۹۷۹ء تک مرحوم بونیر سب ڈویژن کے ناظم/ امیر رہے۔ مرحوم ۱۹۷۴ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے۔ ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ ملکی انتخابات میں اترے اور پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، مگر عمومی دھاندلی کی وجہ سے بھٹو حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک چلی اور وہ اسمبلی میں جانے کے بجائے جیل گئے۔ ۱۹۸۵ میں غیر جماعتی

Marfat.com

انتخابات میں دوبارہ اسی علاقے سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں پاکستان اسلامی جمہوری اتحاد کی ٹکٹ پر جماعت اسلامی کی طرف سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے جب کہ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں شکست سے دوچار ہوئے۔ اور اب تک قومی اسمبلی کی یہ سیٹ جماعت اسلامی کے ہاتھ دوبارہ نہیں آئی۔ البتہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں اگر جماعت نے بائیکاٹ نہ کیا ہوتا تو جماعت کا اس نشست سے جیت جانا یقینی تھا۔

بونیر کا ضلعی درجہ

جنرل فضل حق مرحوم سابق گورنر صوبہ سرحد کے مرحوم حاجی صاحب کے ساتھ بڑے دوستانہ مراسم تھے۔ مرحوم کی صاف گوئی، جرأت، اصول پسندی اور دیانت داری کی وجہ سے جنرل صاحب ان کی بہت تعریف اور قدر کرتے تھے۔ علاقے کی تعمیر و ترقی کے لیے مرحوم نے بونیر کو ضلع کا درجہ دینے کا پکا ارادہ کیا ہوا تھا۔ جنرل صاحب سے حاجی صاحب نے کئی ملاقاتوں میں یہ کیس پیش کیا۔ گورنر صاحب نے اس کا وعدہ کیا تھا کہ وہ بونیر کو ضلع کا درجہ دیں گے اور اس کے لیے تاریخ بھی طے کی تھی لیکن جنرل ضیاء الحق کی اچانک وفات کی وجہ سے جنرل صاحب کا دورہ ملتوی ہو گیا اور وہ وعدہ ایفا نہ کر سکے۔ حاجی صاحب نے بھی عوام سے یہ وعدہ کر رکھا تھا، اس لیے انھوں نے اپنی حکومت تبدیل ہو جانے کے بعد بھی جدوجہد جاری رکھی۔ جو لوگ علاقے سے واقف ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اہل بونیر کے لیے سوات (مینگورہ) کا سفر کس قدر مشکل تھا۔ حاجی صاحب نے وعدہ ایفا کرنے کے لیے نئی آنے والی حکومت کے کارپردازوں سے بھی رابطہ قائم رکھا۔ آخر ۱۹۹۰ء کے انتخابات سے قبل جب امیر افضل خان نگران وزیر اعلیٰ بنے تو مرحوم حاجی فضل رازق صاحب نے ان سے رابطہ کیا اور انھوں نے بونیر کو ضلع کا درجہ دینے کا اعلان کیا۔ یوں یکم جنوری ۱۹۹۱ء سے بونیر کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا اور اہلِ بونیر کی دیرینہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

خلیق و رحیم

بونیر کو ضلع کا درجہ ملنے کے بعد مرحوم جماعت اسلامی ضلع بونیر کے امیر مقرر کیے گئے۔

Marfat.com

۲۰۰۰ء تک وہ امیر ضلع رہے۔ دستور جماعت اسلامی میں ترمیم کی وجہ سے وہ امارت سے فارغ ہو گئے، مگر بحیثیت رکنِ جماعت، رکن ضلعی شوریٰ، رکن صوبائی شوریٰ اور رکن مرکزی مجلس شوریٰ ان کی خدمات مرتے دم تک جاری رہیں۔ ہمارے ساتھ وہ طویل عرصے تک مرکزی شوریٰ میں رہے۔ نہایت ہی شیریں گفتار اور خلیق و رحیم انسان تھے۔ شوریٰ میں اپنی رائے بجے تلے انداز میں پیش فرماتے اور جب فیصلہ ہو جاتا تو اسے خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیا کرتے اگرچہ یہ فیصلہ ان کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہی اسلامی شورائیت کی روح ہے۔ حاجی صاحب میں حسِ مزاح بھی خوب تھی۔ دوستوں سے گھل مل جاتے اور شستہ وشائستہ مزاح سے محفل کو پر لطف بنا دیتے۔

عوام کی نمائندگی

مرحوم کی وفات سے قبل سوات اور بونیر میں طالبان کے خلاف اے این پی کی صوبائی حکومت کی درخواست پر فوجی آپریشن جاری تھا۔ یہ آپریشن ضلع بونیر میں ۲۸/اپریل ۲۰۰۹ء کو شروع ہوا۔ کرفیو کے نفاذ اور اس کی پابندیوں سے عوام کی ناواقفیت کی بنا پر بہت سی انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔ توپوں کی گڑگڑاہٹ اور جیٹ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کی گھن گرج نے غریب عوام کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا اور لاکھوں لوگ مرد وخواتین بڑے بوڑھے اور بچے آئی ڈی پیز بن کر سوات، بونیر اور دیگر علاقوں سے مجبوراً نقل مکانی کر گئے۔ ان میں سے بیش تر لوگ مردان اور صوابی وغیرہ کے کیمپوں میں مقیم تھے۔ ۶ مئی ۲۰۰۹ء کو مرحوم نے بونیر میں بچے کھچے چند لوگوں کو جمع کر کے آپریشن کمانڈر سے ملاقات کی اور ان سے عوام کے لیے کئی سہولیات حاصل کیں، جس میں کرفیو کے دورانیہ میں کمی، بڑے ہتھیاروں کا کم سے کم استعمال، آئی ڈی پیز کو اپنی نان کسٹم پیڈ گاڑیوں کو مردان لے جانے کی اجازت اور بونیر میں گھرے ہوئے لوگوں کو اشیائے خوردنی کی فراہمی شامل تھی۔ اس ظالمانہ آپریشن کے نتیجے میں عوام عسکریت پسندوں اور فوج کے دوطرفہ مظالم میں پستے رہے۔ حاجی صاحب اس سارے عرصے میں اپنے لوگوں کے درمیان رہے اور ان کے دکھ سکھ میں شرکت کرتے رہے۔ حاجی صاحب نے عوام کی اس اذیت ناک صورت حال میں ان کو جو حوصلہ

Marfat.com

دیا اسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ اس دوران مساجد میں تقاریر کر کے لوگوں کا حوصلہ بڑھاتے، حجروں اور گھروں پر جا کر لوگوں کو تسلی دیتے رہے۔ اپنے گاؤں اور دیگر دیہات میں پہرہ داری کا نظام قائم کیا تاکہ چور، ڈاکو، خالی گھروں سے چوری نہ کرسکیں اور الحمدللہ اس عرصے میں مقامی لوگوں کے بقول پورے گاؤں اور علاقے میں اس قسم کا کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا۔

ایثار کی مثال

بونیر میں ۱۹۶۹ء سے سیاسی سرگرمیاں علی الاعلان ہونے لگیں تو مختلف سیاسی جماعتوں نے اپنے دفاتر قائم کیے۔ جب کہ حاجی فضل رازق صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ۱۹۶۹ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک ان کا ڈیرہ اور حجرہ جماعت کا دفتر رہا۔ جماعت نے دفتر کا کوئی کرایہ ادا نہیں کیا۔ نہ ہی مرحوم نے کبھی اس بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوچ اپنائی۔ مقامی کارکنانِ جماعت گواہی دیتے ہیں کہ ان کا گھر جماعت اسلامی کا باورچی خانہ اور ڈیرہ مہمان خانہ رہا۔ چھ مرتبہ قومی اسمبلی کے الیکشن میں یہی ڈیرہ الیکشن آفس رہا اور جملہ اخراجات مرحوم خود برداشت کرتے رہے۔ جب آپ امارت سے سبکدوش ہوئے تب جماعت اسلامی کے نئے نظم نے بازار کے اندر کرایے پر دفتر حاصل کیا۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی خدمات کا جماعت سے کوئی معاوضہ یا اعزازیہ کبھی وصول نہیں کیا حالانکہ انھوں نے خود کو ہمہ وقتی طور پر جماعت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جماعت اسلامی ضلع بونیر کے حالیہ مرکز اسلامی کی تعمیر کے لیے آپ ہی کی کوششوں سے مفت اراضی مہیا کی گئی اور اس کی تعمیر کے لیے اپنی جیب سے ڈیڑھ لاکھ روپے کا چندہ دے کر اپنے ہاتھ سے تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔

معمولات

مرحوم حاجی صاحب ایک خوش پوش انسان تھے ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ ہشاش بشاش رہتے، واسکٹ اور قراقلی ٹوپی ان کی پہچان تھی۔ گھر والوں کے بقول صبح گھر سے نکلتے وقت

Marfat.com

کوئی خوشبو سپرے کراتے اور اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہوتے۔ سارا دن تحریکی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود رات کو دیر سے سوتے، کیونکہ ڈیرہ پر بہت سے احباب اور مہمانان تشریف فرما ہوتے تھے۔ ڈیرہ میں مہمانوں کے ساتھ رات کو دیر تک گپ شپ لگا کر سوتے مگر صبح بہت جلد بیدار ہو جاتے اور نماز فجر کے بعد آرام فرماتے اور قدرے دیر سے گھر سے نکلتے۔ انتہائی حاضر جواب تھے۔ جنرل فضل حق نے ایک مرتبہ بے تکلفی میں مذاقاً کہا کہ حاجی صاحب آپ بہت اچھے آدمی ہیں مگر جماعت اسلامی میں ہیں، فرمایا: ''جی ہاں! آپ بھی بہت اچھے ہیں مگر فوجی وردی میں ہیں''۔ اسی طرح ایک محفل میں چند سیاسی لیڈر جمع تھے۔ ایک نے کہا: ''حاجی صاحب آپ کی داڑھی بہت چھوٹی ہے۔'' انھوں نے برجستہ جواب دیا: ''یہ چھوٹی ہے مگر بونیر کی تمام داڑھیوں کی ماں ہے۔'' ریاستی دور میں داڑھی رکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ کوئی داڑھی والا ریاست کا اہل کار نہیں بن سکتا تھا۔ ایک دفعہ کسی نے کہا کہ مولانا مودودیؒ کے پاس کسی بھی مدرسے کا سند نہیں تو آپ نے جواب دیا کہ وہ تو کسی سکول میں ملازمت نہیں مانگتے۔''

ہردل عزیز

''مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ'' مشہور زمانہ کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف اور ممتاز عالم دین'' حضرت مولانا محمد یوسف صاحب'' آف باجکٹہ (بونیر) اور حاجی فضل رازق مرحوم کی بیگمات آپس میں حقیقی بہنیں تھیں۔ وہ موضع کلپانی سے تعلق رکھنے والے عالم دین، قاضی خانم اللہ مرحوم جو والئی سوات کے دور میں تحصیل کے قاضی تھے، کی صاحبزادیاں تھیں۔ حاجی صاحب کی طرح مولانا محمد یوسف صاحب بھی جماعت کے حلقوں اور عوام کے درمیان بہت ہردل عزیز تھے۔ حاجی فضل رازق مرحوم نے بحیثیت ممبر قومی اسمبلی اپنے فرائض نہایت ایمانداری اور پوری لگن سے انجام دینے کی کوشش کی۔ اسمبلی کے فلور پر عوامی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ ملکی و قومی اور اپنے حلقہ نیابت کے عوام کے حقوق و مفادات کے لیے اسمبلی کے ڈیبیٹ میں بھرپور حصہ لیا۔ سوالات، تحاریک التوا، استحقاق کے ذریعے اہم مسائل کو زیر بحث لایا۔ مرحوم بھرپور تیاری کے ساتھ ایوان

Marfat.com

تشریف لاتے اور ہر مسئلے پر اپنے ضمیر کے مطابق ایک مومن اور دیانتدار محبِّ وطن پاکستانی اور جماعت اسلامی کے ذمہ دار فرد کی حیثیت سے اپنا نقطہ پیش کرتے رہے۔ کبھی مصلحتوں کے شکار نہیں ہوئے۔ کوئی ناجائزہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ کوئی پلاٹ اور پرمٹ حاصل نہیں کیا۔

حاجی صاحب کی پہلی پارلیمانی تقریر ۱۹۸۵ء کی اسمبلی میں بجٹ پر بحث کے دوران ریکارڈ پر آئی، جبکہ دوسری تقریر لیگل فریم ورک آرڈر (قانونی ڈھانچے) پر بھی انھوں نے اسی اسمبلی میں کی تھی۔ یہ غیر جماعتی اسمبلی تھی، اس میں جس انداز میں انھوں نے نہایت جرأت سے مارشل لا کو فوری طور پر اٹھانے کی بات کی ہے اور قومی نقطہ نظر سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ انھی کا حصہ ہے۔ یہ دونوں تقاریر افادۂ عام کے لیے اردو اور پشتو میں چھاپی گئیں اور مرحوم کے حلقے میں تقسیم ہوئیں، اس کے بعد بھی ہر موقع پر انھوں نے بطور رکن اسمبلی بہت بھرپور انداز میں حقِ نمائندگی ادا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے قبر کو نور سے بھر دے۔

متفقہ لیڈر

آپ اپنے ضلع میں اپنے حامیوں اور مخالفین میں یکساں مقبول تھے۔ سب ان کی قدر کرتے تھے ضلعی سطح پر انھی کو تمام جرگوں کا متفقہ صدر بنایا جاتا تھا، طالبان کی ایمرجنسی اور نفاذ شریعت محمدیہ کے وقت وہ ضلع بونیر کے امن کمیٹی کے صدر تھے۔ اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت ہمیشہ عدل اور انصاف کی بات کرتے اور ہر مشکل وقت میں عوام کے ساتھ کھڑے رہتے۔ اللہ کے فضل سے ہر مشکل میں کامیاب اور سرخرو ہوتے۔ ان تمام سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک زمیندار بھی تھے۔ ان کا ذریعہ معاش زراعت تھا۔ علاقے کی ایک اہم کیش فصل تمباکو ہے۔ کاشتکارانِ علاقہ کی معیشت کا بڑا دارومدار اسی فصل پر ہے۔ حکومتی کارندے اور افسران، نیز تمباکو ساز فیکٹریاں اور سرمایہ دار کاشتکاروں کا ہمیشہ استحصال کرتے ہیں مگر حاجی صاحب مرحوم نے مزارعین و زمینداروں کے حقوق کے لیے بڑا منظم اور حکیمانہ منصوبہ بنایا۔ انجمن کاشتکاران پہلے سے قائم تھی، اسے منظم کیا اور اپنی وفات تک تمباکو کاشتکارانِ ضلع بونیر کے متفقہ صدر رہے۔ آپ کی وفات سے زندگی کے

Marfat.com

بہت سے اجتماعی فورمز پر آپ کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کو قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور اس خلا کو اپنی رحمت سے پر کردے۔

بیماری اور وفات

۲۳ رمئی ۲۰۰۹ء کو مرکزی جماعت کے فیصلے کے مطابق مردان، صوابی میں آئی ڈی پیز کے کیمپوں کے دورے پر چلے گئے۔ آخری پروگرام صوابی میں شہرام ترکئی اور عثمان خان ترکئی ایم این اے کی دعوت پر ان کے کیمپوں کا دورہ کیا۔ قرآن پاک کے نسخے اور جانماز لوگوں میں تقسیم کیے، ان کو کھانا کھلایا اور مردان کے گاؤں کوتر پان میں اپنے بھتیجوں کے پاس رات گزارنے آئے، تو اسی رات کو اچانک بیمار ہوئے۔ مردان کے ہسپتال میں لے جائے گئے مگر حالت مزید بگڑ گئی تو وہاں سے پشاور لیڈی ریڈنگ ہسپتال منتقل کرنا پڑا جہاں ان کا آپریشن ہوا۔ آئی سی یو سے وارڈ میں منتقل ہوئے، قاضی حسین احمد صاحب اور دیگر قائدینِ جماعت بیمار پرسی کے لیے تشریف لائے، تو نہایت خوشگوار موڈ میں گفتگو کرتے رہے۔ چند دن ہسپتال میں رہے پھر صحت پاکر رخصت ہوگئے اور پاکستان فارسٹ انسٹی ٹیوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں آرام کرنے کے لیے چند دن مقیم رہے۔ ان کے احباب اور اہل وعیال نے ان کی خدمت اور دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ مورخہ ۲۲ رجون ۲۰۰۹ء نماز عشاء ادا کرتے وقت نماز ہی کی حالت میں دوبارہ دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے اپنے خالق حقیقی سے جاملے اور اگلے دن ۲۳ رجون ۲۰۰۹ء کو اپنے گاؤں چینہ میں ہزاروں سوگواروں کی طرف سے نماز جنازہ کے بعد سپرد خاک کر دیے گئے۔ انھوں نے پسماندگان میں ایک بیوہ، تین بیٹے، پانچ بیٹیاں، تین بھائی، سولہ بھتیجے سوگوار چھوڑے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

Marfat.com

ڈاکٹر محمد رمضان (مرحوم)

(۱۹۲۵ء-۲۰۱۰ء)

حسنِ اخلاق نعمت عظمیٰ

انسانی زندگی میں ہر شخص کو بے شمار دوست، احباب، واقفانِ حال اور شرکائے کار سے ملاقات اور تعلقات کا موقع ملتا ہے۔ بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے آپ کی پہلی ہی ملاقات ہو تو آپ کو لگتا ہے، ان سے برسوں کا تعلق ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ سالوں اشتراکِ عمل کے باوجود معاملہ محض رسمی علیک سلیک تک ہی محدود رہتا ہے۔ انسان کو جو بھی خوبی ملتی ہے وہ اللہ رب العالمین کی عطا ہوتی ہے اور جو بھی خامی اس کے حصے میں آئے، وہ اس کی ذاتی اور ماحول کی دین ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھ ناچیز کو زندگی میں دوسری قسم کے لوگوں سے بہت کم واسطہ پڑا ہے۔ ایک وسیع و عریض حلقہ، پہلی قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان کے بھی بلاشبہ درجات ہوتے ہیں اور ہر ایک فرد کا اپنا منفرد مقام ہوتا ہے۔ ''حضور پاکؐ نے فرمایا کہ انسانوں میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔'' اچھا اخلاق اللہ کی عظیم نعمت ہوتی ہے۔

پہلی یادگار ملاقات

آج اپنی یادوں کے دریچوں سے ایک بزرگ کی حسین یادوں کے پھول اور ان کی پیاری شخصیت کے کچھ موتی چن رہا ہوں۔ یہ بزرگ ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ قلعہ دیدار سنگھ میں آج سے کوئی ربع صدی قبل ملے تھے۔ پہلی ملاقات تھی مگر وہ یوں گرم جوشی سے ملے جیسے جنم جنم کا ساتھ ہو۔ وہ پہلی ملاقات اور اس کی شیرینی آج بھی سرمایۂ حیات ہے۔ یہ تھے ڈاکٹر محمد رمضان مرحوم، ہمارے عزیز دوست اظہر اقبال حسن اور قمر رمضان حسن کے والد گرامی۔ اظہر اقبال بھائی سے ان

Marfat.com

کے دورِ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی وساطت سے تعارف ہوا تھا۔ وہ کئی مرتبہ مجھ سے مل چکے تھے مگر ان کے والدِ گرامی کے متعلق مجھے کوئی معلومات اور تعارف نہ تھا۔ میں جماعتی ذمہ داریوں کے سلسلے میں قلعہ دیدار سنگھ گیا تو ڈاکٹر صاحب ملے اور ایسا معانقہ کیا کہ میں سمجھا، یہ شخص مجھے بہت عزیز سمجھتا ہے۔ ملاقات کے بعد انھوں نے بتایا کہ وہ اظہر اقبال کے والد ہیں اور مجھ سے ان کا غائبانہ تعارف بہت پہلے سے ہے۔

دل جیت لینے والے

اس یادگار ملاقات کے بعد کتنی مرتبہ شرفِ ملاقات حاصل ہوا، گننا محال ہے۔ وہ راقم سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ فیملی کی ہر خوشی اور غم میں سب سے پہلے مجھی کو اطلاع اور دعوتِ شرکت دیا کرتے تھے۔ ان سے ملاقات ہو جانے کے بعد ان کی زندگی میں جب بھی قلعہ جانا ہوا، ایک دو مرتبہ کے استثنا کے ساتھ، وہ اپنے گھر میں کھانے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ جماعت کے ذمہ داران سے انھوں نے کہہ رکھا تھا کہ یہ ہمارے گھر کا فرد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ قلعہ کے دورے سے پہلے برادر عزیز بلال قدرت بٹ صاحب کے والد مرحوم جناب قدرت اللہ بٹ صاحب نے اصرار کیا کہ ان کے گھر کھانا کھایا جائے تو سب جماعتی احباب نے یہی کہا کہ ڈاکٹر رمضان صاحب سے اجازت لی جائے۔ چنانچہ ان سے اجازت لے کر ہی یہ تواضع ممکن ہو سکی۔ پہلے پہل جب ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب اپنی کبرسنی کے باوجود خاصے چاق و چوبند اور توانا و تنومند تھے۔ اپنے کلینک پر دانتوں کے علاج اور سرجری کے علاوہ آنکھوں کا معائنہ اور ہومیوپیتھی کی پریکٹس بھی کرتے اور مریضوں کی ایک بڑی تعداد اپنی باری کا انتظار کر رہی ہوتی۔ وہ اپنے مریضوں اور گاہکوں کے درمیان انتہائی ہر دل عزیز تھے۔ اپنے پیشے میں بھی ان کی مہارت قابلِ تحسین تھی مگر ان کا اخلاقی رویہ ہر ایک کے دل میں گھر کر لیتا تھا۔ لوگ انھیں محض معالج نہیں، ایک ہمدرد و غم گسار دوست اور سرپرست بزرگ کے روپ میں دیکھتے تھے۔ ایسے معالج بلاشبہ علاج اور تربیت دونوں میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہیں اور ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

Marfat.com

ابتدائی زندگی اور تعارف

ڈاکٹر محمد رمضان ۱۹۲۵ء میں ضلع لاہور کے علاقہ للیانی (اب یہ علاقہ مصطفیٰ آباد کے نام سے تحصیل وضلع قصور میں شامل ہے) میں پیدا ہوئے۔ ان کے بچوں کے بقول ڈاکٹر صاحب کے والد محترم چودھری حسن دین کو ہر خاص وعام اور تمام رشتہ دار، اولاد، میاں جی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ اسی علاقے میں نہری پٹواری تھے، جو اپنے پیشے میں نہایت دیانت دار، ماہر، محنتی اور وسیع تجربہ کے حامل سمجھے جاتے تھے اور دور ونزدیک سے دیگر پٹواری حضرات ان سے کام سیکھنے اور کسی مشکل عقدے کو حل کرنے کے لیے بڑی امید اور عقیدت کے ساتھ ان سے ملنے آتے تھے۔ ڈاکٹر رمضان مرحوم اپنے والد کے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ ان کی زندگی، رہن سہن، وراثت وترکہ اور اہل علاقہ اس بات کے گواہ تھے کہ انھوں نے محکمہ مال کے عام اہل کاروں کے برعکس، دیانتداری سے لوگوں کی خدمت کی اور اپنی اولاد کے منہ میں حرام کا لقمہ نہیں ڈالا۔ ۱۹۷۱ء میں یہ بزرگ وفات پا گئے۔ اظہر بھائی کے بقول میاں جی مرحوم کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ڈاکٹر رمضان صاحب منجھلے تھے۔ مرحوم خود فرماتے تھے ”میاں جی میری تعلیم، محنت اور فرماں برداری پر ہمیشہ نازاں رہے اور اپنی مشفقانہ، پدری دعاؤں کے خزانے لٹاتے رہے۔ مجھے جو کامیابی بھی ملی، انھی کی دعاؤں کا ثمرہ اور اللہ کی خصوصی رحمت ہے۔“

تعلیم وہنر

ڈاکٹر محمد رمضان مرحوم نے ابتدائی تعلیم للیانی (مصطفیٰ آباد) میں حاصل کی۔ دورانِ تعلیم وہ سکول کے ہونہار اور انتہائی اطاعت شعار طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ یہیں مقامی ہائی سکول سے ۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تو ان کی خواہش تھی کہ مزید تعلیم حاصل کریں مگر ان کے والدان کو محکمہ مال میں ملازم کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ والد صاحب کی خواہش پر نہری پٹواری بھرتی ہو گئے۔ خوب محنت اور دیانتداری سے اپنے محکمے میں کام کیا اور ”میاں جی“ کے ساتھ گھر کا نظام چلانے میں ہاتھ بٹایا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے والد کے احترام میں ملازم تو ہو گئے مگر اس پیشۂ

Marfat.com

پٹوار میں دل نہ لگا کیوں کہ یہ ان کے مزاج سے مماثلت نہ رکھتا تھا، لہٰذا ملازمت سے استعفیٰ دے کر اپنے شوق و مزاج کے مطابق ڈینٹسٹ، آپٹیشنز اور ہومیو پیتھک کے تین کورس کیے۔ مرحوم بچپن ہی سے ہونہار اور محنتی تھے۔ اب بھی خوب لگن اور محنت کے ساتھ ان تینوں شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یہ تین مہارتیں حاصل کرنے پر ڈاکٹر صاحب بہت خوش تھے۔ ان کے جو رشتے دار اور احباب سرکاری نوکری چھوڑنے پر دل برداشتہ تھے، ان کو یقین دلایا کہ یہ فیصلہ بہت بہتر ثابت ہوگا اور واقعتاً ایسا ہی ہوا۔

شادی اور نقل مکانی

۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہنر اور پیشے سے باعزت معاش کا انتظام کر لیا تو ان کے والدین کو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ والدین کی مرضی سے ان کی شادی لدھے والا وڑائچ تحصیل و ضلع گوجرانوالہ میں حاجی محمد شفیع کی بیٹی ثریا خانم سے ہوئی جن کا پورا خاندان مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کے گاؤں روال (جو کہ فتح گڑھ چوڑیاں ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا) سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ بہت سے دیگر مہاجر خاندانوں کی طرح یہ بھی پہلے راوی پارک لاہور میں مقیم ہوئے اور پھر لدھے والا وڑائچ میں منتقل ہو گئے۔ اس خاندان کو ہجرت سے قبل ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں اپنے گاؤں میں اور پھر دورانِ سفرِ ہجرت راستے میں مختلف مقامات پر جو دلخراش واقعات پیش آئے، وہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی اہلیہ مرحومہ ام اظہر اقبال کے بقول ایک طویل اور دل خراش داستان ہے۔ لدھے والا وڑائچ سے متصل ایک نسبتاً بڑے اور تاریخی ٹاؤن قلعہ دیدار سنگھ میں روال گاؤں کے ہمسایہ دو دیگر دیہات سے بھی کافی خاندان ہجرت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد ڈاکٹر صاحب کا اپنے سسرالی گاؤں کے علاوہ قلعہ کے بھی بہت سے احباب سے رابطہ ہوا اور بہت جلد دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ ان میں سے کئی دوستوں نے مرحوم کو دعوت دی کہ وہ قلعہ دیدار سنگھ آ جائیں اور یہاں پریکٹس کریں۔ یہ علاقے کے دیہات کا مرکز ہے، اُس وقت بھی یہ ٹاؤن کم از کم ۱۵۰ دیہات کا مرکز تھا اور یہاں کوئی ڈینٹسٹ، آپٹیشنز

Marfat.com

اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر نہیں تھا۔ مرحوم نے اس پرخلوص اور پرکشش دعوت کو قبول کیا اور ۱۹۵۷ء میں مصطفےٰ آباد سے ایک کرائے کے مکان میں یہاں منتقل ہو گئے۔ پہلے کلینک بھی کرائے کی عمارت میں تھا۔ بعد میں گھر بھی خرید لیا اور کلینک بھی۔

مستقل مسکن

ایک محتاط اندازے کے مطابق ٹاؤن اور دیہات کا شاید ہی کوئی گھرانہ ہو، جو کبھی نہ کبھی مرحوم کے کلینک پر نہ آیا ہو۔ انھیں اپنے کام کا شوق بھی تھا اور اس قدر مہارت بھی تھی کہ لاہور، گوجرانوالہ اور دیگر دور دراز کے علاقوں سے مریض حتٰی کہ بیرون ملک برائے روزگار جانے والے لوگ بھی، خاص طور پر مصنوعی دانت لگوانے کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ انھوں نے ڈینٹسٹ کے کام کے ساتھ ساتھ آپٹیشنز اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی پریکٹس بھی شروع کر دی۔ اس وقت علاقے بھر میں صرف مرحوم ہی ان تینوں شعبوں میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ علاقے کے سرکردہ لوگوں اور عام و خواص نے ان کی صلاحیت اور ذوقِ خدمت کی وجہ سے ان کی بہت حوصلہ افزائی کی تو وہ آبائی علاقے کو مستقل طور پر چھوڑ کر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ البتہ والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے معمول میں للیانی آنا جانا رہتا۔ سب لوگوں سے میل جول، خاطر مدارات، دوستانہ اور مشفقانہ طبیعت اور خوش مزاجی کی بنا پر علاقے کے عام لوگوں کے علاوہ بہت سے موثر حضرات اور پڑھے لکھے طبقے سے بھی ان کی دوستی ہو گئی، جن میں چیئرمین بلدیہ، سیکرٹری بلدیہ، کونسلرز، سرکاری ملازمین، علمائے کرام، ڈاکٹرز، حکیم، اساتذہ کرام اور اردگرد کے سینکڑوں دیہات کے زمیندار بھی شامل تھے۔ دوسرے علاقے سے قلعہ دیدار سنگھ آنے کے باوجود علاقے بھر کے دیہات، برادریوں اور عمائدین کو یوں جانتے کہ مقامی لوگ بھی حیران رہ جاتے۔ ان کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ ان کا جنازہ اس کی گواہی کے لیے کافی تھا۔

مستقل مشاغل

اظہر اقبال بھائی مرحوم کی وفات کے بعد اپنے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

Marfat.com

کہ ''میں نے جب ہوش سنبھالا تو اباجی کو روزانہ باقاعدگی سے صبح قرآن پاک معہ ترجمہ کا مطالعہ کرتے پایا۔نمازوں کی باجماعت پابندی، احباب کی تیمارداری، مسجد کی خدمت وانتظام میں شریک ہونا۔صبح وشام کی روزانہ سیر اور گھر پر دوستوں کی دعوتوں کا اہتمام کرنا ان کا معمول تھا۔آخری عمر میں ساڑھے چارسالہ فالج کے دوران بھی ہر وقت نماز کی فکر دامن گیر رہتی اور اگر چہ مسجد جانا ناممکن ہوگیا تھا مگر گھر پر تمام نمازیں بروقت ادا کیا کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کو جوانی میں گھڑسواری کا بہت شوق تھا۔اس زمانے میں مرحوم اجلے سفید کپڑوں میں ملبوس اور سر پر کلے والی پگڑی سجائے گھوڑے پر سوار ہوتے، پہلو میں بائیں طرف تلوار لٹکاتے اور پوری شان سے نہری پٹواری کی ذمہ داری ادا کرتے۔پھر یہ ملازمت بھی ترک کر دی اور یہ معمولات بھی چھوٹ گئے۔''

ہر دلعزیزی

اظہر بھائی مزید بیان کرتے ہیں ''اباجی کے معاشرتی رویوں اور مرنجاں مرنج مزاج، پیشہ ورانہ صلاحیت اور جذبہ خدمت کی بنا پر روزانہ سینکڑوں لوگ ان کے کلینک پر ملنے کے لیے رکتے اور سلام کر کے جاتے۔ان کی اسی طبیعت وعادت کی بنا پر ان کا کلینک لوگوں کے لیے میل جول کا مرکز بن گیا تھا۔دیہاتوں کے مرد وخواتین اکثر کھانے پینے کی اشیاء، سبزیاں، اجناس، گھی، دودھ، گنے، گڑ، مرغیاں، انڈے، امرود، تربوز، خربوزے، ستو اور پیاز وغیرہ تحائف کے طور پر دے جاتے۔ہماری امی مرحومہ قرآن پاک اور اردو ترجمہ پڑھی ہوئی تھیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اسکول کا رخ نہیں کیا مگر اباجی کی ہر دلعزیزی کی بنا پر وہ علاقے بھر کی خواتین میں اچھا حلقہ اثر وتعارف رکھتی تھیں۔خواتین انھیں ڈاکٹرنی کے نام سے پکارتیں۔'' ڈاکٹر صاحب کو (بقول اظہر بھائی) لوگ تحائف پیش کرتے تھے اور ہم نے خود دیکھا کہ جواب میں ڈاکٹر صاحب بھی ان احباب کو اپنی طرف سے ضرور کوئی نہ کوئی ہدیہ پیش فرمایا کرتے تھے۔

اولاد کی تربیت

ڈاکٹر صاحب کثیر العیال تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو ۱۳ بچے عطا فرمائے جن میں سے ان کے

Marfat.com

پانچ بچے اوائل عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وفات کے وقت مرحوم نے اپنے پیچھے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں سوگوار چھوڑیں۔ ان کی اہلیہ ان سے ۱۸ سال قبل ۱۹۹۲ء میں وفات پا گئی تھیں۔ وہ بھی انتہائی خلیق و شفیق بزرگ خاتون تھیں جن کے گھر میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ انتہائی منضبط اور باسلیقہ خاتونِ خانہ تھیں۔ اللہ ان کو بھی اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ مجھ سے وہ بھی ایک ماں کی طرح محبت کرتی تھیں۔ ڈاکٹر رمضان مرحوم کی خواہش بھی تھی اور مرحومہ کی وصیت بھی کہ میں ان کا جنازہ پڑھاؤں اور لمبی دعائیں پڑھوں۔ میں ان کے جنازے میں شریک ہوا اور ان کی خواہش و وصیت کے مطابق نماز پڑھائی۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان نیک صفت میاں بیوی کو قلعہ میں ایک مثالی جوڑا قرار دیا جاتا تھا۔ ان کے بچوں کا مختصر تعارف ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

ظفر اقبال: سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ تعلیم بی کام۔ ''اعتماد انجینئرنگ لاہور'' میں پرچیز آفیسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ جماعت کے امیدوار رکنیت ہیں۔ ان کی اہلیہ پروفیسر کلثوم ظفر گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے طالبات سمن آباد میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور شعبہ اسلامیات کی سربراہ ہیں۔ بہت اچھی مدرسہ اور معلمۂ اخلاق ہیں۔ ان کا ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں جن میں سے تین لیکچرار، ایک میڈیکل کالج کی طالبہ اور ایک ابھی سکول میں زیر تعلیم ہے۔

اظہر اقبال حسن: تعلیم ایم ایس سی (آنرز) ایگریکلچر۔ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سابق سیکرٹری جنرل، سابق نائب قیم، قیم اور نائب امیر جماعت اسلامی صوبہ پنجاب، سابق سیکرٹری جنرل شہدائے اسلام فاؤنڈیشن۔ ان دنوں چاول کی برآمد کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ان کا قیام منصورہ لاہور میں ہے۔ ان کی اہلیہ زبیدہ شائستہ رکن جماعت چودھری محمد فرید صاحب (جھنگ) کی بیٹی اور خود بھی رکن جماعت ہیں اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم اے اصول الدین کیا

Marfat.com

ہوا ہے۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

طاہر اقبال: مدینہ منورہ میں ۲۵ سال سے مقیم ہیں اور ذاتی بزنس کر رہے ہیں۔ بہت کامیاب تاجر ہیں اور مدینہ جانے والے احباب اور واقفان کار کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔

قمر رمضان حسن: امیر زون قلعہ دیدار سنگھ ہیں۔ جمعیت کے امیدوار رکنیت رہے۔ اپنے والد صاحب کی طرح ڈینٹسٹ ہیں۔ رمضان آئی اینڈ ڈینٹل ہسپتال چلا رہے ہیں۔ والد مرحوم ہی کی طرح علاقے میں ہر دلعزیز ہیں اور بلدیہ کے کونسلر رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ فرخندہ ناہید ناظمہ ضلع جماعت اسلامی گوجرانوالہ رہی ہیں اور ڈسٹرکٹ و ٹاؤن اسمبلی کی ممبر بھی رہی ہیں۔ محمد یٰسین چغتائی مرحوم (کارکنِ جماعت لاہور) کی صاحبزادی ہیں۔

ثمر رمضان حسن: قمر رمضان صاحب کی طرح آپٹیشنز ہیں اور ان کے ہمراہ والد صاحب کے کام کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ جماعت کے کارکن ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

اطہر رمضان حسن: یہ بھی قمر رمضان حسن بھائی کے ساتھ ہی مقیم ہیں۔ سپیشل چائلڈ تھے۔ ڈاکٹر صاحب، دونوں میاں بیوی اپنے اس مخصوص بچے کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اب ان کے بھائی بھی اسی طرح ان سے محبت کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میرے بارے میں اسے کہا کہ یہ تمھارے بڑے بھائی ہیں۔ اطہر نے یہ بات یوں یاد رکھی کہ ہر ملاقات میں مجھے ہمیشہ بھائی جان کہہ کر مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی دونوں صاحبزادیاں بھی اللہ کے فضل سے اپنے گھروں میں آباد اور صاحبِ اولاد ہیں۔ بڑی بیٹی خالدہ کلثوم شالیمار لاہور میں ہیں اور چھوٹی روبینہ کوثر قلعہ ہی میں ہیں۔ سبھی بچے بچیاں تحریکِ اسلامی سے وابستہ اور صاحبِ اولاد ہیں (سوائے معذور بچے اطہر رمضان

Marfat.com

کے)۔ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی اور اس کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ادائیگی نماز، تلاوت قرآن، اخلاقی، تربیت، سادگی اور اچھے دوست بنانے اور اچھے مشاغل اپنانے کی خصوصی تلقین کرتے۔ گھر کی تمام خواتین کو پردہ کرنے کی مکمل پابندی کروائی۔ سب بچوں کی شادیاں بھی پڑھے لکھے اور زیادہ تر تحریکی گھرانوں میں کیں اور برادری، مسلک اور مال و اسباب کی بجائے خاندان کا دینی پس منظر ملحوظ رکھا اور لڑکیوں کی تعلیم کو ترجیح دی۔ مجھے مرحوم کے بیشتر بچوں اور پھر نواسیوں پوتوں کی شادی میں شرکت کا بارہا موقع ملا۔ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ مرحوم نے تمام شادیوں کے مواقع پر اسلامی اصولوں کی مکمل پاسداری کی۔ بروقت سارے کام کیے، نمود و نمائش اور غیر اسلامی رسوم سے بچے اور سادگی کو شعار بنایا۔

مہمان نوازی

دوست، احباب، ٹاؤن میں آنے والے نئے سرکاری ملازمین اور جماعتی قائدین کے لیے گھر پر دعوت کا اہتمام کیا کرتے۔ مہمان کو رخصت کرتے وقت تحفہ دے کر روانہ کرتے۔ ہر وقت اپنے پاس مختلف اشیا تحفہ دینے کے لیے جمع رکھتے، مثلاً عطر خوشبو، تسبیح، رومال، کھجور، آب زم زم، کپڑا، خاص طور پر مدینہ سے اپنے بیٹے طاہر اقبال صاحب سے منگوا کر اپنے پاس رکھتے۔ مہمانوں کو کوئی بھی ہدیہ دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتے۔ اپنے لیے دعا کی استدعا کرتے اور آیندہ آتے رہنے کی درخواست بھی کرتے۔ ان کے تمام بچوں میں بھی یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ مرحوم مجھے کئی مرتبہ خوشبو پیش فرماتے۔ ایک مرتبہ جیبی گھڑی دی۔ میں نے کہا کہ میں تو ہاتھ کی گھڑی بھی ترک کر چکا ہوں کیوں کہ موبائل فون نے اس سے بے نیاز ہی کر دیا ہے۔ فرمانے لگے ''میری یہ یادگار رکھ چھوڑنا، کبھی نظر پڑے تو دعائے خیر سے نوازنا۔ ایک مرتبہ فرمایا '' آپ کی گھڑی والی بات تو یاد ہے مگر آپ قلم تو خوب استعمال کرتے ہیں۔ لیجیے یہ قلم آپ کی نذر ہے۔''

جائیداد اور اس کی تقسیم

زندگی کے آخری سالوں میں مرحوم نے اپنی جائیداد بچوں کے نام منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔

Marfat.com

چنانچہ جائیداد تقسیم کرنے سے قبل مجھ سے ایک طویل مشاورت کی۔ میں نے کہا آپ کو کیا جلدی ہے۔ فرمانے لگے "جلدی کیا، اب مجھ پر نہ کوئی ذمہ داری ہے، نہ بوجھ۔ چل چلاؤ کا وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں اپنے تمام بچوں کو اپنی زندگی میں ان کا حق دے کر اس فریضے سے سبکدوش ہو جاؤں۔ میں کسی شرعی وارث کو نہ زیادہ دینا چاہتا ہوں، نہ کم۔ کسی کو اس کے حق سے محروم کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا....." میں نے کہا تمام بچوں سے بھی رائے لے لیں۔ سب راضی ہوں تو ہرج نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام جائیداد اپنی زندگی ہی میں تمام بچوں سے مشورہ کر کے اتفاق رائے سے شرعی حصص کے مطابق تقسیم کر دی۔ وفات کے وقت ان کے نام نہ کوئی جائیداد تھی اور نہ ہی کسی دوست اور رشتہ دار کا کوئی قرض ان کے ذمہ تھا۔ جوانی میں بھی انھوں نے اپنے تمام امور کو ہر لحاظ سے اور ہر وقت صاف شفاف رکھا۔

جماعت اسلامی سے تعلق

ڈاکٹر صاحب جماعت کے رکن نہ تھے مگر جماعت کے اس قدر گرویدہ اور حمایتی و معاون کہ عام آدمی یہی سمجھتا تھا کہ قلعہ میں وہ جماعت کے اہم ترین فرد ہیں۔ ان کو جماعت سے اور جماعتی ذمہ داران سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کا کلینک ہمیشہ جماعتی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ مرحوم کے بیٹے اظہر اقبال بھائی نے ان کی وفات پر لکھا

"اباجی جماعت اسلامی کے رکن نہ تھے۔ البتہ دامے درمے، سخنے وہ جماعت کے ہر کام میں شریک رہے اور جماعتی اکابر سے دلی لگاؤ رکھتے تھے۔ محترم قاضی حسین احمد صاحب، محترم حافظ محمد ادریس صاحب اور محترم خرم مراد صاحب سے تو یادگار اور والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ انھی تینوں راہ نماؤں نے مختلف اوقات میں مرحوم کے بچوں کے نکاح پڑھائے اور کئی مرتبہ گھر بھی تشریف لائے۔ جب بھی کسی سطح کے جماعتی قائدین تشریف لاتے ان کی خدمت میں تحائف پیش کرتے اور خوش ہوتے۔ محترم حافظ محمد ادریس صاحب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ہماری والدہ کا جنازہ انھوں نے پڑھایا۔ اس موقع پر اباجی نے حافظ محمد ادریس صاحب سے وعدہ لیا کہ حافظ صاحب میرا

Marfat.com

جنازہ بھی آپ ہی پڑھائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش پوری کردی۔"

مرکز اسلامی قلعہ دیدار سنگھ

جماعت اسلامی قلعہ دیدار سنگھ نے تقریباً ایک ایکڑ قطعہ زمین خریدا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مسجد، مدرسہ، ہسپتال، دستکاری سنٹر، مرکز اسلامی اور دفاتر بھی بن جائیں اور کچھ جماعتی احباب اس میں پلاٹ خرید کر اپنے ذاتی مکان بھی بنالیں تاکہ یہ مرکز بھی آباد ہو جائے اور اسلامی ماحول کی نمائندہ ایک چھوٹی سی پرامن آبادی بھی وجود میں آجائے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے بہت بڑے مؤید تھے۔ جماعتی نظم کے مرکز اسلامی کے قیام کے فیصلہ میں از اوّل تا آخر شریک رہے۔ اس کے لیے دل کھول کر تعاون کیا اور مرکز کے ساتھ والے پلاٹ خرید کر بچوں کے مکانات وہاں منتقل کر دیے تاکہ مسجد کے زیر سایہ رہیں اور مسجد کی قربت سے بچوں پر اس کے اثرات مرتب ہوں۔ زندگی کے آخری ماہ و سال مرحوم اس بستی میں مقیم رہے۔ یہیں سے ان کا جنازہ اٹھا۔ ان کی وفات کے روز مجھے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق قلعہ دیدار سنگھ میں درس قرآن اور خطاب جمعہ کے لیے حاضری دینا تھی۔ حاضری تو ہوئی، جمعہ کا خطبہ بھی بعد از نمازِ جنازہ مگر جماعت کا تربیتی و دعوتی پروگرام نہ ہوسکا۔ مرحوم کا جنازہ خود جماعت کے دعوتی و تربیتی اجتماع میں ڈھل گیا جو میرے خیال میں عام اجتماع سے زیادہ پرتاثیر تھا۔

گرفتاریاں

اسلامی جمعیت طلبہ کے جو تحریکی نوجوان اپنے دورِ طالب علمی میں مختلف تنظیمی ذمہ داریوں پر فائز رہتے ہیں۔ ان کو طوق و سلاسل اور قید و بند کے ابتلا سے بھی بار بار گزرنا پڑتا ہے اور یہ پاکستان کی ہر حکومت کے دور میں ہوتا رہا ہے، اب بھی جاری ہے۔ ان طلبہ کے ساتھ ان کے والدین کے لیے بھی یہ کٹھن مرحلے ہوتے ہیں۔ وہ والدین انتہائی قابل قدر ہوتے ہیں جو ان طلبہ کی مثبت اور تعمیری سرگرمیوں میں ہر آزمائش خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ اظہر اقبال بھائی کے کندھوں پر زرعی یونیورسٹی میں تعلیم کی دوران اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم کی ذمہ داریاں

Marfat.com

رہیں۔فروری ۱۹۸۴ء میں جنرل ضیاءالحق کے مارشل لا کے تحت طلبہ یونین پر پابندی کے خلاف احتجاج کرنے کی پاداش میں ان کے خلاف درجنوں مقدمات قائم ہوگئے۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی سے اخراج کے تین مختلف مواقع پر فیصل آباد پولیس اظہر صاحب کو گرفتار نہ کرسکی تو ڈاکٹر صاحب کو ان کے کلینک سے گرفتار کر کے لے گئی مگر انھوں نے نہایت صبر اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اظہر بھائی کو برا بھلا کہنے یا ڈانٹنے کی بجائے یہی کہا کہ بیٹا حق کی خاطر جو آزمائش بھی آئے اس پر اللہ سے استقامت کی دعا کرنی چاہیے۔مرحوم نوجوانوں کی ہمیشہ راہ نمائی فرماتے، بالخصوص اسلامی جمعیت طلبہ سے بہت محبت کرتے تھے۔اپنے بچوں کے علاوہ دیگر کارکنانِ جمعیت کے ساتھ بھی جمعیت کے کام میں حوصلہ افزائی اور مالی اعانت کرتے۔

کفایت شعاری وسادگی

مرحوم کے چوتھے نمبر پر بیٹے قمر بھائی بھی رکن جماعت بنے اور میرے دور امارتِ صوبہ میں بلدیہ کے کونسلر منتخب ہوئے۔ان کی بلدیاتی ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کے گھر اور کلینک پر اکثر لوگوں کا وقت بے وقت اپنے مسائل کے لیے چلے آنا معمول بن گیا مگر ڈاکٹر محمد رمضان صاحب کے ماتھے پر کبھی بل نہ آیا بلکہ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ان سب کا استقبال اور تواضع کرتے۔ میں نے خود دیکھا کہ وہ اس معاملے میں بڑے فراخ دل تھے۔ ہمیشہ اپنی اولاد کو رزق حلال کی تلقین کرتے۔خود بھی ساری زندگی محنت کر کے رزق حلال کمایا اور جائز کاموں پر خوش دلی سے خرچ کیا۔مرحوم کی زندگی سادگی وقناعت اور میانہ روی وکفایت شعاری کا مرقع تھی۔وہ کسی ناجائز کام کے لیے ایک دھیلہ بھی خرچ نہ کرتے تھے کیوں کہ ان کے بقول قرآن نے ایسے لوگوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔بڑی سلیم الفطرت اور سندر سوچ تھی، شیطان کے باغی، رحمان کے بندے!

علالت اور سفرِ آخرت

۲۰۰۰ء میں پہلی دفعہ فالج کا حملہ ہوا۔میں عیادت کے لیے ان کے پرانے گھر گیا تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دیر تک پکڑے رکھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے تو

Marfat.com

پورے عزم و یقین کے ساتھ کہا کہ ڈاکٹر صاحب ان شاء اللہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے اور آئندہ آپ سے کلینک پر ہی ملاقات ہوگی۔ یہ سن کر خوش ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت، علاج اور فزیوتھراپی سے حیرت انگیز طور پر وہ دنوں میں بہتر ہونے لگے۔ الحمد للہ جلد ہی صحت یاب بھی ہو گئے اور تمام معمولات شروع کر دیئے۔ اگلی ملاقات ان سے کلینک پر ہی ہوئی۔ اس بیماری اور پھر صحت مندی کے بعد عبادات میں ان کی توجہ اور فکر مندی مزید بڑھ گئی۔

بیماری کے بعد صحت

فالج کے پہلے حملے کے بعد جب صحت بحال ہوئی تو لاہور آنا جانا بھی شروع ہو گیا۔ مگر پہلے سے کم۔ مئی ۲۰۰۵ء میں فالج کا دوبارہ حملہ بائیں طرف ہوا جو خاصا سخت ثابت ہوا۔ اسی عرصے میں ان کے پوتے، پوتی اور نواسی کی شادیاں ہوئیں تو مجھے تاکیداً فرمایا کہ ان میں آپ کی شمولیت ضروری ہے۔ ظفر بھائی کے بیٹے ابوبکر اور لاہور میں مقیم ان کی ہمشیرہ خالدہ کلثوم کی بیٹی کا نکاح ۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو طے ہوا تھا۔ مجھ سے فرمایا کہ یہ نکاح آپ پڑھائیں گے۔ میں نے وعدہ کیا کہ ان شاء اللہ ضرور شریک ہوں گا۔ بعد میں اظہر بھائی سے فرمایا کہ حافظ صاحب کو یاددہانی ضرور کرانا۔ نکاح کے دن میں شادی ہال میں پہنچا تو ڈاکٹر صاحب وھیل چیئر پر بیٹھے ہال میں منتظر تھے۔ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے آہستہ سے فرمایا ''اللہ آپ کو خوش رکھے، آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ اپنے بچوں میں سے یہ میری زندگی کی شاید آخری تقریب ہے۔'' میں نے کہا ''اللہ آپ کو سلامت رکھے، آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں مگر شاید انھیں اپنی گرتی ہوئی صحت کا احساس تھا، اس لیے فرمایا'' یہاں کون ہمیشہ رہا ہے اور کسے رہنا ہے......'' ۱۵/اکتوبر ۲۰۱۰ء بروز جمعہ قلعہ دیدار سنگھ جماعت نے ایک جماعتی پروگرام کے لیے مجھ سے وقت لے رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس سے ایک شام قبل دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

آخری مرض

جیسا کہ اوپر تذکرہ ہوا ہے ۲۰۰۵ء میں دوبارہ فالج ہی کا حملہ ہوا۔ اس بیماری کے دوران

Marfat.com

ساڑھے پانچ سال بستر پر رہے۔ دن میں کبھی بیٹھ جاتے تھے۔ جمعہ کی نماز وھیل چیئر پر بیٹھ کر ادا کرنے جاتے۔ قمر بھائی نے اس ساڑھے چار سال کے عرصے میں خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کھانا کھلانا، وضو کروانا، نہلانا دھلانا۔ حتیٰ کہ خود تمام حوائج ضروریہ سے فراغت کا اہتمام کرنا، ادویات بروقت دینا، فزیوتھراپی کرنا، اٹھانا، لٹانا، بٹھانا اور واک کروانا۔ اس کے علاوہ نہایت محنت، ملائمت اور برخورداری کے ساتھ ہر لمحے ان کی دلجوئی کرنا۔ یہ سب ایسے کام تھے جن کے لیے ہر وقت ان کے پاس موجود رہنا ضروری تھا۔ قمر بھائی کا یہ بڑا امتحان تھا، انھوں نے ہر کام تج دیا اور اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ اپنی جنت کمانے میں پورے شوق و رغبت کے ساتھ منہمک ہو گئے۔ اللہ ان کو مع جملہ اہل وعیال بہترین اجر سے نوازے۔ مرحوم کے دیگر تمام بچے بچیاں بھی وقتاً فوقتاً خدمت میں حاضر ہوتے اور ہر طرح کی خدمت و دلجوئی کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اللہ نے ان تمام لوگوں بالخصوص قمر بھائی کو سرخرو کیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے بے شمار محبان و متعلقین کو غمزدہ چھوڑ کر ۱۴/ اکتوبر ۲۰۱۰ء بروز جمعرات کی رات خالقِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہو گئے۔

نماز جنازہ

اظہر بھائی نے اپنے والد مرحوم کے جنازے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ''نماز جنازہ میں ہر طبقۂ فکر، مسلک، برادری، ٹاؤن اور دیہات سے لوگوں نے جوق در جوق شرکت کی۔ ان کا جنازہ ٹاؤن کے بڑے بڑے جنازوں میں شمار ہوتا ہے۔ محترم حافظ محمد ادریس صاحب نے ان سے وعدہ کے مطابق نماز جنازہ پڑھائی اور جہری انداز میں بھرپور دعائیں کیں جن سے لوگوں میں رقت قلب پیدا ہوئی۔ اس موقع پر محترم لیاقت بلوچ صاحب، بلال قدرت بٹ صاحب اور اظہر اقبال حسن نے عوام سے خطاب کیا اور مرحوم کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ پورے ٹاؤن میں ان کی وفات کا تذکرہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کر رہے تھے اور ان کی خدمات اور کردار موضوع بحث رہا۔ علاقے بھر سے تقریباً ہر گاؤں سے لوگوں نے جنازے میں شرکت کی، جبکہ جماعت اسلامی کے کارکنان ضلع بھر سے آئے اور پنجاب کے اکثر اضلاع سے بھی احباب نے شرکت کی۔''

Marfat.com

یادوں کے دیپ

اظہر بھائی نے بالکل درست فرمایا ہے۔ گھر سے جنازہ اٹھا تو میں اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ پورے شہر کی دکانیں، بازار اور کاروبار بند تھے۔ جو دکان کھلی بھی تھی، جنازہ دیکھتے ہی دکانداروں نے بند کی اور جنازے کو کندھا دینے اور ساتھ چلنے کے لیے جنازہ گاہ کی طرف چل پڑے۔ جماعتی احباب بھی پنجاب کے بیشتر اضلاع سے شریک تھے۔ یہ جنازہ قلعہ دیدار سنگھ کی تاریخ میں منفرد تھا۔ جنازہ گاہ کی وسیع و عریض عمارت اور ملحقہ راستے اور گیلری بھر چکی تو اس کے پہلو میں کھلے میدان کے اندر بھی لاتعداد صفیں کھڑی ہو گئیں۔ لاؤڈ سپیکر کا بہت اچھا انتظام تھا۔ جماعتی ذمہ داران نے مرحوم کا ذکر خیر کافی طویل وقت تک کیا مگر مجال ہے جو کہیں سے کوئی آواز آئی ہو، مکمل خاموشی اور اطمینان کی کیفیت تھی۔ جنازہ گاہ سے قبر تک پہنچتے بھی خاصا وقت لگا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی یادیں ان گنت ہیں۔ یادوں کے یہ دیپ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ کسے کسے شمار کریں؟ چند بکھری بکھری یادیں اور اظہر بھائی کے چند تاثرات لکھ دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، ان کی انسانی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف فرمائے اور انھیں اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔ ہم سب کی منزل بھی وہی ہے، اللہ ہمیں اس کی تیاری کی توفیق و سعادت بخشے۔ آمین یا ارحم الرحمین۔

Marfat.com

مولانا احمد غفور غواص

(۱۹۵۵ء-۲۰۱۰ء)

مردِ درویش کی رحلت

جماعت اسلامی کے رکن مرکزی مجلس شوریٰ و امیر ضلع دیر پائین مولانا احمد غفور غواص ۲۲/مارچ ۲۰۱۰ءکو پچپن سال کی عمر میں دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر خلدِ بریں کو سدھار گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ مولانا احمد غفور غواص حقیقی معنوں میں ایک مردِ درویش تھے۔ وہ مولانا عنایت الرحمٰن مرحوم [سابق ایم این اے] کے شاگردوں میں سے بہت نمایاں اور قابل فخر تلمیذ ثابت ہوئے۔ مولانا عنایت الرحمان کا مدرسہ درگئی میں شائقینِ علومِ اسلامیہ کی سال ہا سال سے پیاس بجھاتا رہا ہے۔ مولانا کی وفات کے بعد بھی یہ مدرسہ دینی علوم کی تدریس و ترویج میں کوشاں ہے، اگرچہ مولانا مرحوم کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں ان کی عظیم صفات کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ خود بھی بہت متواضع، ملنسار اور خوش خلق شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہت بڑے عالم مگر طبیعت کے لحاظ سے نہایت منکسر المزاج تھے۔ یہی صفات ان کے تمام تلامذہ میں دیکھی جاسکتی ہیں، خصوصاً اس شاگردِ رشید میں تو یہ بدرجہ اَتم پائی جاتی تھیں۔ وہ کم گو تھے مگر دوستوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے! ان کے لب اور زبان کم ہلتے تھے مگر دل و دماغ اور ہاتھ پاؤں ہر وقت متحرک رہتے تھے۔ وہ ''نرم دم گفت گو، گرم دم جستجو'' کا بہترین نمونہ تھے!

بطور طالب علم راہ نما

مولانا احمد غفور غواص نے ۱۹۸۳ء میں دورۂ حدیث مکمل کرنے کے بعد رابطۃ المدارس کا امتحان پاس کیا اور شہادۃ العالمیہ کی سند حاصل کی۔ وہ جماعت اسلامی میں آنے سے قبل دورِ طالب

Marfat.com

علمی میں جمعیت طلبہ عربیہ میں شامل ہوئے اور قیادت کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بالآخر اس کے منتظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں انھیں پشتو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں تقریر کرنے میں دقت ہوتی تھی، اس کے باوجود انھوں نے اپنے دورِ قیادت میں جمعیت طلبہ عربیہ کو چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر میں منظم کرنے کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان کے اخلاص کی شیرینی زبان و بیان کی دقت کے باوجود دلوں پر دستک دیتی تھی۔ وہ دور دینی مدارس اور جامعات میں جمعیت طلبہ عربیہ کے لیے خاصا مشکل اور کٹھن تھا مگر احمد غفور غواص انتہائی پرعزم انسان تھے، جن کے اندر دھیمے مزاج اور حکیمانہ انداز کے ساتھ مشکلات میں سے اپنا راستہ بنانے کا جوہر اللہ نے ودیعت کر رکھا تھا۔ اس دور کے جمعیت طلبہ عربیہ کے رفقا ان کی خوبیوں سے واقف اور ان کی عظمت کے معترف ہیں۔ گھریلو ماحول ان کی سوچ سے متصادم تھا مگر انھوں نے کبھی کسی مرحلے پر بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ کن مشکلات کا شکار ہیں۔ ان کے گھر پر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لہراتا تھا مگر وہ خود جمعیت طلبہ عربیہ کے علم بردار تھے۔

جماعت کی رکنیت اور سلسلہ تعلیم

جمعیت سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نے فی الفور خود کو جماعت اسلامی کے سپرد کر دیا۔ وہ ۱۹۸۵ء میں جماعت کے رکن بن گئے۔ رکن بننے کے بعد مرحوم درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور اس کے ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ تدریس کے فرائض کے ساتھ ساتھ جماعتی پروگراموں میں باقاعدگی سے شرکت نظم کی مکمل پابندی کے ساتھ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے آرام کا وقت مطالعہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کم کھاتے اور کم سوتے۔ خوب محنت کی اور ۱۹۹۳ء میں پشاور یونی ورسٹی سے بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے مصر میں جامعہ ازہر کے زیرِاہتمام ائمہ و خطبا کے لیے منعقدہ ایک پچھتر روزہ کورس بھی مکمل کیا۔ افغانستان میں ان کے بہت سے دوست اور تعلیمی دور کے ہمجولی بہت اچھے اچھے ادارے بھی چلا رہے تھے اور ان میں سے کئی ایک جہاد کے میدانوں میں بھی اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ مولانا ان سے مسلسل رابطے میں رہتے

Marfat.com

تھے اور بارہا افغانستان کا سفر کر کے وہاں جہادی و علمی سرگرمیوں کو منظم کرتے رہتے تھے۔

امارتِ ضلع

مولانا احمد غفور خواص جماعت اسلامی ضلع دیر پائین کے تین مرتبہ امیر مقرر کیے گئے۔ پہلی مرتبہ ان کا تقرر ۲۰۰۳ء میں اور دوسرا تقرر ۲۰۰۵ء میں ہوا۔ دو ٹرم پوری کر لینے کے بعد مرکزی شوریٰ کے فیصلے کے مطابق ان کے بجائے ۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۸ء کی میقات میں مولانا امیر گلاب صاحب ضلعی امیر مقرر ہوئے۔ اس سیشن کے اختتام پر پھر تیسری مرتبہ مولانا احمد غفور غواص صاحب کو امیر ضلع مقرر کیا گیا اور اس تیسری میقات کے درمیان ہی مولانا صاحب کو اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ وہ اس دارِ فنا میں رہتے ہوئے دار البقاہی کے مکین نظر آتے تھے۔

ممبر قومی اسمبلی

۲۰۰۲ء کے ملکی انتخابات عام میں محترم قاضی حسین احمد صاحب دیر اور نوشہرہ سے قومی اسمبلی کے دو حلقوں میں جیت گئے۔ بعد میں انھوں نے دیر کی نشست خالی کی تو جماعت کی طرف سے ضمنی انتخاب میں مولانا احمد غفور غواص کو ٹکٹ دیا گیا۔ اس ضمنی انتخاب میں آپ قومی اسمبلی کے حلقہ این اے ۳۴ دیر پائین سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ پانچ سال ایم این اے رہنے کے باوجود مولانا اپنا ذاتی گھر نہ بنا سکے۔ بطور رکن اسمبلی مولانا کی دلچسپی کے شعبے تعلیم، صحت اور قانون تھے۔ قومی اسمبلی کی مجالس قائمہ میں بطور رکن انھوں نے معاشی اور شماریات اور ماحولیات کی کمیٹیوں میں رکنیت کے فرائض ادا کیے۔ مولانا قومی اسمبلی کے ممبر رہے مگر کبھی دولت جمع کرنے کی ہوس دل میں نہ پیدا ہونے دی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی بھر اپنا مکان نہ بنا سکے۔ وہ واقعی آخرت کے راہی تھے۔ مرحوم کو ان کے گھر کی تعمیر کے حوالے سے جب بھی ان کے دوستوں نے متوجہ کیا، انھوں نے فرمایا کہ میرے پاس وسائل نہیں ہیں کہ میں اپنا گھر بنا سکوں۔ میں نے تو خود کو ایک مسافر کی حیثیت سے میدانِ عمل میں اتارا ہے۔ وسائل ہوں گے تو گھر ضرور بناؤں گا مگر محدود

Marfat.com

ذرائع آمد میں ممکن نہ ہوا تو مجھے اس کا مکلّف بھی نہیں ٹھیرایا گیا۔ اس ملک میں یقیناً وہ واحد رکنِ قومی اسمبلی تھے جن کا اپنا مکان نہیں تھا۔ کہنے کو یہ معمولی سی بات ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ عظمت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

منصب کی نازک ذمہ داریاں

دنیا کے حریص بندے بسا اوقات ایسی تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ننگِ انسانیت ہونے کا نقشہ سامنے آجاتا ہے جبکہ بعض اعلیٰ صفات کے حامل بندگانِ خدا کا کردار دیکھ کر ''فرشتہ صفت'' اصطلاح کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسمبلی کی رکنیت کے لیے لوگ کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں مگر اس مردِ درویش کو دیکھیے۔ جماعت نے فیصلہ کیا کہ دیر کے اس حلقے سے آیندہ جماعت کے امیدوار صاحبزادہ یعقوب خاں صاحب ہوں گے تو مولانا نے یہ فیصلہ بطیبِ خاطر قبول کرلیا۔ وہ بہت مقبول جماعتی راہ نما تھے، یعقوب خاں صاحب کو اپنے ساتھ لے کر پورے حلقے میں گھومے پھرے اور ہر جگہ لوگوں سے کہا کہ اب جماعت کے امیدوار یعقوب صاحب ہیں۔ آپ سب لوگ بھرپور تعاون کے ساتھ جماعت کی کامیابی کے لیے میدان میں نکلیں۔ سیدنا عمر بن خطابؓ نے اپنی شہادت کے وقت خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے صحابہ کرام کی ایک چھ رکنی کمیٹی بنائی تھی۔ بعض ارکانِ کمیٹی نے عرض کیا کہ اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کو بھی کمیٹی کا رکن نامزد کردیں تو فرمایا ''وہ اس کا مستحق نہیں''۔ یہ بھی فرمایا کہ اگر خلافت اعزاز ہے تو بنوعدی کو مل چکا، اب دوسروں کو ملنا چاہیے اور اگر یہ آزمائش ہے [اور حضرت عمرؓ تو اسے آزمائش ہی سمجھتے تھے] تو بنوعدی یہ بار اٹھاچکے، اب دوسروں کو اٹھانا چاہیے۔'' بلاشبہ ذمہ داریاں بارِگراں ہوتی ہیں مگر بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوتا ہے۔ احمد غفور غوّاص اس کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔

جنت کے طلب گار

مولانا کے حالات کا کچھ علم تو تھا مگر بیشتر باتوں کے بارے میں ان کی وفات کے بعد ہی معلومات ملیں۔ ہمارے ایک دوست اور لاہور کے رکنِ جماعت برہان الدین عثمانی کا مولانا سے

Marfat.com

بہت گہرا، محبت بھرا دوستانہ تعلق تھا۔ کتب کی خرید وفروخت میں دونوں نے اشتراک کیا۔ عثمانی صاحب کو معلوم تھا کہ مولانا کا اپنا گھر نہیں ہے۔ ایک سال ان کے مشترکہ کاروبار میں تین لاکھ روپے منافع ہوا، جو اس وقت معقول رقم تھی۔ عثمانی صاحب نے مولانا کو پیش کش کی کہ وہ اس رقم سے اپنا مکان تعمیر کرلیں۔ اگلے سالوں میں حساب کتاب برابر کرلیں گے مگر مولانا نے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی کا کیا بھروسہ اور کاروبار میں نفع کی کیا ضمانت ہے۔ میں یہ بوجھ کندھوں پر لیے دنیا سے چلا گیا تو کیا بنے گا۔ واقعی وہ مسافر آخرت کا طلب گار اور جنت کا خریدار تھا۔ اگر آپ اس مردِ غیور کو موجودہ دور کا ابوذر غفاری کہیں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

مرا طریق امیری نہیں ، فقیری ہے !
خودی نہ بیچ ، غریبی میں نام پیدا کر !

رکنیت شوریٰ

مرکزی مجلس شوریٰ میں پہلی مرتبہ وہ ۲۰۰۳ء میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ وہ اس وقت سے مسلسل رکن شوریٰ منتخب ہوتے رہے ہیں۔ مجلس شوریٰ کے اجلاسوں کے دوران بھی انھیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ مردِ درویش دنیا کی دلچسپیوں سے بے نیاز اور آخرت کی فکر میں کھویا ہوا ہے۔ ظاہری لحاظ سے تو کئی لوگوں سے ایسا تاثر ملتا ہے لیکن اس شخص نے تو واقعتاً خود کو مسافر ہی سمجھا۔ مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں وہ تمام مباحث کو غور سے سنتے تھے اور بحث میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ جب سٹیج پر آکر کوئی بات کہنا ہوتی تو بھی نہایت جچے تلے الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیتے۔ کبھی کبھار کسی موضوع پر مختصر تبصرہ یا استفسارات کی صورت میں اپنی نشست پر ہی کھڑے کھڑے وضاحت طلب کیا کرتے تھے۔ مولانا کے اچانک اٹھ جانے سے جماعت اسلامی ضلع دیر پائین میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

خوش نصیب اور بدنصیب

دنیا میں لوگوں کی بے شمار قسمیں پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ مال مست ہوتے ہیں، کچھ حال

Marfat.com

مست۔ بعض قال مست ہوتے ہیں تو بعض جمال مست۔ خوش نصیب ہیں وہ جو مآل مست ہوں یعنی اصلی ٹھکانے کی فکر کرنے والے۔ مال مستوں کو ایمان وضمیر فروخت کرنا پڑے تو مال کے لیے وہ یہ رذالت کر گزرتے ہیں۔ حال مست اپنی ہی دنیا میں من مانیاں کرتے اور عیش کوشی سے باہر نکلنے کے روادار نہیں ہوتے۔ قال مست اپنے شعر، اپنے خطاب اور اپنی مجلس آرائی کی تعریفیں سننے کے نشے میں مخمور رہتے ہیں جبکہ جمال مست اپنی ٹیپ ٹاپ، جوتے، لباس، گاڑی اور محل کی پوجا میں مبتلا رہتے ہیں۔ مآل مست وہ ہیں جن کی نظر میں یہ دنیا مسافر خانہ ہے اور اصل گھر اگلا جہاں ہے۔ وہ اس دائمی وابدی گھر کی آرائش وزیبائش کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں اور ہر تکلیف اور نقصان خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے ہیں مگر اصلی گھر کی بربادی و ویرانی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ احمد غفور غواص اس آخری قسم کے نمائندہ تھے۔ حضرت علیؓ امیر المومنین تھے مگر درویش و فقیر! انھوں نے کتنی عظیم بات کہی ہے ۔

رضینا قسمة الجبّار فینا

لنا علمٌ و للجھالِ مالٌ

یعنی ''رب جلیل وجبار کی تقسیم پر ہم راضی ومطمئن ہیں کہ ہمیں علم بخشا اور جہلا کو مال'' مرحوم احمد غفور بھی اسی شعر کا مصداق تھے۔ حق تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

روشن قبریں

مولانا کا خاندان نہ صرف یہ کہ جماعتی نہیں تھا بلکہ ان کے بھائی اور دیگر رشتے دار پیپلز پارٹی میں سرگرم کارکن تھے۔ مولانا اپنی زندگی میں ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے رہے لیکن انھوں نے اپنی ڈگر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ مولانا زندگی میں جو کام نہ کر سکے، خدا کی قدرت کہ ان کی اچانک موت نے وہ کام کر دکھایا۔ وفات کے بعد ان کے لیے لوگوں کی والہانہ محبت اور خلقِ خدا کی نیک گواہیوں نے مرحوم کے عزیز واقارب کو بھی ہلا کر رکھ دیا اور ان کے اندر ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی۔ شنید ہے کہ اب وہ سب جماعت کی طرف راغب ہو گئے ہیں بلکہ بعض

Marfat.com

نے تو کھل کر یہ اعلان کیا ہے کہ وہ مولانا کے اس نیک مشن کو آگے بڑھانے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو استقامت عطا فرمائے۔ سچ ہے کہ کچھ لوگ زندگی میں بھی چلتے پھرتے لاشے ہوتے ہیں اور کئی لوگوں کی قبریں بھی زندہ ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے قیمتی اور انمول ہیرے زندگی بھر بے درد زمانے کی بے رخی اور ناقدری کا شکار رہتے ہیں۔ جب آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں تو زمانہ ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ یہی نہیں کئی نایاب موتی تو پردہ پوش ہو جانے کے بعد بھی دنیا والوں کی بے بصیرتی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔

اسی کو ناقدریٔ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا!

زندہ و متحرک جماعت

مولانا کے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ غالباً چھ بیٹے ہیں اور چھ ہی بیٹیاں ہیں۔ اللہ ان سب کی حفاظت فرمائے اور ان کو اپنے عظیم والد صاحب کا سچا جانشین بنائے۔ جماعت کے مقامی ساتھیوں نے اپنے اس درویش صفت قائد کی وفات کے بعد ایک اچھا فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ مولانا کی فیملی کے لیے گھر تعمیر کریں گے اور ان کے بچوں کی تعلیم اور دیگر ضروریات کے لیے خود کفالتی سکیم شروع کریں گے۔ یہ جماعت کے دوستوں کی بہت اچھی سوچ ہے اور اس بات کی علامت بھی کہ جماعت کوئی منجمد قسم کی تنظیم نہیں بلکہ فعّال اور متحرک لوگوں کی ایک زندہ جماعت ہے۔ ضلعی جماعت کے اکثر قائدین و کارکنان کا کہنا ہے کہ مولانا کی بے لوث قیادت کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ وہ جو فیصلہ فرما دیتے، سب لوگ خوش دلی سے اس کی پابندی کرتے۔ یہ خوبیاں مولانا کے لیے توشۂ آخرت اور صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس درویشِ خدا مست، مخلص بندے کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے اہل و عیال کی جملہ ضروریات کا خود انتظام فرما دے۔

Marfat.com

حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفیؒ

(۱۹۳۵ء-۲۰۱۱ء)

شیریں مقال بزرگ کی رحلت

۲۲ر جنوری ۲۰۱۱ء کے دن یہ اندوہناک خبر ملی کہ مشہور محدث وفقیہ اور مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ حضرت اشرفی صاحب سے دورِ طالب علمی ہی سے غائبانہ تعارف تھا۔ بعد کے ادوار میں یہ تعارف بلکہ تعلق مزید گہرا اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔ ان کی وفات سے یک لخت یہ احساس دل و دماغ میں راسخ ہوگیا کہ ایک انتہائی حلیم وشفیق بزرگ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفی مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ مرنجاں مرنج کی یہ اصطلاح ہمارے دور میں طبقۂ علما میں سے جن شخصیات پر سب سے زیادہ منطبق ہوتی ہے، ان میں مرحوم کا اسمِ گرامی صف اول میں آتا ہے۔ وہ شیریں کلام، متبسم رو، صلح جو اور اتحادِ امت کے زبردست مویّد و داعی تھے۔ آج امت ان جیسی شخصیات کی از حد محتاج ہے۔ مولانا عبدالرحمان مرحوم ومغفور حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندِ ارجمند تھے۔

آبائی علاقہ

اشرفی صاحب کے والد حضرت مولانا مفتی محمد حسن کا آبائی علاقہ ضلع راولپنڈی تھا۔ آپ کا آبائی مولد حسن ابدال کے قریب سات آٹھ میل کے فاصلے پر قصبہ مل پور ہے۔ آپ کے والد (عبدالرحمان اشرفی صاحب کے دادا) حضرت مولانا مفتی اللہ داد علاقے کے معروف عالمِ دین، محدث اور مفسر تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی۔ سنگ جانی، مکھڈ شریف (اٹک)

Marfat.com

اور ڈھینڈہ (ہزارہ) کے مدارس میں بالترتیب قاضی محمد نور صاحب، قاضی گوہر دین صاحب اور مولانا محمد معصوم صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے اور پھر مدرسۂ غزنویہ امرت سر اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تصوف و طریقت اور روحانیت کا فیض حاصل کیا اور انھی کی نسبت سے اپنے اداروں کے نام رکھے اور خود کو اشرفی سے ملقب کیا۔

پاکستان کی حمایت

مفتی محمد حسن صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد امرت سر ہی کو اپنا مستقر بنالیا۔ امرت سر ان کا دوسرا وطن بن گیا۔ یہاں جامعہ نعمانیہ قائم کی۔ اسی شہر میں ان کے تمام بچوں کا بچپن گزرا۔ اپنے روحانی استاد اور مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہدایت کے مطابق مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے زبردست حامی و مؤید تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرکے لاہور تشریف لے آئے اور نیلا گنبد میں جامعہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفی اپنی نجی مجلسوں میں بے تکلف دوستوں سے اپنے بچپن اور امرت سر کی یادوں کا تذکرہ کرتے تو بہت دلچسپ واقعات سامنے آتے تھے۔ امرت سر سے آنے والے مہاجرین کو خانوادۂ اشرفیہ کی علمی خدمات کی وجہ سے تمام ارکانِ خانوادۂ اشرفیہ سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ علمائے دیوبند میں سے جن حضرات نے جمعیت علمائے ہند کے موقف کے علی الرغم تحریک پاکستان کی حمایت کی، ان کا یہ کارنامہ یادگار اور تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دیگر اکابرِ دیوبند کے اکھنڈ بھارت کے حق میں انتہائی مضبوط موقف کے خلاف ابنائے دیوبند کا کوئی موقف اپنانا معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ قائداعظم بجا طور پر ان اکابر بالخصوص حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے مدّاح اور ان کی خدمات کے دل و جان سے معترف تھے۔ حضرت مفتی محمد حسنؒ بھی اس قافلے کے اہم رکن تھے۔ یہ علما پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے تھے مگر قائداعظم

Marfat.com

کے اخلاص کے باوجود ان کی جیب کے کھوٹے سکوں نے اس پاک دھرتی کو پاکیزگی سے دور رکھنے کے لیے ہر حربہ اختیار کیا۔

''بیبا کاکا''

مولانا عبدالرحمان صاحب کے بچپن کے ساتھی اور خاندان کے بزرگان، برادر بزرگ مولانا مفتی عبید اللہ دامت برکاتہ، برادرِ اصغر حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی حفظہ اللہ اور دیگر احباب نے بتایا کہ بچپن میں حضرت اپنے والدین کے چہیتے اور ناز پروردہ تھے مگر طبیعت میں اس دور میں بھی شوخی، شرارت اور کھلنڈرا پن بالکل نہ تھا۔ وہ سنجیدہ اور متین تھے۔ تعلیم سے شغف مثالی اور بزرگان کی مجالس میں استغراق قابلِ رشک تھا۔ انھیں ان کی والدہ مرحومہ اور دیگر بزرگانِ خاندان ان کی شرافتِ طبع اور نفیس اخلاق کی وجہ سے ''بیبا کاکا'' کہتے تھے۔ پنجابی زبان میں ''بیبا'' کا جو مفہوم ہے، اسے اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں البتہ یہ شرافت و نجابت کی اعلیٰ منزل کا پتا دیتا ہے۔ یہ خطاب مرحوم کی عظمت و پرکشش شخصیت کو بھی واضح کرتا ہے۔ بعد کے ادوار میں بھی حضرت کی جلالتِ علمی کے باوجود ان کی شخصیت میں بچوں جیسی معصومیت ہمیشہ نمایاں رہی۔

علم سے شغف

مولانا عبدالرحمان صاحب بچپن ہی سے تعلیم اور مطالعے کا قابل رشک ذوق رکھتے تھے۔ مولانا فضل الرحیم اور ان کے دیگر چھوٹے بھائی اور ہم جولی قدرے شوخ اور کھلنڈرے تھے۔ بچپنے میں اکثر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اشرفی صاحب کو ان کے مطالعے کے دوران اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کئی طریقے اختیار کرتے مگر مرحوم اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ وہ ملائمت کے ساتھ بس اتنا ہی فرماتے ''یار تنگ نہ کرو، باہر جا کر کھیلو۔'' حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفی صاحب کی رحلت کے بعد جب میں تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو مولانا فضل الرحیم صاحب نے اپنے عظیم مرحوم بھائی کے بچپن کے کئی واقعات سنائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کے اندر عمر کے ابتدائی حصے ہی میں اللہ نے سنجیدگی، للّٰہیت اور شوقِ علم کی صفات پیدا فرما دی تھیں۔ زندگی

Marfat.com

کے آخری لمحات تک ان کی پرکشش اور شیریں شخصیت میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود رہیں۔ وہ جس شخص سے بھی بات کرتے، اسے احساس ہوتا کہ اس کے ایک محبّ و شفیق دوست یا بزرگ اس سے ہم کلام ہیں۔ وہ اجنبیوں کے ساتھ بھی اپنائیت کا مظاہرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہی اخلاق نبوی کا اتباع ہے۔

عقیدت میں اضافہ

حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفی صاحب سے یادگار ملاقاتیں رہیں۔ مجھے ان کے والد گرامی قدر حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ بانی جامعہ اشرفیہ کو دیکھنے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ وہ ۱۹۶۱ء میں کراچی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہاں وہ اپنے بیٹوں مولانا عبید اللہ اور حافظ فضل الرحیم کی حج سے واپسی پر ان کا استقبال کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ صحت اچھی نہیں تھی۔ جانا بھی نہیں چاہتے تھے مگر شاید اجل مسمّٰی اور ارضِ موت نے اس سفر پر مجبور کر دیا۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ ان کا تذکرہ میں نے خاندانی اور جماعتی بزرگوں سے بارہا سنا تھا۔ میرے دل میں بچپن ہی سے ان کے ساتھ بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ ہمارے ایک جماعتی بزرگ نے ایک واقعہ سنا کر میری اس محبت و عقیدت میں اور اضافہ کر دیا۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر جامعہ پنجاب اولڈ کیمپس میں اپنے دور طالب علمی کے دوران جمعہ کی نماز اکثر جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد میں پڑھا کرتا تھا۔ یہاں مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ خطیب ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی کبھار حضرت مفتی صاحب کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے بارے میں جو واقعہ اپنے تحریکی بزرگ حضرت حافظ نور احمدؒ (گڑھی شاہو والے) کی زبانی سنا تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تذکرہ قندِ مکرر کے طور پر یہاں کر دوں۔ میں اپنی کتاب چاند اور تارے میں پہلے بھی یہ لکھ چکا ہوں۔

مطالبۂ اسلامی دستور

”میں شیخ زائد ہسپتال میں زیر علاج بزرگ رکنِ جماعت حافظ نور احمد صاحب کی عیادت کے لیے حاضر ہوا تو مرحوم کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ صحت و عافیت کا حال احوال معلوم کرنے کے

Marfat.com

بعد جو باتیں شروع ہوئیں تو قیام پاکستان کے بعد اسلامی دستور مہم کا تذکرہ چل نکلا۔ حافظ صاحب ان دنوں نئے نئے ہجرت کر کے پاکستان وارد ہوئے تھے۔ اس مہم کے حوالے سے بتانے لگے کہ جماعت کے وفود مختلف علما کے پاس جاتے تھے اور اسلامی دستور کے حق میں تیار کردہ محضر نامے پر دستخط کی درخواست کرتے تھے۔ کئی علما نے دستخط کرنے سے معذرت کی مگر کئی جید علماء نے کھل کر حمایت کی۔ ان میں حافظ صاحب نے خاص طور پر مفتی محمد حسن صاحبؒ کا ذکر کیا جن کے پاس جماعت کا وفد پہنچا تو نیلا گنبد کے مدرسے میں حضرت تشریف فرما تھے۔ اس وقت ان کے پاس ایک اور عالم دین بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جب محضر نامہ مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا تو جماعت اسلامی کا نام دیکھتے ہی مفتی صاحب کے مہمان آگ بگولہ ہو گئے اور مولانا مودودیؒ کے خلاف بولنے لگے۔ یہ سنتے ہی مفتی صاحب نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے خاموش کروایا اور اپنے مخصوص دھیمے انداز میں فرمانے لگے۔ ''بھائی صاحب یہ لوگ آپ کے پاس آئیں گے تو جی بھر کے انھیں برا بھلا کہہ لینا۔ اب یہ میرے پاس آئے ہیں مجھے ان سے معاملہ کرنے دو۔'' یہ کہہ کر محضر نامہ ہاتھ میں لیا، قلمدان سے قلم اٹھایا اور فوراً دستخط فرما دیئے۔ پھر وفد کے ارکان کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے کہ مجھے بھی اس کار خیر میں شریک کر لیا ہے۔ مودودی صاحب کو میرا اسلام کہنا۔'' (چاند اور تارے، ص ۱۰۶-۱۰۷)

پہلی ملاقات کا شرف

یہ واقعہ سننے کے بعد میرے ذہن میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا احترام اور ان کی عظمت دوبالا ہو گئی۔ میں نے حضرت کی مسند اور نشست، ان کا وہ قلم دان اور لکڑی کی بنی ہوئی چوکی بھی بعد کے دور میں نیلا گنبد میں دیکھنے کی سعادت حاصل کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سامنے بیٹھے ہوں اور یادداشت پر دستخط فرما رہے ہوں۔ میں نے نیلا گنبد میں تو بارہا دورِ طالب علمی میں نمازِ جمعہ ادا کی تھی۔ بعد کے ادوار میں مجھے مرشد مودودی کے ساتھ ایک دو مرتبہ جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ میں بھی نماز جمعہ ادا کرنے کا شرف

Marfat.com

حاصل ہوا۔ یہاں کے خوب صورت خطیب اور خوش مقال مقرر جناب عبدالرحمان اشرفی صاحب کو پہلی بار قریب سے دیکھا تو دل میں ان کی قدر اور کشش محسوس ہوئی۔ نماز کے بعد یہ خوب صورت خطیب حضرت مولانا مودودیؒ سے ملنے کے لیے ان کی گاڑی کے پاس آئے تو میں نے دیکھا کہ مولانا نے ان سے بہت محبت کے ساتھ مصافحہ کیا۔ ایک دوسرے کا حال احوال اور خیریت دریافت کرنے کے بعد دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کو دعائیں دیں۔ یہ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ اس سے قبل ان کو بعض مواقع پر دور سے سٹیج پر دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو بارہا مولانا سے جامعہ اشرفیہ میں، منصورہ میں ملاقاتیں ہوئیں اور دیگر کئی مقامات پر کانفرنسوں، جلسوں اور مذاکروں میں اکٹھے شرکت کا موقع ملا۔ وہ ہر مجلس میں اتحادِ امت اور مسالک کے درمیان محبت و ہم آہنگی کی بات کیا کرتے تھے۔ ان کی گفت گو میں قرآن و حدیث اور سیرتِ طیبہ، سیرتِ صحابہ کے واقعات کثرت سے سماعت نواز ہوتے تھے۔ وہ دھیمے انداز میں بات کرتے اور سامعین کے دلوں میں اتر جاتے۔ یہ فقرہ اب زبانِ زد عام ہے کہ اپنا مسلک چھوڑو نہیں اور دوسرے کے مسلک کو چھیڑو نہیں۔ تاریخی طور پر یہ فقرہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے منسوب ہے مگر میں نے پہلے پہل یہ فقرہ حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفی صاحب کی زبان سے سنا تھا۔

اتحادِ امت کا داعی

آپؒ اتحادامت کے بہت بڑے داعی تھے، اہل سنت کے تمام مسالک کے اتحاد کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ بریلوی و دیوبندی اختلافات بعض وجوہات سے اور بعض مناظر پیشہ مقررین کی بے اعتدالیوں سے وقتاً فوقتاً ابھرتے رہے ہیں۔ اشرفی صاحب صلح جو عالم دین تھے۔ امت کے اتحاد کے لیے انھوں نے انتہائی کوشش و محنت کے ساتھ ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء کو دیوبندی اور بریلوی علماء و اکابرین کو اکٹھا کیا۔ پھر ان کے درمیان باہمی اتحاد و اتفاق، پاکستان اور عالم اسلام میں اسلامی نظام کے عملی نفاذ، پوری دنیائے اسلام میں نظامِ خلافت کے احیا اور اپنے گروہی تشخص (بریلوی و دیوبندی) ختم کر کے صرف اہل سنت والجماعت کہلانے پر آمادہ کیا۔ اس مقصد

Marfat.com

کے لیے مرحوم نے ایک تاریخی، تحریری معاہدہ کرایا۔ اس معاہدہ پر اہل سنت والجماعت دیوبندی و بریلوی علماء واکابرین، مولانا مفتی محمد حسین نعیمیؒ، مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مولانا عبدالستار نیازیؒ، مولانا محمد عبیداللہ صاحب، مفتی عبدالقیوم ہزارویؒ، مولانا عبدالرحمٰن اشرفیؒ، مفتی غلام سرور قادریؒ، مولانا محمد اجمل خانؒ، پیر سید یعقوب شاہؒ و دیگر علما کے دستخط موجود ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن اشرفیؒ ایک سچے عاشق رسول تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیتے ہوئے عقیدت و محبت سے آبدیدہ ہو جاتے۔ جمعۃ المبارک کو بعد از نماز عصر جامع مسجد حسن میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ درود شریف کی محفل ہوتی تھی۔

مہمان نواز، صلح جو

حضرت مولانا کے پاس کئی مرتبہ حاضری کا موقع ملتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ جامعہ کے دفتر کی بجائے حضرت مولانا عبدالمالک صاحب کے ساتھ ان کے درِ دولت پہ بھی حاضری دی۔ وہ بہت مہمان نواز اور محبت کرنے والے تھے۔ ہمارے انکار اور ان کی اپنی مصروفیت کے باوجود اصرار کے ساتھ چائے پلانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ شام کے اوقات میں ان کے پاس ان کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد بچوں کو دم کرانے، بیماروں کے لیے دعائے صحت کرانے، مشکلات میں اللہ کی مدد کے لیے وظائف معلوم کرنے اور تعویذ حاصل کرنے کے لیے موجود ہوتی تھی۔ وہ سب کی بات غور سے سنتے اور شیریں کلامی سے ہر ایک کو جواب مرحمت فرماتے تھے۔ حلم ان کی شخصیت کا حصہ تھا اور ہر ایک سے حسنِ سلوک ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ مسلک کے قائل ضرور تھے مگر اس کو بنیاد بنا کر نفرتوں کی دیواریں کھڑی کرنا ان کی لغت میں شامل نہ تھا۔ وہ بارہا مجالس علما میں برملا کہا کرتے تھے کہ بریلوی علما کو توحید پر تقریر کے لیے آپ دعوت دیں تو دیکھیں کہ ماشاءاللہ وہ کیسے شاندار انداز میں توحید کے حق میں دلائل پیش کریں گے۔ دیوبندی علما کو بزرگان دین کی زندگیوں پر روشنی ڈالنے کے لیے کہیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ وہ کس طرح ان عظیم ہستیوں کو ہیرے موتیوں میں تولتے ہیں، علمائے اہل حدیث کو حب رسول اور عشقِ نبی کے موضوع پر دعوتِ خطاب

Marfat.com

دیں تو معلوم ہوگا کہ حبِّ رسول کے وہ درِّ نایاب ان کی زبان سے نکل رہے ہیں کہ جو بے مثال ہیں۔فرماتے تھے کہ ہمارے علما کے درمیان بُعد محض غلط فہمیوں کی وجہ سے ہے ورنہ مشرکات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے فروعی اختلافات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

خدمتِ خلق

آپ انسانیت کے خیر خواہ اور خلقِ خدا کے خادم تھے، سچی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں دین کا تصور، نیکی کی پہچان اور الاھمّ فالاھمّ کا تفقہ بالکل دھندلا گیا ہے۔ہم حقوق العباد کی اہمیت سے نابلد ہو چکے ہیں۔کئی لوگ نفلی عبادات میں یوں مستغرق ہوتے ہیں کہ فرائض سے لاتعلقی اختیار کر لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مالداروں کے مال میں غربا و مساکین کا جو حق ہے، وہ ان تک نہیں پہنچ پاتا۔مولانا اشرفی مرحوم و مغفور کو اللہ نے یہ شعور خوب بخشا تھا۔وہ غریب و مستحق افراد اور طلبہ کی ہر ممکن مدد کرتے۔بندگانِ خدا کی تکلیف پر تڑپ اٹھتے اور ان کے لیے رو رو کر دعائیں کرتے۔معاشی تنگی اور قرض کے بوجھ تلے دبے افراد کی طرف سے خودکشی کے جواز کا فتویٰ پوچھنے پر بے قرار ہو جاتے۔اسی طرح زلزلہ زدگان اور متاثرینِ سیلاب کے جانی و مالی نقصان پر انتہائی پریشان و مضطرب ہو کر خطبات جمعۃ المبارک اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ آپؒ نے پاکستان سمیت پوری دنیا میں اعلان کر دیا کہ ان حالات میں مسلمان نفلی حج و عمرہ میں اربوں روپے خرچ کرنے کے بجائے ان مصیبت زدگان اور خودکشیوں پر مجبور لوگوں کی مالی مدد کریں۔اس سے حج و عمرہ سے کئی گنا زیادہ ثواب ملے گا، آپؒ فرماتے تھے کہ پاکستان میں غربت و سفید پوشی کی وجہ سے ماں باپ اپنی بچیوں کی شادی کے معاملے میں شدید پریشان ہیں۔جوان بچیاں بڑھاپے کی جانب بڑھ رہی ہیں۔شادی کے لیے ان کی مالی مدد کرنا خدا کو راضی کرنے اور جنت کے حصول کا آسان اور یقینی ذریعہ ہے۔

اتفاقات

بعض اوقات انسانی زندگی میں عجیب و غریب اتفاقات و واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

ستمبر ۱۹۹۶ء کی بات ہے، محترم قاضی حسین احمد صاحب کی دعوت پر پشاور میں تمام مسالک کے علما و دینی عمائدین کا ایک اجلاس بلایا گیا تھا۔ اتحادِ امت کے اس اجلاس میں مسالک کے مشہور زعما کے علاوہ معروف دینی درسگاہوں کے ذمہ داران نے بھی شرکت کی۔ اجلاس کے بعد ہم لوگ واپس عازمِ لاہور ہوئے۔ پشاور ائیر پورٹ سے شام کی پرواز کے ذریعے ہمیں لاہور آنا تھا۔ ہم لوگ ائیر پورٹ پر وی آئی پی لاؤنج میں جہاز کے انتظار میں بیٹھے تھے، جہاز کچھ لیٹ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ شیخ الحدیث والقرآن مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، حضرت مولانا عبدالمالک صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمان اشرفی صاحب اور یہ راقم اکٹھے ایک کونے میں صوفوں پر بیٹھے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ سندھ اسمبلی کے رکن، سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے صاحبزادے اور اس وقت کی وزیر اعظم بےنظیر بھٹو کے چھوٹے بھائی میر مرتضٰی بھٹو (چیئر مین الذوالفقار) دو تین ساتھیوں کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئے۔ موصوف صوبہ سرحد کا دورہ مکمل کر کے واپس کراچی جا رہے تھے۔ انھوں نے ہماری طرف دیکھا تو سینے پہ ہاتھ رکھ کر، سر جھکاتے ہوئے سلام کہا۔ ہم نے بھی ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیا۔ وہ دوسرے کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہمارا اور مرتضٰی بھٹو کا یہاں اکٹھے ہو جانا ایک اتفاقی واقعہ تھا۔

سائیں شکریہ!

مولانا اشرفی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ یہ صاحب کون ہیں؟ میں نے کہا ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا بیٹا مرتضٰی بھٹو ہے۔ مولانا اپنے معمول کے مطابق تسبیح پر ذکر کر رہے تھے۔ فرمانے لگے ”میں چاہتا ہوں کہ اس کو اپنی یہ تسبیح دوں۔“ میں نے کہا بہت اچھا ارادہ ہے، وہ یقیناً خوش ہوگا۔ فرمانے لگے آئیں آپ بھی میرے ساتھ چلیں، چنانچہ ہم دونوں اپنی نشستوں سے اٹھ کر اس جانب گئے۔ مسٹر مرتضٰی بھٹو نے ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو متوجہ ہوگئے اور ہم قریب پہنچے اور سلام کیا تو اٹھ کر سندھی انداز میں ہم سے جھک کر ملا۔ میں نے کہا ”سائیں یہ ہمارے مرشد و حضرت مربی مولانا اشرفی صاحب ہیں اور آپ کی خدمت میں تسبیح پیش کرنا چاہتے ہیں“۔

Marfat.com

نوجوان بھٹو نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور تسبیح لیتے ہوئے کہا ''سائیں بہت شکریہ بہت شکریہ''

نوجوان باپ کم سن اولاد

تسبیح دے کر ہم واپس مولانا عبدالمالک صاحب کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی حضرت مولانا اشرفی فرمانے لگے ''میں نے اس کے والد کو بھی ایک مجلس میں تسبیح پیش کی تھی۔'' یہ سن کر بے ساختہ میں نے کہا ''حضرت پھر تو آپ نے ٹھیک نہیں کیا، اس بے چارے کے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ایک نوجوان فلسطینی خاتون اس کی اہلیہ ہے......'' میں نے تو محض مزاح میں یہ بات کہی تھی جو آئی گئی ہوگئی۔ اس ملاقات کے وقت ماہِ ستمبر کا وسط تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس ملاقات کے سات آٹھ دن بعد بے چارا مرتضٰی بھٹو اپنی بہن کی حکومت ہی میں ۲۰/ستمبر ۱۹۹۶ء کو کراچی میں قتل کر دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۴۲ سال تھی۔ عجیب بات ہے کہ الذوالفقار کے تحت جب وہ جلاوطنی میں زندگی گزار رہا تھا، اس کی تنظیم نے پی آئی اے کا ایک طیارہ اغوا کیا اور کابل لے گئے۔ ایک مسافر لیفٹیننٹ طارق رحیم کو ہائی جیکروں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس پر مارشل لا عدالت نے دیگر لوگوں کے ساتھ مرتضٰی بھٹو کو بھی دہشت گردی کے تحت غیر حاضری میں ۱۹۸۱ء میں سزائے موت سنا دی۔ ضیا الحق کے طیارے کے حادثے کے بعد نوجوان بھٹو واپس پاکستان آ گیا۔ اس کی سزائے موت کالعدم ہوگئی کیوں کہ اس کی زندگی ابھی باقی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں زندگی کی مہلت ختم ہو چکی تھی، سو بظاہر موافق حالات کے باوجود موت نے آلیا۔ اسے کراچی میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس کی زندگی ختم کرنے کا الزام اس کے بہنوئی آصف علی زرداری پر لگا۔ موصوف کئی سال جیل میں بھی رہے اور آخر محترمہ بے نظیر کے قتل کے بعد ۲۰۰۸ء میں این آر او کے تحت ان کی رہائی عمل میں آئی۔

تسبیح؟

مرتضٰی بھٹو کے قتل پر میں نے تسبیح کا یہ واقعہ ایک مضمون میں لکھا تو ایک ستم ظریف نے مجھ سے کہا کہ مولانا سے درخواست کریں کہ فلاں اور فلاں کو بھی تسبیح دیں۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی مگر جب

Marfat.com

بے چاری بے نظیر بھی ۲۰۰۷ء میں بے دردی سے قتل کر دی گئی تو اچھے حافظے کے مالک دو تین افراد نے پھر اس تسبیح کا حوالہ دیا اور کہا کہ محترمہ جو تسبیح پڑھا کرتی تھیں، وہ بھی کہیں مولانا اشرفی صاحب نے تو نہیں عطا فرمائی تھی۔ میں نے کہا ''خدا کا خوف کرو'' جب میں نے مولانا سے کہا تھا کہ مرتضیٰ بھٹو بے چارا ابھی جوان ہے تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ ایک ہفتے کے اندر ہی یہ سانحہ پیش آ جائے گا۔ میں نے تو ہلکے پھلکے موڈ میں ویسے ہی مزاحاً یہ بات کر دی تھی۔ موت وحیات کا نظام خالقِ ارض وسما کے ہاتھ میں ہے بے چاری تسبیح یا دنیا کی کوئی طاقت اس معاملے میں کیا کر سکتی ہے۔ فیصلہ تو اوپر ہی سے ہوتا ہے مگر کئی لوگ خون اپنے سر لینے کا جرم کر گزرتے ہیں! من چلے اور من موجی لوگوں کی ہمارے معاشرے میں کمی نہیں۔ اب بھی کئی لوگ ملاقات ہونے پر کہتے ہیں کاش حضرت مولانا اپنی رحلت سے قبل ایک تسبیح اور بھی دے جاتے۔ آپ ان کا اشارہ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے؟

مثالی جنازہ

مولانا اشرفی صاحب کے جنازے میں شرکت کے لیے ہم لوگ منصورہ سے جامعہ اشرفیہ گئے تو ہزاروں کی تعداد میں ان کے عقیدت مند، شاگرد اور احباب جمع تھے۔ یہ ایک مثالی جنازہ تھا۔ مسجد کے باہر بھی ہجوم تھا۔ تمام مسالک اور تمام شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہزاروں افراد نے شرکت کی، جامعہ اشرفیہ کی مسجد و مدرسہ کے اندر چھتوں پر، جامعہ اشرفیہ کے باہر پارک اور نہر کے ساتھ ایف سی کالج انڈر پاس تک لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ نماز جنازہ آپؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا احمد حسن اشرفی نے پڑھائی۔ آپؒ کو اچھرہ کے شیر شاہ قبرستان لاہور میں دفن کیا گیا، آپؒ اولاد صالحہ، ہزاروں شاگرد جامعہ اشرفیہ اور دینی مدارس و مساجد ''باقیات الصالحات'' کے طور پر چھوڑ کر گئے ہیں۔ اللہ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور انسانی لغزشوں سے درگزر فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات سے نوازے۔

Marfat.com

ڈاکٹر زین العابدین

سوات کے ایک عظیم سپوت

(۱۹۲۱ء-۲۰۱۱ء)

پرکشش شخصیت

۲۶/اکتوبر ۲۰۱۱ء بروز بدھ سرزمین سوات کے عظیم سپوت، مردِ دانا، سخن ور و سخن شناس، سید مودودیؒ کے قافلے کے ان تھک راہرو، ڈاکٹر زین العابدین زندگی کے نوے سال مکمل کر کے اچانک داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ ڈاکٹر صاحب ایک اہم شخصیت تھے، مگر افسوس کہ ان کی وفات کی اطلاع کافی تاخیر سے مل سکی۔ مرحوم سے دیرینہ تعلق خاطر تھا۔ وہ سراپا محبت تھے۔ پختون معاشرے کی عظیم صفات کے ساتھ ان کے اندر، اپنے دورِ جوانی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارنے کی وجہ سے، اہل دہلی کی تہذیبی خوبیاں بھی بدرجۂ اتم نظر آتی تھیں۔ اس حسین امتزاج نے ڈاکٹر صاحب کو اور زیادہ پرکشش بنا دیا تھا۔ وہ مہمان نواز، خوش مزاج، خوش ذوق اور نہایت شیریں گفتار و فعّال بزرگ تھے۔

پہلا رابطہ

میں نے ڈاکٹر زین العابدین صاحب کو پہلے پہل ستر کے عشرے میں کبل ضلع سوات میں دیکھا۔ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے گرمیوں میں سوات گیا۔ میرے اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھی اور دوست محمد وارث خاں (ایڈووکیٹ) سوات آنے پر اصرار کیا کرتے تھے۔ سو یہ سفر تفریحی بھی تھا اور دعوتی و تحریکی بھی۔ جناب شیر علی خاں صاحب سے بھی شناسائی تھی۔ انھی کی

Marfat.com

وساطت سے کئی بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ان میں ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ میں ان دنوں لاہور جمعیت کا ناظم تھا اور ہفت روزہ آئین میں کبھی کبھار مضمون لکھا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب جماعتی اخبارات و جرائد کے قاری تھے۔ ان کا ذوقِ مطالعہ قابلِ رشک تھا۔ آخری عمر میں ان سے جو آخری ملاقات ہوئی اس میں نظر کی کمزوری اور مطالعے کے معمولات میں تبدیلی پر خاصی پریشانی کا اظہار فرمایا۔

ذہانت و لطافت

ڈاکٹر صاحب سے پہلی ملاقات مرحوم کے کلینک پر ہوئی تھی۔ تعارف ہوا تو بڑے غور سے میرا نام سنا۔ پھر متبسم چہرے کے ساتھ فرمایا کہ اسی نام سے کوئی صاحب آئین میں بھی کبھی کبھار لکھتے ہیں۔ میں نے نہ تردید کی نہ تصدیق۔ بس مسکرا کر کہا ''اچھا! ڈاکٹر صاحب!'' شیر علی خاں صاحب نے کہا ''یہ انھی کی کارستانی ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب بلا کے ذہین تھے۔ فرمانے لگے ''ان کے جواب سے میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔'' اس مجلس کی تفصیلات تو یاد نہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے دورِ جوانی اور زمانۂ طالب علمی کے کچھ دلچسپ واقعات سنائے۔ شیر علی خاں صاحب نے اس موقع پر کہا کہ ہم سب کے مربّی اور جماعت اسلامی کا اس سرزمین پر پودا لگانے والے طور لالہ ڈاکٹر صاحب کے برادرِ بزرگ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عظیم بھائی کے ایمان افروز واقعات بھی سنائے۔ واقعات سناتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آئے۔

اس بالمشافہ ملاقات سے کافی پہلے سے ڈاکٹر صاحب کا نام سن رکھا تھا۔ سید منور حسن صاحب، ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ گرمیوں میں ایک بار بیمار پڑے تو بغرضِ آرام و استراحت انھی کے ہاں کچھ ایام گزارے تھے۔ پھر طور لالہ (تاج الملوک مرحوم) کی شہرت تو اس قدر تھی کہ شاید ہی تحریک کا کوئی فرد ان کے نام سے واقف نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا تعارف بھی اس حوالے سے پہلے سے تھا کہ یہ طور لالہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ پہلی ملاقات کے بعد تو یاد نہیں کتنی بار ان سے شرف ملاقات ملتا رہا۔ البتہ آخری ملاقات کا تذکرہ میں نے ایک مضمون میں کیا تھا۔ اتفاق سے وہ

Marfat.com

فرائیڈے سپیشل، کراچی کی فائل کی ورق گردانی کے دوران ملا تو سوچا کہ اسے بھی ان سطور کا حصہ بنا دیا جائے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کی اپنی زبانی بعض معلومات قارئین کو مل جائیں گی۔

خاندانی تعارف

ڈاکٹر زین العابدین ۱۹۲۱ء میں سوات میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب عزیز الدین سوات کے معروف افراد میں شمار ہوتے تھے۔ والیٔ سوات سے بھی ان کے مراسم تھے۔ ان کے ایک بیٹے سیف الملوک تو والی کے مشیر تھے اور سرکاری کارندوں میں ان کو نہایت نمایاں پوزیشن اور مقام حاصل تھا۔ ڈاکٹر صاحب چار بھائی تھے۔ دو کے نام کا لاحقہ ملوک تھا اور دو کے نام کا سابقہ زین۔ سیف الملوک صاحبِ علم اور صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے مگر پوری زندگی درباری اور شاہ کے مصاحب بن کر گزاری۔ تاج الملوک نے بادشاہوں کا تاج بننے کی بجائے اسلام کا سپاہی بننا پسند کیا اور سنت یوسفی کو زندہ کیا۔ وہ اسلام اور جماعت اسلامی کا عظیم سرمایہ تھے۔ انھی کے نقش پا پر ان کے بھائی زین العابدین بھی چلے اور ابتلا و جلاوطنی کی منزلوں کو استقامت کے ساتھ عبور کیا۔ سب سے چھوٹے بھائی زین الزاہدین تھے جنھوں نے عافیت میں زندگی گزاری۔

ڈاکٹر صاحب سے اپنی آخری ملاقات کا جو تذکرہ میں نے لکھا تھا، اس پر ایک نظر ڈالنے سے مرحوم کی تعلیمی، تحریکی اور عملی زندگی کی جھلک سامنے آجاتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل اس مضمون کا مطالعہ کر لیا جائے۔ راقم نے لکھا:

حسنِ اتفاق

"سوات اور بونیر سے بے گھر ہونے والے لوگ غیر نہیں، ہمارے اپنے ہیں۔ یہ محبِ وطن پاکستانی اور مخلص مسلمان ہیں۔ ان میں سے بعض احباب سے مختلف مقامات پر ملاقاتیں ہوئیں تو حالات کی سنگینی کے احساس اور درد و قلق کے جذبات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ سوات (کبل) سے تعلق رکھنے والے بزرگ رکنِ جماعت ڈاکٹر زین العابدین صاحب کے بارے میں کئی دنوں سے تشویش تھی کہ بہت عرصے سے نہ ان سے رابطہ ہوا ہے اور نہ ان کے تازہ ترین حالات معلوم ہو

Marfat.com

رہے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے ۲۴ مئی ۲۰۰۹ء کو جماعت اسلامی آزاد جموں وکشمیر کے امیدوارانِ رکنیت کی ایک تربیت گاہ میں شرکت کا موقع ملا۔ الاکرام بلڈنگ راولپنڈی میں منعقدہ اس تربیت گاہ کے بعد جماعت اسلامی کے ضلعی دفتر میں ضلع راولپنڈی کے ذمہ داران سے ملاقات کے لیے چند لمحوں کے لیے بیٹھ گیا۔ قیم ضلع، ناظم دفتر اور دیگر ساتھیوں سے ملاقات ہوئی اور جماعت کے تنظیمی وعوامی پروگراموں کی تفصیلات کا علم ہوا۔ موجودہ رفقا میں سے ضلعی ٹیم کے ایک رکن جناب صادق حسن صاحب نے بتایا کہ سوات کے ڈاکٹر زین العابدین آج کل راولپنڈی کی ایک رہائشی کالونی گلریز ۶ میں مقیم ہیں اور انھیں شکایت ہے کہ جماعت کے ذمہ داران میں سے کوئی ساتھی ان سے رابطہ نہیں کرتا۔ مجھے ڈاکٹر زین العابدین کی یہاں موجودگی کی اطلاع سے بے پناہ خوشی ہوئی۔ ان سے وابستہ یادیں دل میں تازہ ہوگئیں۔

نعمت غیر مترقبہ

میں نے صادق حسن صاحب سے کہا کہ مجھے اگلے پروگرام کے لیے کھاریاں اور ڈنگہ پہنچنا ہے مگر میری خواہش ہے کہ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات بھی ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے ٹیلی فون پر رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف گھر پر موجود ہیں بلکہ میری راولپنڈی میں موجودگی سے بہت خوش ہوئے ہیں اور ملاقات کے لیے منتظر ہیں۔ ہم صادق حسن، رضا محمد خان، قاضی محمد جمیل اور اسلامیہ کالج اصغر مال کے ریٹائرڈ پرنسپل ثاقب ضمیر صاحب کے ہمراہ گلریز کالونی میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیے فوراً نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے دو پوتوں حسان اور حسن نے گھر کے بیرونی گیٹ پر ہمارا استقبال کیا۔ اندرونی دروازے پر ڈاکٹر صاحب کے بیٹوں حمید الدین اور جلال الدین نے ہمیں سوات کی روایتی محبت کے ساتھ خوش آمدید کہا اور ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچے تو خود ڈاکٹر صاحب کو کھلے بازوؤں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کھڑا پایا۔ ڈاکٹر صاحب سے محبت کا تعلق دورِ طالب علمی ہی سے تھا، جس میں بعد کے ادوار میں مزید قرب اور بے تکلفی پیدا ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھے تو

Marfat.com

وہاں یادوں کا ایک دبستان کھل گیا۔ یہ ملاقات میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔

مالاکنڈ ڈویژن پر ابتلا کیوں؟

پرامن اور جنت نظیر وادیٔ سوات کا ماضی، حال اور مستقبل زیرِ گفتگو تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت تقریباً ۸۷ سال ہے اور ان کا سینہ تحریک اسلامی اور ریاست سوات کی تاریخ و واقعات کا خزینہ ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ مالاکنڈ ڈویژن کے عوام پر بہت سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ عذاب مسلط کیا گیا ہے، کیوں کہ یہ جماعت اسلامی کے حامی و مؤید ہیں۔ ان کا جامع تبصرہ تھا کہ اس مظلوم خطے کے وہ لوگ دودھاری تلوار کی زد میں ہیں۔ مردِ دانا کے اس ایک فقرے میں سب کچھ موجود ہے۔ کسی دوست نے اس موقع پر بے گھر ہوجانے والے ساتھیوں کے ایک کیمپ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا اور کہا کہ وہاں پر ایک زندہ دل شخص نے مصائب کو شکست دیتے ہوئے اپنی زندہ دلی وخندہ پیشانی قائم رکھی ہے۔ اس نے مزاح کے انداز میں فرمایا کہ طالبان اولیاء اللہ ہیں، فوجی افسران اور جوان فرشتے ہیں اور ہم بے چارے عوام مجرم اور کافر ہیں۔ گفتگو میں 'ف' کا ہر حرف پشتو لہجے کے مطابق 'پ' میں بدلا گیا۔ یہ تبصرہ بھی انتہائی جامع ہے۔

تاج الملوک

ڈاکٹر زین العابدین محض جماعت اسلامی کے پرانے رکن ہی نہیں، بہت پرانے میڈیکل ڈاکٹر بھی ہیں۔ ان کا ایک قابلِ ذکر اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ تحریکِ اسلامی کے درخشندہ ستارے، مولانا مودودیؒ کے قریبی ساتھی اور ناقابلِ بیان ابتلاء و آزمائش سے گزرنے والے صاحبِ استقامت مردِ مومن، جناب تاج الملوکؒ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ تاج الملوکؒ تحریکِ اسلامی میں شامل ہونے کی وجہ سے والیٔ سوات کی نظروں میں کھٹکتے تھے۔ چنانچہ اس جرم کی پاداش میں انھوں نے بے پناہ مصائب جھیلے مگر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ تاج الملوک صاحب کے بارے میں، میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ ان کی وفات کب ہوئی؟ تو انھوں نے پشتو زبان میں اپنے بیٹے حمید الدین سے استفسار کیا کہ طور لالہ کی وفات کب ہوئی تھی؟ اس نے بتایا کہ دسمبر

Marfat.com

۱۹۶۲ء میں۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کی تاریخ وفات عموماً ۱۲/اگست ۱۹۶۲ء لکھی ہے۔ خیر یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔

مقدر اپنا اپنا

ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے بتایا کہ ان کے بڑے بھائی سیف الملوک والی سوات کے مصاحب اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ تاج الملوک بھی شروع میں ریاست کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے مگر بعد میں تحریکِ اسلامی میں شمولیت کی پاداش میں غیر پسندیدہ شخصیت قرار پائے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں تحریکِ اسلامی کا تعارف تاج الملوک مرحوم ہی کی معرفت پہنچا اور پھر ہم لوگ ان کے ہمنوا بن گئے، مگر سیف الملوک صاحب کا معاملہ مختلف رہا۔ وہ والی صاحب کی مصاحبت ہی کے گنبد میں مقید رہے۔ ہر شخص کا اپنا مقدر اور اپنی قسمت ہوتی ہے۔ جو جس کا مقدر ہے، اسے وہ مل کر رہتا ہے۔ محترم ڈاکٹر زین العابدین صاحب سے ملاقات کے لیے ہمارے پاس وقت مختصر تھا مگر کہنے سننے کی باتیں بہت زیادہ تھیں۔ مختصر وقت ہی میں راقم نے ان سے ان کے اہل و عیال اور خود ان کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ میرے جسم کا رواں رواں اگر اللہ کا شکر ادا کرے اور میں سر سجدے میں رکھ کر ساری زندگی گزار دوں تو بھی اللہ کے انعامات کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

تحدیثِ نعمت

انھوں نے انعاماتِ ربانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے مجھے میری مرحومہ بیوی سے آٹھ بیٹے اور چار بیٹیاں عطا فرمائیں۔ سب بیٹے اپنے اپنے مقام پر خوشحال ہیں۔ وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور نیک نہاد اور صاحبِ کردار ہیں۔ چاروں بیٹیاں ارکانِ جماعت ہیں اور اپنے گھروں میں آباد اور خوشحال ہیں۔ ان میں سے ایک مکہ میں مقیم ہے اور وہاں درسِ قرآن کا بہترین حلقہ چلا رہی ہے جبکہ ایک بیٹی صوبہ سرحد میں جماعت کے شعبۂ خواتین میں صوبائی ذمہ داریوں پر فائز ہے۔ دوسری بیوی سے اللہ نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی دی ہے، وہ دونوں ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔

Marfat.com

دلّی کا تذکرہ

پنڈی کے جس مکان میں ڈاکٹر صاحب مقیم ہیں وہ ان کے بیٹے سلیم الدین کا گھر ہے اور گھر کے قریب جو ایک مسجد تعمیر کی گئی ہے، اس کی تعمیر و آبادکاری میں بیشتر حصہ ان کے خاندان ہی کا ہے۔ ہمارے ساتھی ثاقب صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب جب اپنی جوانی کے دور کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہر شخص دلچسپی سے گوش بر آواز ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے دورِ طالب علمی اور دلی کے قیام کے دلچسپ واقعات سنائے جس میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کے دیگر دوست سیر سپاٹے کے لیے آگرہ اور تاج محل جایا کرتے تھے جبکہ وہ فارغ اوقات میں لائبریریوں میں بیٹھ کر نادر کتابوں سے اپنی علمی پیاس بجھانے میں مصروف رہتے تھے۔ اسی دور میں انھوں نے تحریکِ اسلامی سے ابتدائی تعارف بھی حاصل کیا تھا اور مولانا مودودیؒ کی کتب اور مضامین کا گہرا مطالعہ کر کے تحریک کے بارے میں یکسو ہو گئے تھے۔

مرشد کی میزبانی کا شرف

مولانا مودودیؒ سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا اپنے کارکنان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ میرے بھائی تاج الملوک کی وفات پر ہمارے خاندان سے تعزیت کرنے کے لیے سوات تشریف لائے اور ان کا قیام میرے گھر پر رہا۔ میزبانی کے وہ دن میری زندگی کے قیمتی ترین لمحات ہیں۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ تاج الملوک کی وفات پر ان کو از حد صدمہ ہوا۔ وہ تحریک کا ایک قیمتی اثاثہ تھے، ان جیسے صاحبِ عزیمت و باہمت لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ پھر مولانا نے طور لالہ کے لیے رقت کے ساتھ دعائے مغفرت کی۔ وہ اپنے رفقاء سے بے تکلف ہو کر ان سے گھل مل جاتے تھے۔ ان کو اللہ نے بے پناہ خوبیاں عطا کی تھیں، وہ بہت محبت کرنے والے راہ نما تھے۔

جلاوطنی اور کراچی آمد

دورانِ گفتگو ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ تاج الملوک تو قید و بند سے گزرے، پھر اس کے بعد

Marfat.com

ریاست بدر ہوئے، مگر مجھے بھائی کی وفات کے بعد یہ شرف حاصل ہوا کہ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو مجھے ریاست سوات سے جلاوطنی کا حکم دے دیا گیا۔ جس شہر کراچی میں آج سوات کے بے گھر لوگوں کے داخلے کے خلاف قوم پرست اور لسانی تنظیمیں احتجاجی مظاہرے کر رہی ہیں، اپنی جلاوطنی کے وقت کسی تردد کے بغیر فوراً میں نے اسی شہر کی طرف رختِ سفر باندھا تھا۔ شہر اور اس کے در و دیوار سے محبتوں کا زمزمہ پھوٹتا تھا۔ اخوت کی شیرینی ہر شخص میں موجود تھی، قطع نظر اس سے کہ وہ کون سی زبان بولتا اور کس علاقے سے رہائشی تعلق رکھتا ہے۔ پوری فضا تعاون کے جذبات سے معطر تھی۔

چودھری غلام محمد مرحوم

ڈاکٹر صاحب بیان کر رہے تھے کہ کراچی پہنچ کر میں نے چھوٹا سا کلینک قائم کیا اور پہلے دن جب کلینک پر بیٹھا تو میری یافت پچیس روپے تھی جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ کراچی جماعت کے امیر چودھری غلام محمد صاحب کو بھی میرے کراچی آنے کا علم ہو چکا تھا لیکن ابھی تک باہمی رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ انھوں نے بعض دوستوں سے میرے بارے میں استفسار بھی کیا۔ مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے خود حاضر ہونے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اس روز میں کلینک سے فارغ ہو کر جماعت کے دفتر آرام باغ پہنچا۔ چودھری صاحب مجھے دیکھتے ہی اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے اور محبت بھرے لہجے مکمل اپنائیت کے ساتھ کہا کہ میں نے تو تمھارے وارنٹ جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر تم خود ہی گرفتاری کے لیے آگئے ہو۔ پھر کافی دیر تک مجھے اپنے سینے سے چمٹائے رکھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اقراری مجرم ہوں، خود حاضر ہو گیا ہوں۔ چودھری غلام محمد مرحوم جماعت کے اہم ترین راہ نماؤں میں سے تھے۔

عمر کا بونس

میں نے ڈاکٹر صاحب سے تاج الملوک صاحب کے اہل و عیال کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے کہ بس المیہ ہی ہے کہ مرحوم کے تین بیٹوں میں سے کوئی بھی ان کے نقشِ قدم پر نہ چلا۔ دو بیٹے فوت ہو چکے ہیں اور ایک بقیدِ حیات ہے۔ البتہ خوشی کی بات یہ ہے کہ تاج الملوک صاحب

Marfat.com

کے نواسے جمعیت اور تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے رخصت چاہی تو فرمایا: اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے کیا جلدی ہے۔ میں نے اگلے پروگراموں کے بارے میں عرض کیا تو کہنے لگے: ہاں اس دلیل کے سامنے تو میری کوئی حجت نہیں چل سکتی۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے صحت کے بارے میں پھر پوچھ لیا تو مسکرا کر فرمانے لگے: ۸۷ سال پورے کر چکا ہوں۔ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۳ سال عمر پائی تھی۔ اس سے اوپر ہر سال کو بونس سمجھتا ہوں اور عمر کے لحاظ سے اللہ کا شکر ہے کہ صحت آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ایشیا اور ترجمان القرآن گھر میں آتے ہیں مگر شوگر کی وجہ سے نظر متاثر ہے۔ مطالعہ مشکل ہو جاتا ہے، یادداشت بھی کچھ متاثر ہوئی ہے۔ بعض اوقات نام یاد نہیں رہتے۔ پھر مسکرا کر اپنے بیٹے حمید الدین کی طرف دیکھا اور کہا کہ کبھی ان لوگوں کا نام بھی بھول جاتا ہوں۔

امریکی پٹھو

میں نے کہا: ہماری محبتوں کی سرزمین وادیٔ سوات کے حالات کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں۔ کہنے لگے: اللہ کی رحمت سے کچھ بھی بعید نہیں، مگر موجودہ حکمرانوں کے ہوتے ہوئے ان علاقوں میں امن کا قیام خیال است ومحال است وجنون۔ یہ لوگ قوم کو بے وقوف بنا رہے ہیں جبکہ امریکہ ان کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ امریکہ کی گیم ہے، حکمران محض اس کے مہرے ہیں۔ دوپہر کی شدید گرمی اور دھوپ اور الوداعی لمحات، ڈاکٹر صاحب بضد کہ گاڑی تک جائیں گے اور میری مؤدبانہ درخواست کہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے ہی رخصت فرمادیں، مگر ڈاکٹر صاحب ہی جیتے اور مجھے ہار ماننا پڑی۔ وہ گاڑی روانہ ہونے تک سڑک پر کھڑے رہے۔ کیسے عظیم لوگ اس دنیا میں پائے جاتے ہیں! یہ ملاقات ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی جس کی شیرینی اب تک محسوس ہو رہی ہے!!

(فرائیڈے اسپیشل ۵ جون ۲۰۰۹ء)

اہل وعیال

ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے اولادِ کثیر سے نوازا۔ یعنی ۹ بیٹے اور پانچ بیٹیاں۔ پہلی اہلیہ سے ڈاکٹر

Marfat.com

صاحب کے آٹھ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ دوسری شادی پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد کی اور اللہ نے آخری عمر میں ایک فرزند اور ایک صاحبزادی سے نوازا۔ ڈاکٹر صاحب کے سبھی بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ، شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ چھوٹے بیٹے اور بیٹی کی شادی بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی وفات سے قبل کر دی تھی۔ یوں ان خاندانی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر وہ اپنے دائمی گھر سدھار گئے۔ ان کے بیٹوں سے جب بھی ملاقات ہو، معلوم ہوتا ہے کہ کسی قابل مربّی کے تربیت یافتہ ہیں، انتہائی مؤدب، مہذب اور شائستہ! اللہ ان سب کو سلامت رکھے۔ بیٹوں کی ترتیب یوں ہے۔

۱۔ سلیم الدین، راولپنڈی میں مقیم ہیں، انھی کے ہاں ڈاکٹر صاحب سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔

۲۔ سعید الدین، ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہیں۔

۳۔ حمید الدین، یہ بھی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں اور کبل میں مقیم ہیں، طبی پریکٹس کرتے ہیں، رکنِ جماعت ہیں۔

۴۔ ضیاء الدین، اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہیں۔

۵۔ ظہیر الدین، کراچی میں مقیم ہیں۔

۶۔ ذکی الدین، ملائشیا میں مقیم ہیں۔

۷۔ صلاح الدین، عراق میں ملازمت کرتے ہیں۔ فیملی لاہور میں مقیم ہے۔ ہر چار پانچ ماہ بعد پاکستان واپسی ہوتی ہے۔

۸۔ مسرور عابد، ہومیو ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر زین العابدین مرحوم کے کلینک پر بیٹھتے اور پریکٹس کرتے ہیں۔ یہ بھی رکنِ جماعت ہیں۔

۹۔ جلال الدین، لاہور میں ملازمت ہے اور فی الحال رہائش بھی یہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بیٹے، بیٹیاں اور پوتے نواسے سبھی تحریک سے مکمل وابستگی رکھتے ہیں۔ البتہ

Marfat.com

بیٹوں میں سے دو ارکان ہیں یعنی حمید الدین صاحب اور مسرور عابد صاحب اور بیٹیاں سبھی ارکانِ جماعت ہیں، جیسا کہ خود ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا۔

بے پناہ خوشی نا قابل بیان غم

جلال الدین بیان کرتے ہیں کہ والد صاحب کی زندگی کا میں نے تھوڑا سا حصہ ہی دیکھا ہے۔ مولانا مودودی کی رحلت یا ڈاکٹر نذیر کی شہادت، سانحہ سقوطِ مشرقی پاکستان یا اس طرح کے دیگر المناک واقعات پر تو معلوم نہیں ان کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ البتہ مجھے دو مواقع یاد ہیں جب والد صاحب کو میں نے حد سے زیادہ غمگین اور حد سے زیادہ خوش و خرم پایا۔ غم کی کیفیت تو اس روز دیکھی جب میاں طفیل محمد مرحوم کی وفات کی اطلاع ملی۔ والد صاحب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ان کو اس طرح روتے ہوئے میں نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا۔ خوشی کا موقع وہ تھا جب ۲۰۰۲ء کے ملکی انتخابات عام میں صوبہ سرحد سے متحدہ مجلس عمل کے امیدواران قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں مسلسل جیت رہے تھے۔ کم و بیش چھتیس گھنٹوں میں نتائج مکمل ہوئے۔ اس دوران والد صاحب بیشتر وقت ٹی وی پر بیٹھے خبریں سنتے رہے اور اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ بہت سے بظاہر نا قابلِ شکست بت پاش پاش ہو چکے تھے۔

بلاوا اور حاضری

ڈاکٹر صاحب ہر طرح سے فارغ البال تھے۔ بس جلال الدین کی شادی کی فکر تھی۔ باقی سبھی اولاد کی شادیاں کر چکے تھے۔ اس کی شادی بھی اکتوبر ۲۰۱۱ء کے پہلے ہفتے میں ہوگئی تو اطمینان کا اظہار کیا کہ ایک فرض تھا جو ادا ہو گیا، ایک ذمہ داری تھی جس سے سبک دوش ہو گئے۔ بیٹے کی شادی کے بیس روز بعد ۲۶ / اکتوبر کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔

عزیزم جلال الدین لاہور میں مقیم ہونے کی وجہ سے ملتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں میرے دفتر میں تشریف لائے تو یہ خوش خبری سنائی کہ اللہ نے ان کو بیٹا عطا فرمایا ہے۔ بیٹے کا نام زین العابدین رکھا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات کے ایک سال

Marfat.com

کے اندر اندر اس گھر میں ان کانعم البدل عطا فرما دیا۔ اللہ نومولود کو اپنے عظیم دادا کا سچا جانشین اور اپنے دین کا حسن اور عابدین کی زینت بنا دے۔

ڈاکٹر صاحب کبرسنی کی وجہ سے کمزوری اور ضعف تو محسوس کرتے تھے مگر اللہ کا شکر ہے کہ آخر وقت تک کسی کے ایک لحہ کے لیے بھی محتاج نہیں ہوئے۔ سوات کے حالات نارمل ہونے پر واپس کبل چلے گئے تھے۔ ۲۵ ر اکتوبر ۲۰۱۱ء کو ظہر کا وضو کر کے واش روم سے باہر نکل رہے تھے کہ پاؤں پھسلا اور گر گئے۔ اللہ نے کسی بڑی چوٹ یا ٹوٹ پھوٹ سے جسم کو محفوظ رکھا، تاہم پورا جسم متاثر ہو گیا۔ اگلے روز ظہر کی نماز سے قبل اچانک طبیعت خراب ہوئی اور اذان و نماز سے قبل ہی بلاوا آ گیا۔ کیسی مومنانہ موت ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی جملہ حسنات کو قبول فرمائے اور بشری کمزوریوں سے درگزر فرمائے۔

Marfat.com

دو مثالی بھائی

حسین یادیں

ابتدائی بچپن کی یادوں سے ہر آدمی لطف اندوز ہوتا ہوگا۔ میں جب بھی یہ دریچہ کھولتا ہوں، دیر تک اس ماحول میں کھو جاتا ہوں۔ سراپا محبت و شفقت اور انتہائی ناز برداری کرنے والی جو شخصیات آج بھی لوحِ حافظہ پر موجود و محفوظ ہیں، ان میں میرے دونوں ماموں صاحبان کا بڑا نمایاں مقام ہے۔ میرے ننھیال اور ددھیال ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے اور ایک ہی چھوٹی سی بستی میں مقیم تھے۔ جب چلنا سیکھا تو صبح ہی صبح اپنے گھر سے نکل کر نانا ابو کے گھر چلے جانا معمول سا بن گیا۔ نانا ابو اور نانی اماں مجھے دیکھتے تو ان کی زبان پر بسم اللہ اور ماشاء اللہ کے الفاظ آجاتے۔ ادھر اپنے گھر میں معاملہ یہ ہوتا تھا کہ میری پھوپھی جان اور دادا ابو گھر سے میری غیر حاضری پر بے قرار ہو جاتے اور کوئی نہ کوئی قاصد مجھے گھر لے جانے کے لیے آجاتا۔ نانی اماں مجھے ناشتہ کرائے بغیر نہ جانے دیتی تھیں۔ میں ابھی چھوٹا ہی تھا کہ نانی اماں کی وفات ہو گئی۔ اس موقع پر میں نے عورتوں کے علاوہ اپنے ماموں صاحبان کو بھی خاموشی سے آنسو بہاتے دیکھا تو میں بھی رونے لگا۔ نانی اماں کی شفقت تھوڑے سے عرصے کے لیے ہی شامل حال رہی مگر وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

دو محبوب شخصیتیں

ماموں جان کسی کام کاج میں لگے ہوتے تو فوراً چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوتے۔ چھوٹے

Marfat.com

ماموں تو بازوؤں میں اٹھا لیتے، کبھی بازو اپنے سر سے اوپر کر کے یہ تاثر دیتے کہ میں ہوا میں پرواز کرنے لگا ہوں۔ شروع میں تو میں ڈر جاتا کہ نیچے گر جاؤں گا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے نیچے نہیں گرنے دیں گے۔ بڑے ماموں جان اگرچہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اردو اور پنجابی پڑھ سکتے تھے۔ انھیں بہت سے اشعار یاد تھے اور آواز اتنی سریلی کہ پرندے بھی محو ہو جائیں۔ وہ میرے گال تھپتھپا کر کوئی شعر پڑھتے جس کو میں سمجھ تو نہ پاتا لیکن یہ احساس ضرور ہوتا کہ وہ میری تعریف کر رہے ہیں، یہ ان کی محبت تھی ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ ایک نحیف و نزار، مریل اور بیمار، دبلا پتلا مجھ جیسا بچہ کہاں کسی کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا۔ میں جب کالج میں پہنچا تو لاہور سے واپسی پر ننھیال جا کر بہت محظوظ ہوتا۔ ماموں جان کے سامنے میں کبھی کبھار شعر پڑھتا

اسیرِ پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے
کہاں گیا میرا بچپن خراب کر کے مجھے

تو وہ بہت ہنستے اور فرماتے، ابھی تو تم بچے ہی ہو! مگر اب ہاتھوں پہ اچھالا تو نہیں جا سکتا تھا۔

اے اللہ مجھے ان میں شامل فرما!

میں اپنے اللہ کی نعمتوں اور احسانات کو یاد کرتا ہوں تو قدم قدم پر ان کی تعداد اتنی ہے کہ سچ جانیں اگر گننا چاہوں تو گن نہیں سکتا۔ نہ میرے اندر کوئی خوبی نہ حسن و جمال، نہ قوت و پھرتی نہ کوئی کمال!! بچپن سے آج تک عزیز و اقارب، دوست احباب اور اللہ والوں کی ایک بڑی تعداد جس محبت کا اظہار کرتی رہی ہے، وہ ایک اعزاز بھی ہے اور امتحان بھی۔ مجھ سے محبت کرنے والے میرے ظاہر سے بھی واقف نہیں باطن کو تو کوئی کیا جانے گا۔ عالم الغیب والشھادۃ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ والوں سے مجھے بے پناہ محبت ہے اور جو اللہ کے باغی ہیں ان کے لیے اپنے دل میں اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود بھی کوئی نرم گوشہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ کے ایک شعر کا حوالہ اور بھی کسی جگہ پر میں نے دیا تھا۔ اکثر یہ گنگناتا ہوں:

احب الصالحین و لستُ منهم
لعل الله یرزقنی صلاحا

Marfat.com

مجھے صالحین سے محبت ہے [مگر میں کہاں اور وہ کہاں] میں ان میں شامل نہیں ہوں، ہاں اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ مجھے بھی صالحیت کی توفیق بخشے گا۔

سراپا شرافت و اخلاص

میرے بڑے ماموں جان کا نام میاں سخی محمد تھا اور چھوٹے حافظ غلام محمد کے نام سے موسوم و معروف تھے۔ ان سے بڑی عمر کے لوگ انھیں محبت سے میاں غلام کہتے تھے۔ دونوں بھائی جماعت اسلامی کے رکن بنے اور مثالی ارکان شمار ہوئے۔ زندگی کے آغاز ہی سے دونوں بھائی نیکی، خوش خلقی، مہمان نوازی اور تواضع و انکسار کا مجسمہ تھے۔ ہمارے گاؤں ہی میں نہیں پورے علاقے میں دوست اور دشمن، اپنے اور پرائے سب اگر کسی ایک بات پر متفق اور یک زبان ہیں تو وہ یہی کہ دونوں بھائی نیک ترین، ہر ایک کے خیر خواہ، ہمدرد اور معاون تھے۔ الحمدللہ کوئی بدترین مخالف بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ دونوں بھائیوں کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ وہ کسی سے کوئی بیر نہیں رکھتے تھے۔ کوئی کسی معاملے میں مخالفت بھی کرتا تو اس کے حق میں بھی کلمۂ خیر ہی کہتے۔ جماعت میں شامل ہوئے تو اپنے آپ کو مکمل طور پر جماعت کے سپرد کر دیا۔ اب ان کی ساری تگ ودو کا مرکز ومحور جماعت اسلامی تھی!

بچپن کی ایک تمنا اور اس کی تکمیل

میں نے جب ہوش سنبھالا تو ماموں جان حافظ غلام محمد کو ماہِ رمضان میں اپنی مسجد میں قرآن پاک سناتے سنا۔ وہ بہت پختہ حافظ تھے۔ نانا جان حافظ فضل الٰہی مرحوم بھی حافظ تھے اور ان کی طبیعت میں بے پناہ جلال تھا۔ شخصیت بھی بھاری بھرکم تھی اور آواز بھی کڑاکے دار۔ اگر ماموں جان کو کبھی کسی مقام پر کوئی لقمہ دیتے تو تراویح میں کھڑے اونگھتے ہوئے نمازی بھی جاگ جاتے۔ میں اس زمانے میں قرآن پاک حفظ کر رہا تھا۔ ہر سال ماہِ رمضان میں جب ماموں جان کو تراویح پڑھاتے دیکھتا تو دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ کاش کبھی میں بھی تراویح پڑھا سکوں۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت، بزرگوں کی دعاؤں اور استاد محترم حضرت حافظ جان محمد مرحوم کی خصوصی توجہ سے نو

Marfat.com

سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت عطا فرمائی کہ قرآن میرے سینے میں محفوظ ہو گیا۔

مجھے جب مصلے پر کھڑا ہونے کی سعادت ملی تو سچی بات یہ ہے کہ بے پناہ مسرت کے ساتھ کسی حد تک دل میں خوف سا بھی تھا کہ کہاں حافظ شیر علی اور حافظ غلام محمد اور کہاں یہ ناچیز۔ حافظ شیر علی ہمارے تایا زاد تھے، وہ گاؤں کے نمبردار اور بڑے خوش الحان اور پختہ حافظ قرآن تھے۔ تراویح میں کبھی وہ قرآن سناتے کبھی ماموں جان۔ مجھے احساس تھا کہ میرے پیچھے سات آٹھ حفاظ ہیں۔ خوف یہ تھا کہ نانا جان جس طرح لقمہ دیتے ہیں، اس سے تو عام نمازی بھی نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں، قرآن پاک پڑھنے والے پر کیا گزرتی ہوگی۔ باقی سب حفاظ جمالی طبیعت کے مالک تھے بالخصوص ماموں جان تو حد سے زیادہ حلیم الطبع اور نرم خو تھے۔ میری خواہش تھی کہ مجھے اگر کسی غلطی پر لقمہ دینے اور تصحیح کرانے کا موقع آئے تو ماموں جان یہ کام کریں مگر دیگر حفاظ کے مقابلے میں ماموں جان جونیئر تھے۔ بہرحال اللہ کا کرم ہے کہ سب بزرگوں نے یہ ذمہ داری میرے استاد محترم اور ماموں جان دونوں کو سونپی۔ پہلی مرتبہ ہی مصلے پر کھڑا ہونے کا یہ تجربہ اتنا خوش گوار ثابت ہوا کہ ہر سال جب میں مصلے پر کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے وہ پہلی تراویح یاد آتی ہے اور اپنے ماموں جان کی شہد میں ڈوبی ہوئی، شیریں آواز [کہ جواب کبھی سنائی نہیں دے گی] بے ساختہ کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔

حفاظِ قرآن کا خاندان

میرے ننھیالی خاندان میں ماموں جان حافظ غلام محمد سے اوپر تک مسلسل کئی پشتوں کو حافظ قرآن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ میرے بڑے ماموں جان میاں سخی محمد مرحوم کو بھی بچپن میں حفظِ قرآن کے لیے بار بار مکتب میں بٹھایا گیا مگر بزرگ بتاتے ہیں کہ جب بھی ان کی پڑھائی شروع ہوتی وہ اس قدر شدید بیمار ہو جاتے کہ کئی مہینے یہ بیماری جاری رہتی۔ آخر ان کے بزرگوں نے انھیں حفظ کرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ سکول بھی نہیں گئے تھے جبکہ چھوٹے ماموں جان پرائمری تک سکول میں پڑھتے رہے۔ بڑے ماموں جان اپنی ذہانت و قابلیت سے بڑی عمر میں

Marfat.com

ناظرہ قرآن پاک بالکل درست تلفظ اور مخارج کے ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے۔ قرآن پاک کی کچھ سورتیں یاد بھی کر لی تھیں۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ اردو زبان پڑھ لیتے تھے۔ جوانی میں اکرام محمدی اور تفسیر سورہ یوسف بزبان پنجابی اشعار، سردیوں کی راتوں کو لالٹین کی روشنی میں جب پڑھتے تو بڑی تعداد میں لوگ رات گئے تک جھومتے رہتے تھے۔ چھوٹے ماموں جان کو شعر و شاعری سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں تھا البتہ قرآنی آیات اکثر گنگناتے رہتے تھے۔

مثالی بھائی، مثالی ارکانِ جماعت

دونوں بھائی زندگی بھر یک جان دو قالب کی شان سے محض محاورے کے طور پر نہیں عملاً باہمی اخوت و محبت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ایک ہی گھر، ایک ہی کچن، نہ زمین کی تقسیم نہ کسی اور چیز کے بارے میں کبھی کوئی اختلاف رائے۔ کاشت کاری پیشہ تھا اور اس میں اللہ نے بڑی برکت دی تھی۔ جماعت میں شمولیت کے بعد میرے والد گرامی قدر اور دونوں ماموں جان ایک ہی دن ۲۲ فروری ۱۹۷۸ء کو رکن بنے اور ہمارے گاؤں میں مقامی جماعت وجود میں آ گئی۔ جماعت کے مقامی اور ضلعی ذمہ داران سے لے کر صوبائی اور مرکزی قائدین تک بیش تر لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ تینوں ارکان، جماعتی پروگراموں میں سردی ہو یا گرمی، آندھی ہو یا طوفان، گولیوں کی بوچھاڑ ہو یا لاٹھیوں کی یلغار، بڑی استقامت و جرأت اور پابندی کے ساتھ پہنچتے تھے۔ کاشت کاری کے معمولات و وظائف اور مصروفیات بڑی عجیب ہوتی ہیں مگر ان تینوں بزرگوں نے رکن بننے کے بعد ان چیزوں کو ہمیشہ ثانوی حیثیت دی۔

اللہ کے انعامات

میرے نانا جان مرحوم بڑے مجلسی آدمی اور از حد مہمان نواز تھے۔ ان کے دوست احباب کا وسیع حلقہ تھا۔ ان کے پاس اکثر کئی لوگ بیٹھے رہتے۔ کھانے کے وقت وہ ان کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے مگر اس میں کوئی تکلف اور تصنع نہ ہوتا تھا۔ معمول کے مطابق ماحضر پیش کر دیا جاتا تھا۔ ماموں صاحبان ان تمام احباب اور مہمانوں کی خدمت کر کے بڑے خوش ہوا کرتے تھے۔ مجھے وہ

Marfat.com

تمام مناظر آج بھی یاد ہیں۔ ہماری نانی اماں کا تعلق میرے ددھیالی خاندان سے تھا۔ وہ گاؤں کے رئیس اور نمبردار کی بیٹی تھیں مگر اس قدر نرم خو اور منکسر المزاج کہ آج تک ان کو جاننے والی خواتین ان کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ ان کے آنگن میں تین پھول اور تین کلیاں بہار افزا ہوئیں۔

ماموں جان تین بہنیں اور تین بھائی تھے۔ بڑے بھائی نور محمد قرآن پاک کا بیشتر حصہ حفظ کر چکے تھے کہ چھوٹی عمر میں بیمار ہوئے اور وفات پا گئے۔ منجھلی بہن بھی جوانی ہی میں شادی سے قبل فوت ہو گئیں۔ ہماری بڑی خالہ مرحومہ اور میری والدہ مرحومہ اور دونوں ماموں صاحبان اللہ کے فضل سے بھرپور زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ سب اللہ کے فضل سے صاحبِ اولاد ہیں اور سب کی اولاد دین سے وابستہ ہے۔ ماموں جان سخی محمد مرحوم کے تین بچے، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں بالکل بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ آخر میں اللہ نے انھیں اکلوتا بیٹا میاں عبدالماجد عطا فرمایا جو اللہ کے فضل سے اپنے والدین کے لیے صدقۂ جاریہ ہے۔ میاں صاحب جماعت کے رکن ہیں، کئی سال تک تحریکی حلقہ یواے ای میں مختلف مقامات پر ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ آج کل منصورہ میں مقیم ہیں اور جماعتی پروگراموں میں اپنے بزرگوں کی صحیح تصویر و تفسیر۔ گھر کی مصروفیات کتنی ہی زیادہ ہوں کبھی کسی پروگرام میں آڑے نہیں آنے دیتے۔ انھیں دیکھ کر رشک آتا ہے کہ جماعتی پروگراموں میں اگر ارکان و کارکنان یوں دلچسپی لیں تو کام کی رفتار کئی گنا بڑھ جائے۔

نیک کسان اللہ کے محبوب

مجھے یاد ہے کہ ماموں جان سخی محمد زمینوں میں ہل چلانے کے بعد دوپہر کو واپس پلٹتے تو نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنتے۔ کھانا کھاتے اور پھر مسجد میں آکر لیٹ جاتے کہ مبادا نماز باجماعت رہ جائے۔ چھوٹے ماموں جان مویشیوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ادا کرتے تھے اور وہ بھی اذان کے ساتھ ہی مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ اچھے بیل، اچھی بھینسیں اور ایک عدد گھوڑی ضرور رکھا کرتے تھے۔ اچھا کسان بھی حدیث کے مطابق اللہ کے محبوب بندوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کسان بھائی اللہ و رسولؐ کی محبت سے مالا مال تھے۔ برطانیہ میں مجھے اپنے چھوٹے ماموں جان کی وفات کی

Marfat.com

اطلاع ملی تو بڑا صدمہ ہوا۔تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں نے ان کی خوبیاں بیان کیں جس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ایک بزرگ چودھری قدر داد جن کا تعلق ہمارے گاؤں کے قریب ایک دوسرے گاؤں سے ہے،سال ہا سال سے یہاں مقیم ہیں۔انھوں نے فرمایا کہ یہ دونوں بھائی جب اپنے کھیتوں پر جاتے تو وضو کے لیے پانی بھی ساتھ لے جاتے۔نماز کا وقت ہوتا تو باجماعت نماز ادا کرتے اور آس پاس بھی کوئی کسان ہوتا تو اسے بھی ترغیب دیتے۔لوگوں کے لیے کھیتوں کے درمیان یہ نماز باجماعت خوشگوار حیرت کا باعث ہوتی تھی۔ ہر شخص مرحوم کے ساتھ اپنے ذاتی تعلق کے ایسے ایسے واقعات سنا رہا تھا کہ ان کی عظمت کے نئے گوشے سامنے آرہے تھے۔

حفظ قرآن کی سعادت

ماموں جان سخی محمد خود قرآن حفظ نہ کرسکے، ان کے بیٹے میاں عبدالماجد کو حفظ کرانے کے لیے بھی ان کے دادا جان [اور میرے نانا جان] حافظ فضل الٰہی صاحب نے بڑی کوشش کی مگر اللہ کو منظور نہ تھا اور وہ حفظ نہ کرسکے۔نانا جان نے علاقے کے بے شمار بچوں کو حفظ کرایا اور بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھایا مگر اپنے پوتوں کو حفظ نہ کرا سکے۔حافظ غلام محمد مرحوم کے بیٹے میاں خالد بھی حفظ نہ کرسکے۔یہ اللہ کی مشیت ہے اور انسان اس میں بے بس ہے۔میاں عبدالماجد کے چار بیٹے ہیں۔ بیٹی کی رحمت سے محروم ہیں۔اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت بہرحال ان کے گھر پر سایہ فگن ہے کہ چاروں بیٹے حافظ قرآن ہیں،مزید تحدیث نعمت یہ کہ میری چھوٹی بہن جو میاں صاحب کی اہلیہ ہیں، بھی حافظ قرآن اور رکنِ جماعت ہیں۔میاں خالد کا اکلوتا بیٹا سیف اللہ بھی حافظ قرآن ہے۔

مرض اور علاج

ماموں جان سخی محمد زندگی کے آخری سالوں میں [۲۰۰۰ء میں] بیمار پڑے۔شروع میں تو مرض کی تشخیص ہی نہ ہوسکی۔حکیموں اور طبیبوں کا علاج ہوتا رہا۔کبھی افاقہ ہو جاتا اور کبھی پھر کمزوری دبا لیتی۔آخر میاں عبدالماجد کے بچے دبئی سے واپس آئے اور منصورہ میں گھر بنایا تو وہ منصورہ منتقل ہوگئے۔یہاں ان کے مکمل ٹیسٹ کرائے گئے۔معلوم ہوا کہ پراسٹریٹ میں

Marfat.com

سرطان ہے۔ مرض کا علاج شروع ہوا، آپریشن بھی ہوا، کچھ عرصہ افاقہ رہا۔ اس دوران وہ اپنے بھائی اور اعزہ سے ملنے کے لیے مسلسل گاؤں کا سفر کرتے رہے۔ جب وہ لاہور آتے تو چھوٹے ماموں جان ان سے ملنے کے لیے لاہور آجاتے۔ میں محسوس کرتا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے دوری کو برداشت نہیں کر پاتے۔ آخری دنوں میں جب ماموں جان پھر بیمار ہوئے تو چھوٹے ماموں جان مستقل طور پر ان کے پاس رہے۔ ہم سب لوگ بھی بیماری کے دنوں میں ان کا بہت خیال رکھتے مگر ان کے برادر عزیز تو ان پر جان چھڑکتے تھے۔ بھائیوں کی ایسی جوڑی واقعی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہوگی۔

اپنائیت و شفقت

ماموں جان کی بیماری کے دنوں میں میں لاہور سے باہر کسی دورے پر جاتا تو جانے سے قبل کافی دیر ان کے پاس بیٹھتا۔ ان کا حوصلہ بہت بلند تھا اور جماعتی پروگراموں میں دلچسپی اس قدر زیادہ کہ جب میں دورے پر جانے اور واپس آنے پر وہاں کے حالات ان کے گوش گزار کرتا تو اپنی بیماری اور درد کو بھول کر پورے شوق اور انہماک سے بات سنتے۔ ان کی وفات سے چند روز قبل مجھے تونسہ اور ڈیرہ غازی خان جانا پڑا۔ شدید سردیوں کے دن تھے اور رات کو بہت دھند ہوتی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں کل صبح سفر پر جا رہا ہوں، ان شاء اللہ دوسرے دن آجاؤں گا۔ کمال اپنائیت اور شفقت کے ساتھ سینے پر ہاتھ مار کر کہنے لگے اللہ کی امان میں جاؤ، واپس آؤ گے تو میں ان شاء اللہ یہیں موجود ہوں گا۔ میں واپس آیا اور ماموں جان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت خوش ہوئے اور اپنی بیماری کے باوجود سفر اور پروگراموں کے بارے میں استفسار کرنے لگے۔ جماعت اسلامی ان کے رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ماموں جان سخی محمد کی وفات منصورہ ہی میں ۴ر جنوری ۲۰۰۲ء کو ہوئی۔ نماز جنازہ قاضی حسین احمد صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد تدفین کے لیے ہم لوگ گاؤں چلے گئے۔ گاؤں میں بھی بہت بڑا جنازہ ہوا اور اللہ کا مخلص بندہ اور جماعت کا بے لوث سپاہی اپنے آبائی قبرستان میں ابدی نیند سو گیا۔ اللہ ان کی قبر کو منور فرمائے۔

Marfat.com

خوش بخت مسافر

ماموں جان کی وفات کے بعد میرے والد گرامی میاں فیض محی الدین اور چھوٹے ماموں جان حافظ غلام محمد بہت غمزدہ تھے۔ رشتے داری اور خون کا تعلق اپنی جگہ مگر تحریکی ساتھ اور دردِ مشترک نے ان بزرگوں کو ان کے آخری دم تک یہ صدمہ بھولنے نہیں دیا۔ چھوٹے ماموں جان کی صحت بھی کمزور تھی مگر بظاہر انھیں کوئی بڑا عارضہ لاحق نہیں تھا۔ ان کی غذا شروع ہی سے بہت کم ہوا کرتی تھی اور وہ اس بارے میں بڑے محتاط تھے۔ مسجد کی آبادی اور رونق انھی کے دم قدم سے تھی۔ وہ نمازیوں کا حال احوال معلوم کرنے اور تربیت کے علاوہ چھوٹے بچوں کو باقاعدہ قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ لاٹھی کے سہارے چلتے مگر مجال ہے کہ کسی بھی موسم میں مسجد سے غیر حاضر ہوئے ہوں۔ ماموں جان ہمیشہ اس زندگی کو سفر شمار کرتے اور خود کو مسافر! جب بھی ملاقات ہوتی ان کی زبان پر یہی الفاظ ہوتے کہ اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ اللہ سے استقامت اور خاتمہ بالایمان کی دعا کرو۔ میں جب بھی گاؤں جاتا، ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ ان سے دعاؤں کی درخواست بھی کرتا اور ان کا حال احوال بھی پوچھتا۔ وہ لاہور میں اپنے تمام اعزہ واقارب کے بارے میں ایک ایک کر کے ان کی خیریت دریافت کرتے۔ اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ میں گھر آیا ہوں تو میرے حاضر خدمت ہونے سے قبل وہ ہمارے گھر تشریف لے آتے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس محبت کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

مسافر جانبِ منزل

مجھے اس سال یو کے اسلامک مشن کے سالانہ کونشن اور اس کے بعد مختلف شہروں میں تربیتی پروگراموں کا دعوت نامہ ملا تھا۔ میں ۲۰؍ جولائی کو لاہور سے مانچسٹر روانہ ہوا۔ ماموں جان کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ انھیں ہیضے کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس سے جسم میں پانی کی کمی ہو گئی۔ چند دن ہسپتال داخل رہے اور پھر ٹھیک ہو کر گھر آ گئے۔ میں ٹیلی فون پر حال معلوم کرتا رہتا تھا۔ مختلف اعزہ واقربا اپنی اپنی رائے کے مطابق صورتِ حال بیان فرماتے مگر مجھے کچھ خدشات سے محسوس ہو

Marfat.com

رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ان کی انتڑیوں میں ٹی بی ہے، اس کا علاج ہو رہا تھا کہ اچانک انھیں ۱۸ راگست کو دل کا دورہ پڑا۔ اس سے پہلے انھیں عارضۂ قلب کی کبھی شکایت نہیں تھی۔ انھیں ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس حملے کی وجہ سے دل بہت بری طرح متاثر ہو گیا ہے۔ ماموں جان مسلسل کہتے رہے کہ مجھے گھر لے چلو یہاں ہسپتال میں کیا کر رہے ہو۔ ۱۹ راگست کو نمازِ عصر کے بعد بچوں سے ہسپتال میں پوچھنے لگے کہ مغرب کب ہوگی؟ انھوں نے کہا کہ ابھی آپ نے عصر کی نماز پڑھی ہے۔ مغرب میں ابھی کچھ وقت ہے، مگر وہ کہتے رہے کہ نہیں مغرب ہو گئی ہے۔ تکلیف کے باوجود ہوش میں تھے اور ذکر اذکار ان کی زبان پر معمول کے مطابق جاری تھے۔ مغرب کی نماز سے قبل ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جنازے سے محرومی

میں مانچسٹر میں نماز جمعہ سے فارغ ہوا تو موبائل پر مس کالز دیکھیں، اسی وقت میری چھوٹی حس نے کہا کہ ماموں جان داغِ مفارقت دے گئے ہیں۔ رابطہ کرنے پر یہی خبر ملی۔ جنازے پر پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں بن رہی تھی۔ تمام احباب واعزہ سے رابطہ کر کے مشورہ کیا اور یہی طے پایا کہ چونکہ جنازے میں میں نہیں پہنچ سکوں گا، اس لیے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہی رختِ سفر باندھا جائے۔ غریب الدیاری میں یہ صدمہ دل پر کچوکے لگا رہا تھا۔ جنازے سے محرومی کا احساس مزید پریشان کن تھا مگر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ صبر ہی مومن کی ڈھال ہے! برطانیہ میں دوستوں کو اطلاع ملی تو ہر جگہ سے تعزیت کے ٹیلی فون آنا شروع ہوئے۔ ریڈلے (نیلسن) جہاں میں اپنے عزیز میاں غلام سرور کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا، یہاں پر موجود میرے عزیز واقارب کے علاوہ پاکستانی احباب اور تحریکی ساتھی بھی تعزیت کے لیے آنے لگے۔

نیک گواہیاں، سرمایہ آخرت

ان چند دنوں میں ہر روز تعزیت کرنے والوں کی آمد و رفت رہی۔ یہاں ہمارے گاؤں اور دیگر قریبی دیہات کے لوگ بڑی تعداد میں مقیم ہیں۔ ہمارے علاقے کے تمام لوگ ماموں جان کو

Marfat.com

اچھی طرح جانتے تھے، وہ سب ان کی خوبیوں کا تذکرہ کر رہے تھے اور مجھے اس غریب الدیاری میں اس صدمے کے باوجود یہ تسلی مل رہی تھی کہ اللہ کے نیک بندے کے حق میں لوگوں کی یہ گواہیاں ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوں گی۔ ماموں جان حافظ غلام محمد کو اللہ نے دو بیٹے دیے تھے۔ پہلا بیٹا ابھی شیر خوار ہی تھا کہ اللہ نے واپس لے لیا۔ دوسرا بیٹا میاں خالد الحمدللہ ان کا جانشین ہے۔ خالد کا بھی ایک ہی بیٹا ہے اور وہ بھی ماشاء اللہ حافظ قرآن ہے۔

برطانیہ سے واپسی پر جب گاؤں گیا تو یہاں بھی پھر سے تعزیت کرنے والوں کی آمد و رفت رہی۔ مسجد میں گیا، رمضان کے آخری ایام تھے، الحمدللہ مسجد نمازیوں سے آباد تھی۔ معتکف حضرات بھی رونق افروز تھے۔ تراویح میں مرد و خواتین کی کافی تعداد ہوتی تھی مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے ماموں جان کے بغیر مسجد سونی سونی لگ رہی تھی۔ ان کا دل ہر وقت مسجد ہی میں لگا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسجد میں دیکھے گئے، گویا وہ مسجد کے لیے روح رواں تھے۔ مرحوم مصلے کی زینت اور مسجد کے لیے روح رواں تھے۔ آبائی قبرستان گیا اور تمام اہل ایمان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ ماموں جان کی قبر پر حاضر ہوا تو لگا جیسے مرحوم قبر میں بھی قرآن پڑھ رہے ہوں۔ مسنون اور قرآنی دعاؤں کے ساتھ اہل قبور کو الوداع کہا اور بوجھل قدموں کے ساتھ زندگی کے معمولات کی طرف پلٹ آیا۔ قبریں یاد دلاتی ہیں کہ مہلت سے فائدہ اٹھا لو اور کچھ زادِ سفر جمع کر لو۔ یہ مہلتِ عمل بہت تھوڑی ہے، اللہ ہم سب کو تیاری کرنے کی توفیق بخشے۔ اللہ مرحوم کی تمام حسنات کو قبول فرمائے اور انسانی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

Marfat.com

جنتی روح، سعد بن بشیر

(۱۹۸۱ء-۲۰۱۱ء)

سپیشل بچہ

انسان کی زندگی میں کتنے ہی احباب سے رابطہ و ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ سب کی یادوں کا عالم اور کیفیت الگ الگ ہوتی ہے۔ بعض انسان اس دھرتی پر یوں آتے ہیں جیسے ہوا کا تازہ جھونکا اور پھر پلک جھپکنے میں یہ جادہ جا، آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہی نفوس پاکیزہ ایسے ہوتے ہیں کہ دنیا والے ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے مگر وہ اپنے اللہ کے ہاں مقبول و محبوب قرار پاتے ہیں۔ آج ایک ایسے ہی نوجوان کا تذکرہ پیش نظر ہے۔ وہ پیدائشی طور پر ایک لحاظ سے معذور تھا۔ نہایت بھولا بھالا، نیک دل اور محبت کا جواب محبت سے دینے والا نوخیز پاکستانی اور مخلص مسلمان! میرے پوتوں سے عمر میں بڑا مگر ان کے ساتھ ہم قدم اور ان کا ہم جولی۔ ان کے ساتھ اپنی سمجھ کے مطابق بزمِ پیغام کے پروگراموں میں شرکت کرنے والا۔ اس کا نام بہت پیارا تھا اور چہرہ مہرہ نہایت حسین، سرخ و سفید رنگت۔ والدین نے اس کا نام رسول پاکؐ کے صحابہؓ کے نام پر سعد رکھا۔ سعد نام کے کئی صحابہ کرام تھے اور ہر ایک کے کارنامے عظیم الشان و یادگار ہیں۔

پیغام ڈائجسٹ کا محبّ

سعد اکثر ہمارے گھر آتا، دروازے پر گھنٹی بجاتا اور پوچھتا طلحہ بھائی ہے؟ اگر طلحہ موجودہ ہوتا تو اس سے پیغام ڈائجسٹ کا مطالبہ کرتا، نہ ہوتا تو خزیمہ بھائی کے بارے میں استفسار کرتا۔ اس کی غیر موجودگی کا سن کر بھی اصرار کے ساتھ رسالہ طلب کرتا۔ اسے جو رسالہ بھی دے دیا جاتا لے کر خوش ہوتا اور چلا جاتا۔ رسالے کے بغیر جانا اس کے لیے بڑا مشکل ہوتا تھا۔ میرے خیال

Marfat.com

میں وہ زیادہ پڑھ لکھ نہ سکتا تھا مگر اردو زبان کی شد بد رکھتا تھا، اس لیے رسالے کی ورق گردانی ضرور کرتا۔ یہ سادہ نوجوان جمعیت اور بزم پیغام کے علاوہ جماعت کے پروگراموں میں بھی شرکت کرتا۔ مجھ سے پوچھتا رہتا کہ باہر سے مہمان کب آ رہے ہیں؟ اس کا مطلب ہوتا تھا کہ مرکز کی ماہانہ تربیت گاہ کب ہو رہی ہے۔ اس تربیت گاہ میں بھی وہ شرکت کرتا۔ مسجد میں آتا تو نماز اپنی سمجھ کے مطابق ادا کرتا جس میں کوئی ترتیب اور تنظیم نہ ہوتی مگر اہل فہم واصحابِ تفقہ جانتے تھے کہ اس کی یہ حرکات وسکنات بھی اللہ کے ہاں بہت سے زیرک نمازیوں سے بہتر ہیں۔ ایسی ذہنی کیفیت کے باوجود اس کا مسجد سے یہ رشتہ ہی بذاتِ خود اس کی عظمت اور اللہ کے ہاں اس کے اعلیٰ مقام کی واضح اور بیّن دلیل تھی۔ یہ نوخیز غنچہ ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۱ء کو مرجھا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اس کی وفات پر اس کا ہر جاننے والا انتہائی غمزدہ ہوا۔ اس کے والدین اور اعزہ پر تو جیسے قیامت گزر گئی۔

خاندانی تعارف

یہ نوجوان جس کا تذکرہ آج موضوعِ گفت گو ہے، رکنِ جماعت جناب ملک بشیر احمد صاحب کا لختِ جگر تھا۔ ملک صاحب خود اس سانحۂ ارتحال کے دنوں میں ایک حادثے کی وجہ سے ہسپتال میں تھے اور چلنے پھرنے سے معذور! ملک صاحب اپنے پیارے بیٹے کی یادوں کے دیپ جلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میرا آبائی ضلع جہلم ہے۔ میرے والد صاحب مولوی محمد حسین استاد تھے۔ ہمارا گھرانا متوسط درجے کا تھا۔ کچھ زمینیں بھی تھیں جو کہ بٹائی پہ کاشتکار عزیزوں کو دی ہوئی تھیں۔ والدہ اَن پڑھ تھیں اور ہمیشہ بھینس وغیرہ دودھ کے لیے گھر میں رکھتی تھیں۔ ہم چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ سب سے بڑے بھائی محمد اقبال میٹرک پاس کر کے فوج میں بھرتی ہوئے اور اکیس سال کی عمر میں ۱۹۴۵ء میں پونا (انڈیا) میں فوت ہو گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ دوسرے بھائی عبدالعزیز ائیر فورس میں ۱۰ سال سروس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ تیسرے بھائی عبدالرشید ائیر فورس میں سکواڈرن لیڈر تھے۔ میرے والد صاحب ۱۹۵۵ء میں فوت ہوئے۔ میں بھائیوں

Marfat.com

میں سب سے چھوٹا تھا۔ والد کی وفات کے بعد بھائیوں نے ہی مجھے پڑھایا۔ میں نے گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی سے ۱۹۶۰ء میں ایف ایس سی کی۔ پھر بڑے بھائی سکواڈرن لیڈر نے اپنے پاس پشاور بلا لیا۔ چار سال میں ان کے پاس رہا۔ ۱۹۶۲ء میں میں نے بی ایس سی ایڈورڈز کالج پشاور سے کی اور ۱۹۶۴ء میں ایم ایس سی (فزکس) پشاور یونیورسٹی سے کی۔ ۱۹۶۴ء میں ہی واپڈا منگلا ڈیم پر بھرتی ہو گیا۔ ۱۹۶۷ء میں منگلا ڈیم مکمل ہوا تو ہمیں ڈیم میں مختلف ڈیوٹیوں پہ لگا دیا گیا۔

تحریک اسلامی سے رشتہ

۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی کا حلقہ منگلہ کالونی میں قائم ہو گیا۔ جماعت اسلامی جہلم اور جماعت اسلامی میرپور کا ہم سے پورا رابطہ تھا۔ دونوں طرف سے امرائے جماعت ہمارے پاس آتے اور ان کے دروس بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مزدوروں میں جماعت کا کام منظم ہو۔ شروع میں ہم پندرہ بیس افراد تھے۔ بعد میں اس میں اضافہ ہو گیا۔ ہمارے محسن فیض محمد بھٹی بہاولپوری اس وقت ایگزیکٹو انجینئر تھے، ان کے گھر میں ہر ہفتہ درسِ قرآن ہوتے۔ انھوں نے ہم ساتھیوں کو لاہور سے تفہیم القرآن کے سیٹ قسطوں پر لا کر دیے۔ اس وقت مطالعہ کا رجحان آج کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ ہم سب ساتھی جماعت کا لٹریچر شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ پھر میں رکنِ جماعت بھی بن گیا۔

پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی

ملازمت ملنے کے بعد ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو میری شادی ہو گئی۔ میری اہلیہ صفیہ بیگم بھی گریجوایٹ ہیں۔ ان کے والد ملک عالم الدین صاحب ایڈووکیٹ، ایم اے، ایل ایل بی تھے۔ اللہ نے مجھے یکے بعد دیگرے پانچ بیٹیاں عطا فرمائیں۔ پانچ بہنوں کے بعد محمد سعد بشیر ۱۹ر جنوری ۱۹۸۱ء کو منگلا میں پیدا ہوا۔ واپڈا کا ہسپتال نزدیک ہی تھا لیکن بچے کی اچانک پیدائش کی وجہ سے ہم ہسپتال نہ پہنچ سکے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو بتایا کہ نومولود کے دماغ کو پیدائش کے وقت کم آکسیجن ملی ہے جس کی

Marfat.com

وجہ سے وہ ذہنی لحاظ سے پس ماندہ رہ گیا ہے۔ پیدائش کے وقت اس کے پاؤں بھی مڑے ہوئے تھے، جن کا علاج کرانے کے لیے ہم اسے سی ایم ایچ منگلا میں ڈاکٹر سرجن کرنل نذیر کے پاس لے گئے۔ اس وقت سعد چند دن کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے پاؤں کو سیدھا کر کے پلستر کر دیا۔ یہ سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نذیر نے ہمیں فوجی فاؤنڈیشن راولپنڈی میں سپیشل افراد کے لیے تیار کردہ ہارڈ اور لانگ شوز کے لیے بھیجا۔ کئی سال تک یہ شوز استعمال کرنے کے بعد اس کے پاؤں کافی حد تک سیدھے ہو گئے۔ عام آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ اس کے پاؤں ٹیڑھے تھے مگر غور سے اس کی چال کو دیکھ کر کسی حد تک اس کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

تعلیم

شروع میں تو منگلا پراجیکٹ ہائی سکول میں جہاں اس کی بہنیں پڑھتی تھیں اسے داخل کرایا گیا۔ اسے پہاڑے ۱۶ تک یاد تھے اور اردو بھی کچھ پڑھ لیتا تھا لیکن زیادہ ترقی نہ کی۔ حساب کے سوالات بھی کر لیتا تھا۔ جب ۱۹۹۶ء میں میری ٹرانسفر بطور سینئر ریسرچ افسر لاہور میں ہوئی تو ہم نے اسے سپیشل ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ سنٹر جوہر ٹاؤن میں ڈاکٹر خالدہ ترین کے سکول میں داخل کرا دیا۔ وہاں اس نے مختلف شعبوں میں کام کیا لیکن زیادہ وقت اس نے محمود بیگ صاحب کے شعبہ بلاک پرنٹنگ میں گزارا۔ گھر میں بھی ہم نے اس کے لیے بلاک پرنٹنگ کا بندوبست کیا تھا۔

خدمت خلق

میری ڈیوٹی بطور رکن جماعت گذشتہ کئی سالوں سے گلزار منصورہ میں عید الاضحیٰ پر کھالیں جمع کرنے کی تھی، جس میں سعد میرے ساتھ شریک ہوا کرتا تھا۔ عید کے تینوں دن قربانی کی کھالیں جمع کیا کرتا تھا۔ ہم دونوں عید کے دن نمازِ عید کے فوراً بعد ساری کالونی کا چکر لگایا کرتے تھے اور سائیکل پر کھالیں جمع کیا کرتے تھے۔ وہ سائیکل لے کر میرے ساتھ جاتا اور نئے کپڑوں کی بھی پروا نہیں کرتا تھا کیونکہ کھالیں جمع کرتے وقت کپڑوں پہ خون بھی لگ جایا کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے کھالوں کے لیے بحث مباحثہ بھی کیا کرتا کہ کھالیں جماعت اسلامی کو دیں کیوں کہ یہی جماعت

Marfat.com

اخلاص کے ساتھ خدمت خلق کا کام کر رہی ہے۔ ہم ہر سال تقریباً ۴۰ تا ۴۵ کھالیں اپنی کالونی سے جمع کر لیا کرتے تھے۔

کھیل کے میدان میں

پنجاب اولمپک کی سالانہ کھیلوں میں وہ ہر سال سپیشل بچوں کی ۵۰ میٹر کی دوڑ اور سافٹ بال میں حصہ لیتا تھا اور ہر سال ان گیمز میں دو میڈل جیتا کرتا تھا۔ اس طرح پانچ سالوں میں اس نے گولڈ، سلور اور کانسی کے دس میڈل جیتے۔ سعد کی پہچان اس کی پاکستانی گرین کیپ تھی۔ اس کا لباس شلوار قمیص، سفاری سوٹ، پینٹ شرٹ، ٹی شرٹ اور زیادہ تر پاکستان کا سبز رنگ کا ٹراوزر اور سبز ٹی شرٹ ہوا کرتی تھی۔ سعد کو کرکٹ کے ساتھ جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ جب کبھی کرکٹ میچ ہوتا تو پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کپڑے پہن کر میچ دیکھا کرتا تھا۔ جب کوئی لڑکا اسے کرکٹ کے حوالے سے چھیڑتا کہ انضمام الحق مر گیا ہے تو بہت غصے کا اظہار کرتا۔ جب پاکستان کرکٹ میچ ہار جاتا تو وہ ٹی وی کی سکرین پہ مکے مارا کرتا۔ کئی دفعہ ٹی وی ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ پاکستان کی فتح کی صورت میں وہ یہ خوش خبری ہر خاص و عام کو سناتا اور انتہائی پر جوش مسرت کا اظہار کرتا تھا۔

مہم جوئی

سعد ابھی چھوٹا ہی تھا کہ ہم منصورہ آ گئے۔ وہ زیادہ وقت منصورہ میں گزارا کرتا تھا۔ ایک دفعہ فجر کی نماز پڑھنے میرے ساتھ منصورہ مسجد گیا۔ میں درس سننے کے بعد جب گھر آیا تو وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ میں نے ادھر ادھر تلاش کیا تو کہیں نہ ملا۔ سب بہنوں کے گھروں سے پتہ کرایا۔ منصورہ مسجد میں اعلان کرایا لیکن کہیں سراغ نہ ملا۔ ساڑھے تین بجے بعد دوپہر جہلم سے ایک رکشے والے کا فون آیا کہ آپ کا بیٹا سعد بشیر بلال ٹاؤن میں میرے رکشے میں بیٹھا ہے اور بلال ٹاؤن جہلم میں موجود ہے۔ ہم نے اس کی اطلاع ملنے پہ اللہ کا شکر ادا کیا۔ بلال ٹاؤن میں میرا بھتیجا عبدالقیوم رہتا تھا۔ میں نے اسے رکشے والے کا پتہ دیا تو وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ بعد میں سعد نے بتایا وہ سٹوڈنٹ بن کر ویگنوں اور بسوں میں سفر کرتا جہلم پہنچا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے پاس صرف بیس روپے تھے جو

Marfat.com

بالکل محفوظ تھے۔ رکشے والے کو سعد نے گھر کا فون نمبر بتایا، جس سے ہمیں اس کا پتہ چلا۔

شوقِ سفر

میرا بھانجا مسعود احمد بھی جہلم میں رہتا تھا، وہ اسے اپنے گھر چشتیاں محلّہ میں لے آیا۔ ان کے گھر گجرات سے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہ صبح گجرات کے لیے نکلے تو سعد بھی گھر والوں کو بتائے بغیر الگ سے اپنے طور پر گجرات جانے کے لیے نکلا۔ گجرات میں تو اسے کسی گھر کا پتہ نہ تھا۔ گجرات پہنچ کر ایک رکشے والے کو پکڑا اور تین چار گھنٹے رکشے میں چکر لگاتا رہا۔ بعد میں جب رکشے والے کو احساس ہوا کہ اسے تو گھر کا پتہ بھی معلوم نہیں ہے تو اس نے سعد سے گھر کا فون نمبر لے کر ہمیں لاہور ٹیلیفون کیا۔ پتہ چلنے پر میں نے جہلم اپنے بھانجے کو فون پر بتایا کہ سعد اس وقت فلاں جگہ موجود ہے۔ رات کو ہی مسعود اسے عشا کے بعد جہلم لے آیا۔

گم شدگی اور بازیابی

پہلے وہ گھر سے باہر نہیں جاتا تھا ایک دفعہ اس کا خالہ زاد بھائی واجد حسن جہلم سے آیا۔ انھی دنوں اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیگم کو لے کر لاہور کی سیر کے لیے آیا تھا۔ ایک دن انھوں نے چڑیا گھر کی سیر کا پروگرام بنایا تو سعد نے ان سے کہا کہ مجھے بھی تمھارے ساتھ سیر کے لیے جانا ہے لیکن وہ نہ لے کر گئے۔ وہ ایک دو بجے دن گھر سے نکلے تھے۔ سعد بھی ان کے پیچھے جانے کی جستجو میں لگا رہا اور عصر کی نماز منصورہ میں پڑھنے کے بعد وہ ہمیں بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ ہم نے مسجد میں اعلان کرایا تو کئی ساتھیوں نے بتایا کہ اسے چونگی ملتان روڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ہم بہت پریشان تھے کہ اسے کہاں تلاش کیا جائے کیونکہ رات ہو چکی تھی اور اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ محترم حافظ محمد ادریس صاحب بھی اس کے بارے میں پریشان تھے۔ آخر رات ساڑھے گیارہ بجے وہ واپس گھر آ گیا۔ ہم نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا کہ وہ بخیریت واپس پہنچ گیا ہے۔ ہم نے حافظ صاحب کو بھی اطلاع کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس نے بعد میں بتایا کہ وہ پہلے ویگن کے ذریعے سیکرٹریٹ پہنچا، وہاں سے چڑیا گھر جانے والی بس میں سوار ہوا۔ چڑیا گھر میں اپنے

Marfat.com

عزیزوں کو تلاش کیا تو وہ اسے وہاں نہ ملے۔ گھومتے گھماتے وہ آگے باغ جناح چلا گیا۔ وہاں بھی ان کے نہ ملنے پر مال روڈ سے بس میں فورٹریس سٹیڈیم چلا گیا۔ وہاں انھیں تلاش کرتا رہا۔ جب وہ نہ ملے تو واپس بس کے ذریعے سیکرٹریٹ پہنچا اور وہاں سے ویگن میں خود ہی منصورہ پہنچ گیا۔

اعزاز

وہ شروع میں ڈاکٹر خالد جمیل صاحب (بگ برادر) کے پاس زیر علاج رہا تھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ پی ٹی وی پر سپیشل بچوں کے لیے پروگرام بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ انھوں نے اسے پروگرام میں شرکت کے لیے بلایا۔ ہم گھر والوں کو بھی پروگرام کے پاسز (Passes) بھیجے۔ اس وقت سعد کے پاس سات میڈل تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے انعام کے طور پر سات سو روپے دیے اور کچھ اور تحائف بھی دیے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کئی لحاظ سے معذور و ناتواں ہونے کے باوجود اللہ نے سعد کو کئی کامیابیوں اور اعزازات سے سرفراز فرمایا۔

حادثے پہ حادثہ

ماہِ ستمبر میں سعد کو بخار ہو گیا جو شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ ۲۸ ستمبر ۲۰۱۱ء کو میں نماز پڑھنے منصورہ جا رہا تھا اور گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے اپنی بیٹی کو کہا کہ سعد کو لے آنا۔ نماز کے بعد میں اسے منصورہ ہسپتال میں چیک کرا لوں گا۔ بدقسمتی سے سڑک پار کرتے ہوئے مجھے موٹر سائیکل سوار نے ٹکر مار کر گرا دیا اور میرے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے مجھے اٹھا کر کرسی پہ بٹھایا۔ میں نے ۱۱۲۲ اور گھر موبائل پر اطلاع دی تو گھر والے پہنچ گئے، اتنے میں ۱۱۲۲ کی ایمبولینس بھی آ گئی، اور مجھے واپڈا ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ سعد کو اگلے دن ہسپتال میں دکھایا گیا تو ڈینگی کی تشخیص ہوئی۔ میرے ایکسیڈنٹ پر سعد بہت پریشان ہوا کیونکہ میں ہی اس کو لے کر گھر سے باہر جایا کرتا تھا۔ پہلے تو گھر پر ہی اس کا علاج جاری رہا۔ ۵/اکتوبر کو اسے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا اور ۷ اور ۸/اکتوبر کو اس کا Gangrene کا اپریشن ہوا۔ ۹ اور ۱۰/اکتوبر کو وہ انتہائی نگہداشت (ICU) میں رہا۔ ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۱ء کی شام کو وہ ہمیں روتا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

Marfat.com

جنت مکین

وہ تو اب بھی پھولوں میں مسکراتا اور تاروں میں جگمگاتا ہوگا۔ اب بھی ہوا اس کی خوشبو لے کر آتی ہے اور دل کی دھڑکن کے در کھٹکھٹاتی ہے اور اس کی یاد ہماری ڈھارس بندھاتی ہے۔ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن ہر لمحے اس کی یاد اک نئی شمع جلاتی ہے۔ حافظ محمد ادریس صاحب کے بقول وہ ایک بہشتی روح تھی جو ربع صدی سے زائد ہمارے گھر میں رہی، پھر اچانک ہمیں اداس و غمگین کر کے جنت کو سدھار گئی۔ اللہ اس کی قبر کو نور سے بھر دے اور ہمارے لیے باعثِ نجات بنا دے۔ سعد آج ہم میں نہیں۔ ہم اس کی پیاری پیاری باتوں کو یاد کرتے ہیں۔ آج اسے تقریباً ایک سال ہونے کو ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ وہ یکدم کہیں سے اچانک گھر آ جائے گا۔ منصورہ والے سب احباب اس کو یاد کرتے ہیں کیونکہ وہ سب نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کیا کرتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ سب ساتھیوں سے مصافحہ کیا جائے۔

خلا جو پر نہ ہو سکے

سعد قاضی حسین احمد صاحب اور حافظ محمد ادریس صاحب سے تو بے پناہ محبت کیا کرتا تھا۔ اکثر کہتا میرا نکاح حافظ صاحب سے پڑھوانا ہے۔ میں نے ان سے کہہ رکھا ہے۔ سعد کی وفات پر حافظ صاحب ہمارے گھر آئے اور ہم سب اہل خانہ کو بہت زیادہ تسلی دی اور سعد کے متعلق اپنی یادوں کے کئی واقعات ہم کو سنائے۔ اللہ نے مجھے کئی نواسے عطا کیے ہیں۔ اللہ ان سب کو سلامت رکھے مگر سچی بات یہ ہے کہ سعد کی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوتی۔ اس کی والدہ اور بہنیں ہی نہیں، خاندان کے جملہ ارکان اور اعزہ واحباب اسے یاد کرتے ہیں۔ اللہ ہم کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔"

ملک صاحب کے داماد اور سعد مرحوم کے بہنوئی جناب اعجاز علی ندیم نے بھی مرحوم کے بارے میں اپنے قلبی تاثرات وجذبات کا اظہار کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"منصورہ کا تارا! سعد ہمارا!

سعد بھائی...... بزم پیغام کا شاہین بننے کے بعد ہر وقت منصورہ کی گلیوں میں اس فکر میں رہتا

Marfat.com

کہ آج بزم کا پروگرام کہاں ہے کہ مجھے اس میں شرکت کرنا ہے۔ اس کی جیب مختلف چیزوں سے ہمیشہ اٹی (بھری) رہتی تھی۔ میں کئی دفعہ شغل لگانے کے لیے اس سے پوچھتا کہ سعد بھائی! مجھے چیک کراؤ کہ آپ نے اس میں کیا کیا بھرا ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ شرارتی مسکراتی آنکھوں سے جواب دیتا کہ نہیں نہیں! بزم پیغام کے میسج / پیغام ڈائجسٹ/ وغیرہ۔

سعد بھائی! بچپن سے نیک دل، پاکیزہ طبیعت، ہمیشہ نیکی کے کاموں میں دلچسپی لینے کے لیے بے تاب رہتا۔ میرا اس سے تعلق اکتوبر ۲۰۰۲ء سے لے کر آج ۱۰ را کتوبر ۲۰۱۱ (۸ سال) رہا۔ اس دور پر نظر ڈالتا ہوں تو ہر وقت تصور میں، تخیل میں یہی جواب آتا ہے کہ یہ یقیناً جنتی بچہ ہے۔ سعد بھائی! بچپن سے ذہنی طور پر معذور ہونے کے باوجود خوبصورت اور نیک سیرت تھے، چہرہ ہر وقت کھلا رہتا اور کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب!

داعی حق

محلے کا ہر بچہ سعد بھائی سے بہت پیار کرنے والا اور سعد بھی ان کے ساتھ کبھی کھیل کے میدان میں، کبھی بزم پیغام کے پروگرام میں کبھی منصورہ میں جماعت کے پروگرام میں نظر آتا۔ کسی پروگرام سے کبھی بھی پیچھے نہ رہتا تھا۔ اس کی طبیعت میں نیکی، خیر خواہی تھی۔ ہر ایک سے محبت کے ساتھ کہتا کہ آپ ہمارے گھر آئیں نا! پہلی دفعہ اس سے ملنے والا یہ سمجھتا کہ یہ بچہ ہمیں پہلے سے جاننے کی وجہ سے اپنے گھر میں آنے کی دعوت دے رہا ہے۔ محلّہ میں بزم پیغام کے ہر پروگرام میں باقاعدگی سے شرکت اپنا فرض سمجھ کر شریک ہونا اور دوسرے بچوں کو اس کی دعوت دینا اس کے لیے بے تاب رہنا اس کی خصوصیت تھی۔ ہر ماہ باقاعدگی سے پیغام ڈائجسٹ اپنے جیب خرچ سے خرید کر دوسرے بچوں میں تقسیم کرتا تھا۔ ابو کے ساتھ جماعت کے تمام پروگراموں میں باقاعدہ شرکت کے ساتھ ساتھ محلے میں پروگراموں کے دعوت نامے خود تقسیم کرتا تھا۔ محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب (مرحوم) نے برہان مسجد میں ماہانہ تفہیم القرآن کا پروگرام شروع کیا جو ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو ہوا کرتا تھا۔ سعد اس کا منتظر ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں لوگوں کو شرکت کی دعوت بھی دیا کرتا تھا۔

سعد بھائی! ۱۰ را کتوبر ۲۰۱۱ء کو ڈینگی بخار کی وجہ سے اپنے پیاروں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اللہ

Marfat.com

کے پاس چلے گئے ہیں لیکن ان کی وفات کے بعد منصورہ میں تمام محلے دار بچے، بڑے کسی نہ کسی صورت میں سعد بھائی کی یادیں تازہ کرتے رہتے ہیں۔ سعد بھائی جیسا بچہ جو کہ نیک و صالح طبیعت، بری بات پر فوری ٹوکنے والا ہو کم ہی مل سکے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ والدین کی تربیت کے پیش نظر وہ اپنے والدین کے لیے مغفرت کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ اس پر اپنا خاص کرم فرمائے۔ آمین''

اعجاز علی ندیم صاحب نے اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے، سعد کو جاننے والا ہر شخص کم و بیش ایسے ہی تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔

مثالی رکن

محترم ملک بشیر صاحب ہمارے بہت پیارے دوست اور جماعت کے مثالی رکن ہیں۔ جس حادثے میں زخمی ہوئے، اس کے بعد سے جامع مسجد منصورہ میں ان کی آمد و رفت بہت ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ ہر نماز باجماعت اور اگلی صف میں ادا کیا کرتے تھے۔ نمازِ فجر کے بعد درس میں باقاعدہ قرآن مجید کھول کر درس سنتے اور درس کے بعد الگ سے سوالات بھی پوچھا کرتے تھے۔ اللہ ان کو ایسی صحت عطا فرمائے کہ وہ پھر سے مسجد میں نظر آیا کریں۔ نماز کے بعد وہ باقاعدہ اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کیا کرتے تھے اور دلچسپ گفت گو کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ملک صاحب جماعت کے کسی پروگرام سے کبھی غیر حاضر ہوئے ہوں۔ سعد بھی ان کے ساتھ ہر پروگرام میں شرکت کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم جمعیت، بزم پیغام اور جماعت کی مرکزی تربیت گاہ کا بھی مستقل شریک تھا۔ مجھے مسجد میں ہر نماز کے بعد آکر ملتا اور یاددہانی کراتا کہ اس کا نکاح مجھے پڑھانا ہوگا۔

دم بھر کی ملاقات اور دائمی ساتھ

سعد کی وفات پر میں ملک صاحب کے گھر حاضر ہوا تو مرحوم کی والدہ اور بہنیں بھی مجھے بتا رہی تھیں کہ وہ آپ کو بہت یاد کیا کرتا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ میرا نکاح حافظ صاحب پڑھائیں گے۔ میں نے کہا ''اللہ نے اس کے لیے جنت کی حوریں مقدر کر رکھی تھیں۔ وہ ایک جنتی روح تھی جو آپ کے

Marfat.com

گھر میں آپ کے درمیان اپنا عرصہ مستعار گزار کر اپنے اصلی گھر چلی گئی۔ مرحوم کی والدہ کا حوصلہ دیکھ کر میں نے ان کے لیے ڈھیروں دعائیں کیں۔ وہ اپنے اسلاف اور دورِ سعید کی صحابیات کی طرح صبر کی مثال بن کر سامنے آئیں۔ اللہ ان کے بیٹے کو جنت الفردوس میں ان سے ملا دے۔ دنیا میں تو یوں ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دم بھر کے لیے آیا اور پھر داغِ مفارقت دے گیا مگر آخرت کی دائمی زندگی میں اللہ جنت مقدر کر دے تو ہمیشہ کا ساتھ ہوگا جہاں راحت ہی راحت ہوگی اور کوئی غم و پریشانی نہ ہوگی۔ سعد کو یاد کرتا ہوں اور اس کی قبر کا تصور سامنے آتا ہے تو حضور پاکؐ کی یہ حدیث ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ ''پھر جنت کا ایک دروازہ اس کے سامنے کھول دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا: دیکھو! یہ ہے تمھاری مستقل قیام گاہ اور ایسی ہیں اس کی نعمتیں۔ صاحبِ قبر بہت زیادہ خوش ہوگا۔ پھر اس کے سامنے جہنم کا ایک دروازہ کھلے گا اور اس سے کہا جائے گا: دیکھو! اگر تم نے دنیا میں خدا کی نافرمانی کی ہوتی تو یہ آگ کا گھر تمھاری قیام گاہ بنتا، اور اس میں طرح طرح کے عذاب تجھے جھیلنے پڑتے۔ یہ بات سن کر صاحبِ قبر (مومن) بہت زیادہ خوشی اور مسرت کا اظہار کرے گا۔ اس کے بعد اس کی قبر ستر (۷۰) گز وسیع کر کے روشن کر دی جاتی ہے اور صاحبِ قبر کا جسم پہلے کی طرح ہو جاتا ہے۔ (یعنی اس کی روح نکال لی جاتی ہے۔) پھر اس کی روح کو ایک پاکیزہ ہوا کا روپ دے دیا جاتا ہے جو ایک پرندے کی شکل میں جنت میں اڑتا اور اس کے درختوں کے پھل کھاتا پھرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یوں فرمایا: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ۔ (ابراہیم ۱۴:۲۷) ''اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کو ایک قولِ ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت دونوں میں ثبات عطا فرماتا ہے۔''

(حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اس کا ایک حصہ ہم نے یہاں نقل کیا ہے بحوالہ ترغیب وترہیب حدیث نمبر ۵۴۶۶)

Marfat.com

فاروق حسن گیلانی

(۱۹۴۸ء-۲۰۱۱ء)

عظیم باپ کا عظیم بیٹا

قافلۂ سخت جاں کے صاحبِ عزیمت راہی سید احمد حسن اسعد گیلانی محض قافلے کے ایک راہ رو ہی نہیں تھے، معرکہ آرا کتاب ''قافلۂ سخت جاں'' کے مؤلف بھی تھے جو فروری ۱۹۶۵ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر علامہ اقبال کا شعر لکھا تھا:

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

مرحوم کا تذکرہ تحریک کے ہر گھر میں اور ہر اجتماع میں کسی نہ کسی مناسبت سے ہوتا رہتا ہے۔ جناب سید اسعد گیلانی ۳/اپریل ۱۹۹۲ء کو داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے بیوہ کے علاوہ ایک ہی بیٹا اپنا جانشین چھوڑا تھا، جو نیک نام و نیک نہاد اور نامور باپ کی طرح وسیع و عریض حلقے میں نہ سہی، خود اپنی خوبیوں کی وجہ سے کافی بڑے حلقے میں معروف اور مقبول تھا۔ فاروق حسن گیلانی مجھ سے تین سال چھوٹا تھا اور جامعہ پنجاب میں مجھ سے دو سال جونیئر تھا۔ دورِ طالب علمی میں ہی اس کے ساتھ بے تکلفی کا ایک تعلق قائم ہوا، جو اس نے آخری لمحات تک خوب نبھایا۔ فاروق حسن گیلانی اسلامی جمعیت طلبہ کے باقاعدہ رکن اور رفیق تو نہیں تھے مگر بہت اچھے اور فعال کارکن، نہایت قیمتی مشورے دینے والے ساتھی اور خطرات کے وقت ڈٹ جانے والے مجاہد تھے۔

طلبہ سیاست

مجھے آج بھی یاد ہے کہ ملک میں پیپلز پارٹی کے قیام اور اس تاثر کے بعد کہ نوجوان اور طلبہ

Marfat.com

سب کے سب بھٹو صاحب کے شیدائی ہیں، جامعہ پنجاب میں بائیں بازو کے طلبہ نے غیر فطری انداز میں اچانک پر پرزے نکالے۔ یہ وہ دور تھا جس دور میں لاہور جمعیت کی ذمہ داری راقم کے سپرد تھی اور پورا شہر اور تمام جامعات و کالج ایک ہی نظم کے تحت تھے۔ جامعہ پنجاب میں ہماری مختلف مہمات جاری رہتی تھیں۔ بعض پروگراموں کی مزاحمت کے لیے بائیں بازو کے عناصر اکٹھے ہو جایا کرتے تھے جنھیں لبرل اور سیکولر طبقات کی حمایت بھی حاصل ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ اولڈ کیمپس اور نیو کیمپس میں تصادم کی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایسے مواقع پر فاروق حسن گیلانی ہمارے ساتھ شانہ بشانہ جدوجہد کا حصہ ہوتا تھا۔ اس کا لنگوٹیا یار اور ہرفن مولا حسین پراچہ بھی ایسے مواقع پر کسی سے پیچھے نہ رہا کرتا تھا۔ فاروق حسن مرحوم انتہائی ذہین اور محنتی طالب علم تھا مگر اس کے ساتھ بڑا سوشل اور اجتماعی معاملات میں دلچسپی لینے والا نوجوان بھی تھا۔ اس کا اپنا ایک حلقۂ یاراں تھا جس میں ذہین اور ادبی ذہن رکھنے والے طلبہ شامل تھے۔ ۱۹۷۰ء میں جب مجھے طلبہ یونین جامعہ پنجاب کے انتخاب میں اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے صدارتی امیدوار نامزد کیا گیا تو نیو کیمپس میں فاروق حسن گیلانی نے بڑی انتھک محنت سے اپنے شعبے کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی جمعیت کے لیے کام کیا۔ انسان کی زندگی میں بعض واقعات و حادثات ایسے ہوتے ہیں کہ وقت گزرنے کے باوجود ان کے نقوش مدہم نہیں ہوتے۔ انھی میں سے ایک منظر آج بھی مجھے یاد آتا ہے جب ایک جلوس کے دوران مخالفین کے ایک بے ہنگم ہجوم نے اپنے کلچر کے مطابق نعرے لگانے شروع کیے تو فاروق حسن گیلانی نے بے ساختہ آگے بڑھ کر مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔ میں نے اسے بہت کہا کہ وہ ایسا نہ کرے مگر معلوم نہیں اس وقت اس کے دست و بازو میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہا اور اپنے شعبے سے جلسہ گاہ تک مجھے کندھوں پر اٹھائے رکھا۔

کھرا اور صاف گو نوجوان

فاروق حسن گیلانی چونکہ نظم کا باقاعدہ حصہ نہیں تھے، اس لیے وہ جمعیت کے فیصلوں میں تو شریک نہیں ہوتے تھے البتہ سیاسی معاملات میں اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے اور ہر چیز کو تنقیدی و

Marfat.com

تکنیکی بنیادوں اور اصولوں پر پرکھتے۔ اسعد صاحب کے ساتھ بھی وہ اسی طرح علمی مباحثہ کیا کرتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ اسعد صاحب کی وجہ سے بھی اور خود ان کی اپنی خوبیوں کے سبب بھی ایک خاص تعلق خاطر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مرحوم نے جمعیت کے کسی فیصلے پر تند و تیز تنقید کی۔ میں نے ان کی بات کو بڑی توجہ سے سنا اور مسکراتا رہا۔ مجھے طنزیہ انداز میں کہنے لگے میں جانتا ہوں میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور پرنالہ وہیں رہے گا کیونکہ آپ نے مسکرا کر میری بات کو ڈیفیوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرحوم کی یہ بات سن کر میں بے ساختہ ان کی طرف لپکا اور انھیں اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ ان کا ہر انداز دل کو بھاتا اور پیارا لگتا تھا۔ اس موقع پر میں نے کہا پیارے فاروق بھائی، آپ اپنے والدین کے اکلوتے چاند ہیں۔ آپ کے ناز نخرے سر آنکھوں پر۔ اس پر فاروق فرمانے لگے کہ اسعد صاحب بھی اسی طرح میرے دلائل کو ڈیفیوز کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ فاروق صاحب بہت کھرے، مخلص، صاف دل، صاف گو اور بے تکلفی سے بات کرنے والے دوست تھے۔

دیانت دار مسلمان، اعلیٰ سرکاری افسر

برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ میں نے اسعد صاحب اور فاروق گیلانی کو ایک دوسرے کے ساتھ بہت بے تکلفی سے گفتگو کرتے سنا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو دوست آپس میں پیار و محبت کے ساتھ اپنے اپنے موقف کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنائیت، شفقت اور احترام کی حدود قائم رہتیں مگر دلائل پیش کرنے میں کوئی رکھ رکھاؤ نہ ہوتا تھا۔ علمی شخصیات کی یہی عظمت و وجاہت ہوتی ہے کہ ان کے ہاں وسعتِ نظر و ظرف ہوتی ہے۔ فاروق حسن گیلانی نے اسعد صاحب کی زندگی ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ سعد ابن اسعد کے قلمی نام سے ان کی نگارشات منظر عام پر آتی تھیں۔ مرحوم کی تحریروں میں پختگی و شگفتگی اور بے ساختہ پن ہوتا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میں صحرانوردی کرتا رہا اور فاروق ڈبل ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد پی سی ایس اور پھر سی ایس ایس کے امتحانات میں کامیاب ہوئے اور اعلیٰ

Marfat.com

مناصب پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت مرحوم سینئر وفاقی سیکرٹری کے منصب پر فائز تھے۔ تحریکی گھرانے کا یہ سپوت اللہ کے فضل وکرم سے اعلیٰ مناصب پر فائز رہا مگر اس کے دامن پہ کرپشن کا کوئی دھبہ نہیں تھا۔ الحمدللہ!

محبوب بیٹے کی وفات اور مامتا کا امتحان

اسعد صاحب کی وفات کے بعد سے محترمہ بیگم اسعد گیلانی منصورہ میں مقیم ہیں۔ سالہا سال قبل انھوں نے اپنی خدمات منصورہ میں قائم جامعۃ المحصنات کو اعزازی طور پر پیش فرما دیں۔ آج کے دن تک خاندانی صدمات، صحت کی کمزوری اور بزرگی کے باوجود جامعہ کی سرپرستی فرما رہی ہیں۔ اللہ انھیں صحت و عافیت کے ساتھ رکھے۔ ان کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کی اچانک مفارقت کتنا بڑا صدمہ ہے، اس کا تصور ہر صاحب اولاد اور حساس شخص بخوبی کر سکتا ہے، بالخصوص مائیں! انسان کی زندگی خوشیوں اور غموں کا گل دستہ ہے۔ بوڑھی مامتا کے لیے یہ بلاشبہ ایک بڑا امتحان ہے مگر مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ میری بیٹی سمیہ اور میری بھانجی خولہ یونی ورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جامعۃ المحصنات میں تدریسی فرائض ادا کرنے لگیں۔ بیگم اسعد میری دونوں بچیوں سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ بلاشبہ ماں اور بیٹی کے تعلق کی اصطلاح ان پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ فاروق بھائی کی اچانک وفات کی جب اطلاع ملی تو خیال یہی تھا کہ ان کی نماز جنازہ منصورہ میں ہوگی لیکن چونکہ ان کی وفات اسلام آباد میں ہوئی تھی اور ان کے بچے بھی اب مستقل طور پر راولپنڈی ہی میں رہائش پذیر ہیں، اس لیے ان کا جنازہ وہیں پڑھنے کا فیصلہ ہوا۔ بیگم اسعد صاحبہ کو فون پر فاروق کے بیمار ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ وہ فوراً ڈرائیور کے ساتھ اسلام آباد روانہ ہوگئیں۔ راستے میں انھیں اس صدمہ جاں کاہ سے مطلع کیا گیا۔ ہر لمحہ پہاڑ بن گیا اور ہر پل قیامت! راقم کو بڑا ملال ہے کہ اپنے دوست اور بھائی کے جنازے میں شریک نہ ہوسکا۔

اہل وعیال سے تعزیت

ایک دو روز کے بعد فاروق مرحوم کے گھر پر حاضری دی۔ بزرگ بھائی، عالم دین مولانا معروف

Marfat.com

شیرازی صاحب اور دیگر جماعتی احباب ورفقا ساتھ تھے۔ محترمہ بہن بیگم فاروق اور عزیزم عمر فاروق پسر فاروق حسن و دیگر اعزہ سے ملاقات بھی ہوئی اور تعزیت بھی کی مگر محترمہ آپا صاحبہ بالائی منزل پر تھیں اور غم سے نڈھال۔ خواہش کے باوجود ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ واپس منصورہ آ کر اس انتظار میں تھا کہ آپا جی منصورہ آئیں تو اپنی بچیوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری ہو۔ گھر کی خواتین تو ان کے آنے پر ان کے پاس تعزیت کے لیے گئیں مگر میں اس وقت منصورہ میں موجود نہیں تھا۔ سمیہ بیٹی، جو ان سے تعزیت ہی کے لیے گاؤں سے آئی تھی، نے پروگرام بنایا کہ خالہ جان کی خدمت میں آپ کے ساتھ چلوں گی مگر مختلف پروگراموں کی وجہ سے تاخیر ہوئی تو سمیہ واپس چلی گئی۔ خولہ نے آپا جی سے بات کی تو انھوں نے فرمایا کہ میں تو منتظر ہی ہوں۔ حافظ صاحب جب چاہیں میرے ہاں آجائیں اور اپنے دوست اور بھائی، میرے لخت جگر کی یادیں تازہ کریں۔ پروگرام کے مطابق خولہ بیٹی عصر سے قبل آپا جی کے گھر پہنچ گئی اور مجھے فون کیا، چنانچہ میں نماز عصر پڑھتے ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپا جان ثقل سماعت کی وجہ سے کافی اونچا سنتی ہیں۔ ان سے اظہار تعزیت کیا۔ فاروق بھائی کے لیے دعائے مغفرت کی۔ خولہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ فرمانے لگے کہ خولہ چونکہ میرے ساتھ رابطے میں رہتی ہے، اس لیے اس کی آواز سننا اور سمجھنا میرے لیے آسان ہے۔ بعض باتیں جو میری زبان سے نہ سن سکیں وہ خولہ نے ان کے گوش گزار کیں۔ غمزدہ ماں کا حوصلہ بلاشبہ قابلِ تقلید اور اسلاف کی یادگار تھا۔ مرحوم کی اہلیہ، بچوں اور ماں نے صبر کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ یہی اللہ کے ہاں باعث اجر ہے اور اسی سے دلوں کی ڈھارس بندھتی ہے۔

ام فاروق کے جذبات واحساسات

میں نے آپا جان کی خدمت میں فاروق بھائی کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے اور اسلام آباد میں حاضری کا تذکرہ کیا تو فرمانے لگیں آپ کے چلے جانے کے بعد مجھے آپ کی آمد کی اطلاع ملی۔ مجھے افسوس ہوا کہ آپ مجھ سے ملاقات کیے بغیر ہی چلے گئے۔ اگر مجھے اس وقت معلوم ہو جاتا تو میں ضرور آپ سے ملاقات کرتی۔ میرے ایک سوال پر فرمانے لگیں کہ اسعد

Marfat.com

صاحب کے برادر بزرگ سید صدیق الحسن گیلانی آچھ گوچھ ضلع گجرات سے جالندھر بسلسلہ ملازمت منتقل ہوئے جبکہ ہمارا خاندان لدھیانہ میں مقیم تھا۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی بھی وہاں چلے آئے۔ بزرگوں کے ساتھ ان کا تعارف ہوا، اسی کے نتیجے میں اسعد صاحب کے ساتھ میرا رشتہ طے پایا۔ میں نے اسعد صاحب کو ایک مثالی مسلمان اور عظیم انسان پایا۔ وہ صحیح معنوں میں اللہ کے مومن بندے تھے۔ ان کے ساتھ میری زندگی کے ماہ وایام، گرم وسرد ہر طرح کے حالات میں بہت اچھے گزرے۔ فرمانے لگیں کہ میں آٹھ بہنوں میں سے چھٹے نمبر پر تھی۔ پانچ مجھ سے بڑی اور دو مجھ سے چھوٹی تھیں۔ اللہ نے سب بہنوں کو کثیر العیال بنایا مگر مجھے اکلوتا فاروق ہی عطا کیا۔ یہ بات کرتے ہوئے آپا جان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ فرمانے لگیں فاروق نے جب چلنا اور بولنا سیکھا تو جو بھی مہمان گھر میں آتا، اسے کہتا میں ہی بڑا ہوں اور میں ہی چھوٹا ہوں۔ نہ مجھ سے کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ غالباً اسعد صاحب کے کسی مہمان نے ان سے بچوں کے بارے میں سوال پوچھا ہوگا کہ فاروق کا کوئی بھائی بہن اس سے بڑا یا چھوٹا ہے تو انھوں نے یہ جواب دیا ہوگا، جس کو فاروق نے خوب استعمال کیا۔ فرمانے لگیں کہ بالکل چھوٹی عمر میں اسے کلمہ طیبہ اور بعض چھوٹی چھوٹی قرآنی سورتیں یاد کرائی گئیں۔ وہ سورۃ کوثر بڑے شوق سے بلند آواز سے پڑھا کرتا تھا۔ گھر میں ایک مرتبہ اسعد صاحب کا کوئی مہمان آیا تو اس نے فاروق سے پوچھا کہ کوئی تلاوت سنا سکتے ہو تو جواب دیا کیوں نہیں اور پھر سورۃ کوثر کی تلاوت کی۔ اس کے بعد اس کا معمول بن گیا کہ جب بھی کوئی مہمان گھر آتا، اسے کہتا میں تلاوت کروں۔ ایک دن اسعد صاحب کہنے لگے یار تمھاری انا اعطینا بہت سن لی ہے اب کچھ اور بھی سنایا کرو۔

حسین بچپن!

فاروق بہت ذہین انسان تھا۔ اس کی بچپن کی باتیں اس کی ذہانت کی عکاس ہیں۔ آپا جی نے بتایا کہ فاروق کے سامنے بچپن میں اگر کسی قرآنی آیت کا پہلا حصہ تلاوت کیا جاتا تو آخری حصہ وہ مکمل کر دیا کرتا تھا۔ سکول جانے لگا تو ہر مضمون بخوبی سمجھ لیتا تھا۔ ایک بار سبق پڑھ لینے کے بعد

Marfat.com

اسے دہرانے کی کم ہی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اللہ نے بہت اچھا حافظہ اور اعلیٰ ذہانت عطا فرمائی تھی۔ اول سے آخر تک تمام امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرتا رہا۔ ایم اے کے بعد پی سی ایس (P.C.S) کیا پھر سی ایس ایس (C.S.S) بھی کرلیا۔ پھر شوقیہ ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کرلیا حالانکہ اسے پریکٹس وغیرہ نہیں کرنی تھی۔ میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ سول سروس میں جائے۔ اس پر اس نے یہ لائن اختیار کی۔ انتہائی دیانت دار افسر تھا۔ خود کہا کرتا تھا ''امی میں ہی جانتا ہوں کہ اس حمام میں خود کو ننگا ہونے سے بچانا کس قدر مشکل کام ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ساری زندگی رزقِ حلال میں قطرۂ حرام نہیں گرنے دیا۔'' آپا جی نے ایک اور بہت دلچسپ اور ایمان افروز بات بتائی۔ فرمانے لگیں فاروق کی عمر چار سال تھی۔ میرے ساتھ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ میں اسے سلا رہی تھی۔ میں نے اسے جنت کے بارے میں کہانی سنائی اور جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا جنت میں کون لوگ جاتے ہیں، میں نے کہا جو اہل ایمان اور نیک لوگ وفات پاجاتے ہیں وہ جنت میں چلے جاتے ہیں، دوسرے روز میرے ساتھ لیٹا ہوا تھا تو کہنے لگا امی ہم کب مریں گے۔ میں نے پوچھا کیوں تو کہنے لگا کہ جنت میں جانا ہے نا۔ آپا جی کی یہ باتیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے کہا'' واہ سبحان اللہ ننھا فاروق جنت کا طلب گار تھا۔ ۶۳ سال دنیا کی امتحان گاہ میں گزار کر جنت کو سدھار گیا۔ اللہ اس کے درجات بلند فرمائے۔''

پیارا انسان

سید فاروق حسن گیلانی ۱۷ رجون ۱۹۴۸ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت اسعد صاحب کراچی میں مقیم تھے۔ اسعد صاحب مختلف مقامات پر تحریکی ذمہ داریوں کی وجہ سے گھومتے رہے۔ یوں ان کی بیوی اور بچے کو بھی کئی مقامات پر رہنے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ فاروق اپنی طبیعت کے لحاظ سے بہت حلیم و خوش گفتار اور مہمان نواز تھے۔ ان کے تمام دوست ان کی اس صفت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ چہرے مہرے سے بھی بھلا انسان لگتا تھا اور اس کی گفت گو بھی بہت پیاری ہوتی تھی۔ مرحوم پنڈی، اسلام آباد سے جب کبھی منصورہ آتے تو فجر کی نماز کے بعد

Marfat.com

معمول کا درس سنتے اور پھر سیر کرتے۔ میرا معمول بھی سیر کرنے کا تھا مگر میں قدرے تیز چلنے کا عادی ہوں اس لیے سیر کرتے ہوئے باہم کراسنگ ہوتی تو سلام اور مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ آپس میں کسی موضوع پر گفتگو شروع ہو جاتی تو ہم ایک ساتھ سیر کے دوران گھوم پھر لیتے۔ انھیں کسی بات سے اتفاق ہوتا یا اختلاف، انداز ایسا شائستہ، مہذب اور دل نشین ہوتا کہ لطف آ جاتا۔ ان کے انداز گفتگو سے بعض اوقات ان کے والد مرحوم، ہمارے تحریکی راہ نما، سید اسعد گیلانی بے ساختہ یاد آ جاتے۔

ہیروں کی کان

فاروق مرحوم کی بیٹی مریم گیلانی سول سروس میں اچھے منصب پر فائز ہیں۔ بدعنوان نظام میں دیانت دار افسروں کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہ کچھ ہوا تو انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ دوسری طرف زرداری صاحب کے اتحادی اور اے این پی کے لیڈر غلام احمد بلور (وفاقی وزیر ریلوے) تھے۔ مریم گیلانی نے نہ صرف ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا بلکہ یہ کیس جیت کر ایک ریکارڈ بھی قائم کیا۔ اس پر میں نے ایک مضمون لکھا تو فاروق صاحب نے اس پر خصوصی شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو اور آپ کی وساطت سے بیٹی کو مبارک باد دیتا ہوں۔ دراصل اس نے ایک سرکاری ملازم ہوتے ہوئے مرکزی وزیر کے خلاف یہ سٹینڈ لے کر دبکے ہوئے افسران کو بھی ایک پیغام دے دیا ہے اور منہ زور طبقہ مترفین کے منہ پر بھی طمانچہ مار دیا ہے۔ ہیروں کی کان میں ہیرے ہی ہوتے ہیں۔ اس پر فاروق اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر ہنسے۔ فاروق حسن گیلانی کی شادی ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ ان کی رحلت کے بعد ان کے گھر حاضر ہوا تو ان کی اہلیہ فرزانہ باجی ان کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اشک بار ہوگئیں۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ بے حد احترام و محبت کا رویہ رکھتے تھے۔ دونوں تہجد گزار اور نماز روزے کے پابند مگر اس کے ساتھ سب سے بڑی نیکی یہ کہ اپنی والدہ بیگم اسعد گیلانی کو اس قدر احترام دیتے کہ وہ اب بھی ان کے واقعات سناتے ہوئے دونوں کے لیے سراپا دعا بن جاتی ہیں۔ یہی اصل کامیابی ہے۔ سچ ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔

Marfat.com

انفاق فی سبیل اللہ

بیگم اسعد نے مجھ سے فرمایا کہ حافظ صاحب، آپ نے خواتین کے ایک اجتماع میں اپنی قائم کردہ فلاحی تنظیم ''شہدائے اسلام فاؤنڈیشن'' کا تعارف کرایا اور ٹرسٹی بننے کی دعوت و ترغیب دی تھی۔ اس موقع پر میں نے شہدائے اسلام فاؤنڈیشن کی ٹرسٹی بننے کا فیصلہ کیا تو فاروق نے فوراً ایک لاکھ روپیہ ادا کر دیا۔ میں نے دونوں میاں بیوی سے کہا کہ جامعۃ المحصنات میں بہت سی مستحق بچیاں ہوتی ہیں جو اپنی فیس ادا نہیں کر پاتیں۔ دونوں میاں بیوی نے کئی بچیوں کو سپانسر کیا۔ فرزانہ اب بھی اپنے حصے کی فیس باقاعدگی سے ادا کرتی ہیں۔ فاروق نے وفات سے کچھ روز قبل کہا کہ امی یہ چوبیس ہزار روپے فیس کی مد میں وصول کر لو۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ مال و دولت اللہ کی دی ہوئی امانت ہوتی ہے۔ اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرنا کبھی اسے کم نہیں کرتا۔ یہ نکتہ اللہ والوں ہی کو سوجھتا ہے۔

اپنا گھر، سکونِ جسم و جاں

بیگم اسعد یادوں کے دیپ جلاتے ہوئے فرمانے لگیں کہ اسعد صاحب اور فاروق دونوں کو گھر بنانے کا کوئی شوق نہیں تھا جب کہ مجھے یہ شوق تھا کہ اپنا گھر ہو۔ چنانچہ میرے ہی اصرار پر اسعد صاحب نے منصورہ میں گھر بنایا۔ اسی طرح فرزانہ کو بھی اپنے گھر کا شوق تھا۔ میں اور وہ جب بھی فاروق سے بات کرتیں تو کہتا کہ سرکاری گھر بہت اچھا ملا ہوا ہے، گھر بنانے کے لیے پلاٹ اور تعمیرات کا خرچہ بہت زیادہ ہے اور بچت اتنی ہوتی نہیں ہے۔ آخر ہمارے اصرار پر ایک پلاٹ قسط وار ادائیگیوں سے خریدا، پھر اپنی کچھ زمین بیچ کر گھر بنا لیا۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ بچے اپنے گھر میں رہ رہے ہیں۔ معقول پنشن بھی ملتی ہے کوئی مالی مشکل نہیں مگر فاروق کی کمی کیسے پوری ہو۔ فاروق مجھے ہر روز فون کرتا تھا اور کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ رات کو مجھے فون کیا اور اگلے روز اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میں ہمیشہ فاروق کے لیے درازیٔ عمر کی دعا کیا کرتی تھی مگر اللہ کو یہی منظور تھا کہ وہ میرے بڑھاپے میں مجھے داغِ مفارقت دے گیا۔ سوچتی ہوں یہ صدمہ کیسے برداشت ہوگا اور غم کے یہ ماہ و سال کیسے بیتیں گے؟ بس اللہ ہی اصل سہارا ہے۔ اسی سے سب کچھ مانگتی ہوں، وہی مسبب

Marfat.com

الاسباب ہے۔ اس کے فیصلوں میں اس کی اپنی حکمتیں ہوتی ہیں۔ سچ ہے ''اللہ بس، باقی ہوس۔''

ماں کی دلجوئی

فاروق اپنی ماں کا بے پناہ خیال رکھتا تھا۔ اسعد صاحب کی وفات کے بعد تو اس نے ان کو ہر طرح کی راحت پہنچانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ آپا جی فرماتی ہیں، میری دلجوئی میں کبھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا تھا۔ وہ میرے کپڑے خود بڑے شوق سے خریدتا۔ میں کہتی کہ میرے پاس کپڑوں کی کمی نہیں تو کہتا امی جب تک آپ کے کپڑے نہ خریدوں مجھے اپنے کپڑے خریدنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ایک بار مجھ سے کہا کہ آپ گاڑی بدل لیں۔ میں نے کہا کیوں؟ میری گاڑی اچھی بھلی ہے، تو اصرار کرنے لگا۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ میں خود اپنی گاڑی بدلنا چاہتا ہوں مگر پہلے آپ کی گاڑی تبدیل کرنا ضروری ہے۔ بیٹے کے اس حسن سلوک میں اس کے بیوی بچوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ آپا جی اپنی بہو کے لیے رطب اللسان تھیں۔

آخری لمحات

فاروق اپنے معمول کے مطابق سحری کے وقت اٹھتا، پھر نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن، پھر ناشتہ اور اخبار بینی۔ آخری روز اپنی بیٹی مریم سے فون پر بات کر رہا تھا کہ فون کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ اسی لمحے موت کا فرشتہ نمودار ہو گیا تھا۔ مریم نے ادھر سے کافی حال احوال پوچھا مگر جب کوئی جواب نہ آیا تو اسے فکر لاحق ہو گئی۔ یوں ماں باپ کا یہ اکلوتا بیٹا اپنی والدہ، بیوی اور بچوں کو سوگوار چھوڑ کر ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ بیگم اسعد گیلانی کہتی ہیں کہ پچھلی مرتبہ جب میں عید پر گئی تو مجھے کہا امی! میری کوئی بھی چھوٹی موٹی غلطی ہو تو مجھے معاف فرما دیجیے۔ میں نے کہا بیٹا مجھے تو یاد نہیں تم نے کبھی غلطی یا گستاخی کی ہو، تم کس بات کی معافی طلب کرتے ہو۔ کہنے لگا جو کچھ بھی ہے آپ یہ فرما دیں کہ آپ نے مجھے معاف کیا۔ واقعی فاروق عظیم انسان تھا۔

ناموسِ رسالت کا پروانہ

مرحوم کی تینوں بیٹیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اکلوتا بیٹا عزیزم عمر فاروق ابھی زیر تعلیم ہے۔ اللہ

Marfat.com

تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے اور اسے اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ عزیزم عمر فاروق ایم بی اے کر رہا ہے۔ فاروق نے ۶۳ سال عمر پائی، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تھی۔ وہ ناموس رسالت کا پروانہ تھا اور اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل ناموسِ رسالت ہی کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ امی علما اور مذہبی لوگوں نے تو ممتاز قادری کی حمایت قدرے دیر سے کی ہے۔ مریم نے تو سب سے پہلے اس کے حق میں کالم لکھا۔ فاروق کی وفات بالکل اچانک ہوئی، اس لیے اس کے چاہنے والوں کو بھی بے پناہ صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند فرمائے اور اس کے پسماندگان کو صبر جمیل کے ساتھ اس کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھنے کی توفیق بخشے۔

جن والدین کے بچے ان کے بڑھاپے میں داغِ مفارقت دے جاتے ہیں، ان کی زندگی انتہائی دکھ اور غم میں گزرتی ہے۔ اس صدمے کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس ابتلا میں ڈالا جاتا ہے مگر اس پر صبر کا اجر بھی بے انتہا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں اولاد کی وفات کے صدمے برداشت کیے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کا بیٹا فوت ہوا تو نبی پاکؐ نے ان کو یمن میں خط بھیجا جس میں لکھا ”اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام۔ تم پر سلامتی ہو۔ میں اللہ کا شکر اور اس کی حمد وتعریف کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ تم بھی اللہ کا شکر اور اس کی تعریف کرو۔

اللہ تعالیٰ تمھیں اجر عظیم دے اور تمھیں صبر دے اور ہمیں اور تمھیں شکر کی توفیق بخشے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور مال اور بال بچے یہ سب اللہ کی خوشگوار نعمتیں ہیں اور یہ ہمارے پاس اللہ کی رکھی ہوئی امانتیں ہیں۔ جب تک یہ تمھارے پاس رہیں مسرت اور خوشی تمھیں ملے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارا ایک بیٹا تم سے واپس لے لیا ہے۔ اس صدمے پر اللہ تمھیں اجر عظیم سے نوازے۔ تمھارے لیے خدا کی رحمت اور انعام اور ہدایت ہو، اگر تم نے اجرِ آخرت کی نیت سے صبر کیا۔ پس تم صبر کرو اور دیکھو! تمھاری بے قراری اور بے صبری سے کوئی مرنے والا لوٹ کر نہیں آسکتا اور نہ غم دور ہو سکتا ہے اور جو حادثہ واقع ہوا ہے اسے تو ہونا ہی تھا۔ والسلام۔“

Marfat.com

عبدالوحید خان مرحوم

(۱۹۲۷ء-۲۰۱۱ء)

گلستان مودودی کا پھول

جماعت اسلامی کے ابتدائی رکن اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے دیرینہ رفیق عبدالوحید خان مرحوم طویل عرصے تک اپنے اخلاق و کردار اور علم و عمل کی ضوفشانی کے بعد ۲۵ رجون کو نماز مغرب کے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ وفات کی خبر سن کر بے ساختہ زبان پہ یہ فقرہ آیا" گلستانِ مودودیؒ کا ایک اور پھول مرجھا گیا" مگر پھر اچانک خیال آیا کہ بندۂ مومن کے لیے تو موت ایسے ہی ہے جیسے قید خانے سے رہائی مل جائے۔ پس وہ اب جنت کے باغات میں رونق افروز ہوں گے۔ آمین یارب العالمین۔ حق تعالیٰ مغفرت کرے، مرحوم بلا شبہ عظیم انسان اور بہت پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ خان صاحب کو میاں طفیل محمد مرحوم سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ ان کی وفات پر میں نے ان کو بہت غمزدہ اور اشکبار دیکھا۔ میاں صاحب کے ٹھیک دو سال بعد اسی تاریخ اور اسی وقت پر خان صاحب بھی وفات پا گئے۔ ان سے پہلا تعارف دور طالب علمی میں ہوا۔ میں اسلامی جمعیت طلبہ لاہور کا ناظم تھا اور چودھری غلام جیلانی مرحوم امیر ضلع تھے۔ لاہور جماعت کا دفتر ان دنوں نیلا گنبد میں تھا اور ہمارا دفتر بھی بالکل قریب سعید منزل انارکلی میں تھا۔ عموماً عصر کی نماز کے بعد کسی بھی مسئلے پر مشورے کے لیے جیلانی صاحب کی خدمت میں حاضری ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اتنی محبت کرتے تھے کہ بعض اوقات بغیر کسی وجہ کے بھی ان سے ملنے کو طبیعت مچلنے لگتی تھی۔ یہیں عبدالوحید خان صاحب سے ذاتی تعارف ہوا اور جس اپنائیت اور محبت کے ساتھ خان صاحب ملے، وہ پہلا تاثر زندگی بھر دل سے محو نہ ہو سکا۔

Marfat.com

نیک سیرت، نیک نہاد

خان صاحب کو پہلی مرتبہ براہ راست دیکھنے کا اعزاز ۱۹۶۳ء میں نصیب ہوا تھا، جب جماعت اسلامی کا کل پاکستان اجتماع عام بھاٹی گیٹ میں منعقد ہوا۔ اس میں گولی چلی اور حکومتی غنڈہ گردی کے نتیجے میں اللہ بخش شہید ہوئے۔ خان صاحب کا نام جماعت کے مکتبے سے چھپنے والی کتابوں میں بچپن ہی میں پڑھ رکھا تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے خان صاحب کو دیکھا تو بے ساختہ دل میں خیال گزرا کہ فرشتے اگرچہ کبھی دیکھے نہیں مگر اسی شخص جیسے ہوتے ہوں گے۔ روشن چہرے پہ خوب صورت داڑھی جس میں سفید بال سیاہ بالوں کے درمیان سے کرنوں کی طرح چمک دکھا رہے تھے۔ شرافت و سنجیدگی چہرے اور حرکات و سکنات سے بالکل عیاں۔ یوں معلوم ہوا کہ یہ شخص سراپا خیر ہی خیر ہے۔ واقعی بعد کی زندگی میں انھیں تمام معاملات میں خیر ہی کا علم بردار پایا۔ مجلس میں بیٹھے ہوتے تو کسی بھی بات کرنے والے کی گفتگو کے دوران اس کی بات نہ کاٹتے۔ ہر بات توجہ سے سنتے اور پھر اپنی باری پر اپنی رائے کا اظہار بلا کم و کاست کر دیتے۔ میں نے جماعت میں آنے کے بعد مرکز اور صوبے میں ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے بھی خان صاحب کو کئی جماعتی مجالس میں دیکھا اور سنا اور پھر اسلامک پبلی کیشنز کے ہر اجلاس میں انھیں قریب سے دیکھا۔ وہ اپنی رائے کا اظہار تو پورے دلائل کے ساتھ کرتے تھے لیکن کبھی اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ فیصلہ انھی کی رائے کے مطابق ہوگا تو درست ہوگا۔ اسلامی شورائیت میں اس مزاج اور فطرت سلیمہ کی بڑی اہمیت ہے۔

ماہر قلم کار

رانا اللہ داد خان مرحوم جب اسلامک پبلی کیشنز کے مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے تو عبدالوحید خان صاحب کمپنی کے سیکرٹری کے طور پر کام کرتے تھے۔ خان صاحب اسلامک پبلی کیشنز کے تمام اجلاسوں کی کارروائی لکھا کرتے تھے اور اگلے اجلاس کے آغاز میں اسے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے اجلاس میں ان کی لکھی ہوئی کارروائی میں کبھی کوئی نقص یا کمی دیکھنے میں آئی ہو۔ خان صاحب نے جامعہ پنجاب کے شعبہ صحافت کے پہلے بیج میں

Marfat.com

ایم اے جرنلزم کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی طویل عرصے تک صحافت کی دنیا میں سرگرم عمل رہے تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق قلم کار تھے۔ جماعتی نظم کے تحت جب مجھے اسلامک پبلی کیشنز کے اعزازی چیئرمین کی ذمہ داری سونپی گئی تو تمام بزرگان، رانا اللہ داد خان صاحب، چودھری محمد اسلم سلیمی صاحب، عبدالوحید خان صاحب، پروفیسر محمد امین جاوید صاحب میرے لیے مربی و استاد کی حیثیت رکھتے تھے مگر مجھے رسمی طور پر ان اجلاسوں کی صدارت کرنا پڑتی تھی۔ عبدالوحید خان صاحب جب اپنی نشست سے اٹھ کر کارروائی پر دستخط کرانے کے لیے میری طرف بڑھتے تو میں انھیں منع کرتا کہ میں خود آ کر آپ سے رجسٹر لے لیتا ہوں مگر انھوں نے ہمیشہ اپنی یہ روایت قائم رکھی۔

بھائی جان

عبدالوحید خان صاحب، مولانا مودودیؒ، میاں طفیل محمدؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ جیسی نابغۂ روزگار شخصیات کے زیر تربیت رہے۔ مرحوم رائے بریلی (یوپی) کی ادب سے مالا مال تہذیب و ثقافت کے نمایندے اور اردو معاشرت کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ ادبی انداز میں اردوئے معلّٰی بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے اور تمام احباب سے ایسی اپنائیت کا اظہار فرماتے کہ ان کی وہ شیرینی مجلس برخاست ہونے کے بعد بھی قائم رہتی۔ مرحوم نے بریلی کے ایک معروف و معزز علمی و دینی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے آباو اجداد کسی زمانے میں افغانستان سے ہجرت کر کے آئے تھے اور قبائلی لحاظ سے پٹھان تھے۔ آپ کے والد مولانا عظیم الشان خان مرحوم، مشہور علمی و ادبی شخصیت تھے۔ اردو اور فارسی میں ان کا شاعرانہ کلام بھی تھا مگر اب ناپید ہے۔ بریلی میں خان صاحب اور ان کی برادری کے دیگر بہت سے خاندان محلّہ گلی نواباں میں مقیم تھے۔ آپ نے بالکل آغاز ہی میں، جماعت اسلامی کے قیام کے فوراً بعد، خود کو مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے سپرد کر دیا۔ مرحوم ۱۹۴۳ء میں جماعت کے رکن بنے۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ میں قیام کے دوران مولانا نے عبدالوحید خان صاحب کو میاں طفیل محمد صاحب کے ساتھ بطور معاون مختلف ذمہ داریاں تفویض کیں۔ مولانا اور میاں صاحب خان صاحب کی کارکردگی اور فرض شناسی سے ہمیشہ

Marfat.com

مطمئن و مسرور رہے۔ میاں صاحب کو خان صاحب بھائی جان کہا کرتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں جماعت کا لٹریچر مکتبہ جماعتِ اسلامی چھاپتا تھا اور اس کا اہتمام خان صاحب کیا کرتے تھے۔ بعد میں وہ کوہستان، مشرق اور اسلامک پبلی کیشنز میں بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

مرحوم بھائی کی یاد

قیامِ پاکستان کے بعد خان صاحب کا پورا خاندان پاکستان ہجرت کر آیا اور آپ کے بھائی بسلسلہ روزگار مختلف شہروں میں مقیم ہو گئے۔ عبدالعزیز خان صاحب پشاور اور بعد ازاں کراچی میں مقیم رہے۔ اسی طرح عبدالمجید خان صاحب بھی کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہونے کی وجہ سے کراچی ہی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ آپ کے ایک بھائی عبدالمعید خان ۱۹۵۴ء میں برطانیہ چلے گئے اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ آپ کی ایک بہن لاہور ہی میں مقیم تھیں۔ آپ کے سب بہن بھائی آپ سے پہلے وفات پا گئے۔ اپنے اہل و عیال کے درمیان مرحوم بہن بھائیوں کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک بھائی عبدالحمید خان جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ خان صاحب کو ان سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کے سب بیٹوں کے نام کے ساتھ خان صاحب کے اپنے نام کے بجائے آپ کے مرحوم بھائی عبدالحمید کا لاحقہ لگتا ہے۔ بعض لوگ آپ کے بیٹوں کو ان کے نام کے بعد وحید سے پکارتے ہیں مگر ان سب کے نام کے ساتھ حمید خان کا لاحقہ درست ہے۔ جماعت میں آنے کے بعد مولانا مودودی صاحب کے ساتھ آپ کا تعلق والد اور بیٹے جیسا ہو گیا تھا۔ مولانا نے انھیں کئی ذمہ داریاں سونپیں، جن میں مرکزی مکتبہ کی ذمہ داری کافی عرصہ رہی۔ کچھ عرصے کے لیے مرکزی ناظم بیت المال کے طور پر بھی انھیں خدمت کا شرف حاصل ہوا۔

مثالی تحریکی جوڑا

عبدالوحید خان صاحب تو مولانا مودودی کے ساتھ ہی ہجرت کر کے دارالاسلام سے لاہور آ گئے تھے۔ البتہ ان کے خاندان کے دیگر لوگ ۱۹۴۸ء کے لگ بھگ ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ آپ کی والدہ بھی جماعت کی زبردست حامی تھیں، اس وجہ سے ان کا پورا خاندان

Marfat.com

جماعت سے محبت کرتا تھا۔ خان صاحب نے اپنی والدہ کو مکمل اختیار دے رکھا تھا کہ وہ ان کے لیے جو بھی رشتہ تلاش کریں گی، وہ بخوشی اسے قبول کریں گے۔ خان صاحب کی والدہ نے مولانا مودودی کی اہلیہ سے تذکرہ کیا تو مولانا کے علم میں بھی یہ بات آئی۔ چنانچہ مولانا بھی ان کی شادی کے لیے مناسب رشتہ تلاش کرنے کے بارے میں بالکل اسی طرح فکرمند تھے جس طرح کوئی والد اپنے بیٹے کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ ایک مثالی جوڑا وجود میں آئے۔ چنانچہ مولانا نے ایک نوجوان تعلیم یافتہ یتیم بچی زہرا ملک کا رشتہ ان کے لیے منتخب کیا۔ زہرا ملک اٹک کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ بچپن میں یتیم ہوگئی تھیں اور اپنی والدہ اور دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ لاہور میں مقیم تھیں۔ ان کے بھائی ملک ریاض الحق اعوان بھی مولانا مودودی اور جماعت سے بہت متاثر تھے اور زہرا ملک کو تو یہ شرف حاصل تھا کہ انھوں نے براہِ راست مولانا مودودی سے قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تفسیر پڑھی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ مولانا مودودیؒ کے گھر میں اس کلاس میں ان کے علاوہ چار دیگر طالبات بیگم مودودی، بیگم ملک غلام علی، آپا ام زبیر اور آپا رخشندہ کوکب بھی ہوتی تھیں۔ واقعی مولانا مودودی کی یہ تمام طالبات ہر لحاظ سے عظیم تھیں۔

دو معاشرتی تہذیبوں کا حسین نمونہ

زہرا ملک کا خاندان اٹک کے پنجابی ماحول سے اور عبدالوحید خان صاحب کا خاندان یوپی سے تعلق رکھتا تھا مگر دونوں میاں بیوی کا کمال ہے کہ انھوں نے دو تہذیبی معاشرتوں کے امتزاج سے ایک مثالی خاندان کی بنیاد رکھی اور تمام تحریکی افراد کے لیے اعلیٰ مثال قائم کردی۔ زہرا ملک کے خاندان نے مولانا مودودی کی طرف سے رشتے کی تجویز بخوشی قبول کی اور ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو یہ مثالی تحریکی خاندان وجود میں آ گیا۔ خان صاحب کا نکاح مولانا مودودیؒ نے خود پڑھایا تھا اور بارات میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ، میاں طفیل محمدؒ، مولانا عبدالغفار حسنؒ، مولانا عبدالجبار غازیؒ، راجہ احسان الحقؒ، مولوی چراغ دینؒ اور مرکز جماعت کے کئی احباب شامل تھے۔ خان صاحب کی طرف سے ولیمے کا اہتمام مولانا مودودیؒ نے اپنے گھر میں کیا اور یہ تقریب اتنی سادہ اور پرشکوہ تھی

Marfat.com

کہ بزرگ احباب ہمیشہ اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ خاص بات یہ کہ مولانا مودودیؒ کے گھر میں جو خانساماں تھا، اس نے کھانا تیار کیا اور خواتین کو بیگم مودودی نے خود کھانا اپنے ہاتھوں سے پیش کیا جبکہ مردوں کی مہمان نوازی کے دوران مولانا مودودیؒ بنفس نفیس مسلسل نگرانی کرتے رہے۔

نیک والدین، سعادت مند اولاد

شادی کے بعد دونوں میاں بیوی نے پوری زندگی تحریک اسلامی کے لیے وقف کردی۔ زہرا ملک اب زہرا وحید اور آپا زہرا کے نام سے تحریکی حلقوں میں معروف ہوگئیں۔ ہمارے تحریکی بزرگوں کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے خوب مالا مال کیا۔ مولانا خلیل حامدی کے چودہ بچے ہیں، نو بیٹے اور پانچ بیٹیاں جبکہ میاں طفیل محمد صاحب کے بارہ بچے ہیں جن میں آٹھ بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مثالی جوڑے کو تیرہ بچے عطا فرمائے۔ ان میں چار بیٹے اور نو بیٹیاں ہیں۔ ماشاء اللہ مرحوم کے سبھی بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ، شادی شدہ، خوش حال اور صاحب اولاد ہیں۔ خان صاحب کے بیٹوں کے نام راشد حمید خان (ڈپٹی جنرل منیجر پی آئی اے کراچی)، ناصر حمید خان (ڈپٹی ڈائریکٹر واپڈا لاہور)، عامر حمید خان (ڈائریکٹر مسعود ٹیکسٹائل ملز فیصل آباد) اور ڈاکٹر عمار حمید خان (اسسٹنٹ پروفیسر میو ہسپتال۔ ماہر امراضِ قلب) ہیں۔ واضح رہے کہ خان صاحب کے ایک بھائی عبدالحمید خان جوانی میں وفات پا گئے تھے، ان کے نام اور یاد کو تازہ و زندہ رکھنے کے لیے خان صاحب نے تمام بیٹوں کے نام کے ساتھ ان کے نام کا لاحقہ لگایا۔ خان صاحب ہی کی طرح ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کی بیشتر شادیاں خالص تحریکی بنیادوں پر ہوئی ہیں۔ خان صاحب کے بچے اور بچیاں مختلف شہروں میں مقیم ہیں۔ خان صاحب سب بچوں کو وقت دیا کرتے تھے۔ جب وہ کسی کے ہاں چلے جاتے تو گویا اس گھر میں عید ہو جاتی۔ مختلف ایام کی مناسبت سے خان صاحب اپنے بچوں اور بچیوں کو گھر پر بھی بلاتے رہتے تھے۔ یوں جب سب بچے اکٹھے ہوتے تو خان صاحب اور آپا زہرا کی خوشیاں دیدنی ہوتی تھیں۔ ان کے تمام بچے رطب اللسان ہیں کہ وہ ہر ایک کو شفقتِ پدری کی شیرینی بانٹتے تھے۔ پوتوں، نواسوں کے درمیان بیٹھ کر انھیں

Marfat.com

بے پناہ خوشی ہوتی تھی۔ان کی وفات پر میں ان کے گھر گیا تو ان کے بہت سے پوتے اور نواسے استقبال کے لیے موجود تھے۔ان سب نے اپنی یادداشتوں کے دبستان کھولے تو معلوم ہوا کہ خان صاحب کس قدر شفیق اور ہر دلعزیز تھے۔

سنگ لاخ وادیاں اور ثابت قدم مسافر

جماعتی اور تحریکی زندگی میں خان صاحب نے قید و بند کی صعوبتیں بھی کمال جرأت و استقامت کے ساتھ برداشت کیں۔ ۱۹۵۳ء میں مولانا مودودیؒ کے ساتھ تقریباً دو سال جیل میں رہے۔ ایوبی آمریت میں ۱۹۶۴ء میں چند ماہ اور بھٹو دور میں تحریک نظامِ مصطفےٰ میں بھی چند ماہ پسِ دیوارِ زنداں رہے۔واجپائی کی آمد کے موقع پر ۱۹۹۹ء میں ہمارے ساتھ گرفتار ہوئے اور چند ہفتے بعد دیگر تمام بزرگان کے ساتھ رہا ہوئے۔ان کے ساتھ محمد یوسف خان صاحب اور میرے والد گرامی میاں فیض محی الدین مرحوم بھی تھے۔عبدالوحید خان مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جماعتی حلقوں میں سالہا سال تک باقاعدہ درسِ قرآن کے حلقے قائم کرتے اور درس دیتے رہے۔اجتماعِ اہلِ خانہ کا خاص اہتمام فرماتے اور اس میں درسِ قرآن کا سلسلہ جاری کیا، جس میں چوبیس پارے مع ترجمہ وتفسیر تمام افرادِ خانہ کو پڑھائے۔بعد میں صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

تنظیمیں اور ادارے

کچھ عرصہ آپ جماعت اسلامی ضلع لاہور کے قیم اور امیر بھی رہے۔ جب ریلوے اور اومنی بس سروس لیبر یونین بنائی گئی تو اس میں بھی آپ نے اہم ذمہ داریاں ادا کیں۔اچھرہ میں مشہور تعلیمی ادارے نیا مدرسہ کے قیام میں بھی ان کا کلیدی کردار ہے۔یہاں سے بہت سے نامور طلبہ عملی زندگی میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔خان صاحب کے چاروں بیٹے بھی اسی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہیں۔خان صاحب اس معاملے میں بالکل یکسو تھے کہ اچھی تعلیم اچھے اساتذہ اور منظم اداروں ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی اہلیہ آپا انوار اصلاحی، جو خواتین کے حلقے میں ناظمہ آپا کے نام سے مشہور تھیں، کی مشاورت سے ۱۹۵۳ء

Marfat.com

میں اچھرہ میں بچیوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ اصلاح البنات کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ طالبات کے لیے یہ ایک معیاری درس گاہ تھی جس سے فارغ ہونے والی بہت سی طالبات عملی زندگی میں جماعت کے لیے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ایک مکتب دبستانِ زہرا کے نام سے ۱۹۶۱ء میں قائم کیا۔ یہ بھی بچیوں کو معیاری تعلیم کے ساتھ دینی و اخلاقی تربیت فراہم کرنے کا معیاری ادارہ تھا۔ خان صاحب مرحوم کے بیٹے راشد حمید خان کے بقول اب بھی یہ ادارہ کسی نہ کسی حیثیت میں کام کر رہا ہے۔ خان صاحب صحافت کے میدان میں ملک نصر اللہ خان عزیز کے شاگرد تھے۔ حلقۂ خواتین کے لیے دو مشہور رسائل ماہانہ بتول اور عفت کے اجرا میں بھی خان صاحب کی کاوش کا خاصا عمل دخل ہے۔

صحافت و تالیف

میدان صحافت میں بھی آپ نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور تصنیف و تالیف میں بھی اپنے قلم کا خوب استعمال کیا۔ آپ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک اردو کے دو مشہور قومی روزناموں کوھستان اور مشرق میں بحیثیت ایڈیٹر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اسلامک پبلی کیشنز میں بھی بطور جنرل منیجر، ڈائریکٹر اور پھر سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ آپ کی تصانیف میں ''عیسائیت، قرآن اور انجیل کی روشنی میں'' اور ''یار غار'' بہت اہم کتابیں ہیں۔ اسی طرح آپ نے انگریزی زبان میں بھی تین کتابیں تصنیف کیں۔ خان صاحب کو ریڈیو پاکستان کے مشہور پروگرام ''صراط مستقیم'' میں بھی اپنی بات سامعین تک پہنچانے کا موقع ملتا رہا۔ خان صاحب جماعت کی تنظیم میں ہر ذمہ داری بطریق احسن نبھاتے رہے۔ عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ ۱۹۷۸ء میں اچھرہ میں ایک مقامی زکوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے اور ۱۹۹۰ء تک بارہ سال نہایت عدل و انصاف کے ساتھ زکوٰۃ کی پائی پائی مستحقین تک پہنچانے کا انتظام کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے زکوٰۃ و عشر کے نظام پر بھی ایک کتابچہ لکھا۔ اہلِ اچھرہ کے لیے سماجی و معاشرتی سہولیات اور سوک (Civic) معاملات میں امداد

Marfat.com

کے لیے مقامی لوگوں نے باہمی مشورے سے تعاونِ باہمی کی ایک تنظیم سوشل ویلفیئر کے نام سے قائم کی۔ سب لوگوں نے ۱۹۷۲ء میں بالاتفاق خان صاحب کو اس کا صدر منتخب کیا اور ۱۹۸۲ء تک دس سال یہ اعزازی خدمت انجام دی۔

الوداعی منظر

عبدالوحید خان مرحوم کا جنازہ بھی یادگار تھا۔ شدید گرمی کے باوجود جب ان کا جنازہ شریف پارک اچھرہ میں پہنچا تو جماعت اسلامی کے قائدین و کارکنان کے علاوہ پورے محلے کے لوگ اور تمام عمائدینِ شہر اور رشتہ دار ہزاروں کی تعداد میں نماز جنازہ میں شرکت کے لیے موجود تھے۔ ہوا کے ٹھنڈے اور تازہ جھونکے گرمی کی شدت کو کم کر رہے تھے۔ بکائن کے درختوں کے سائے میں جب چارپائی رکھی گئی تو سایہ دار شاخیں یوں جھوم رہی تھیں کہ جیسے ان کا سایہ خان صاحب کا چہرہ چوم رہا ہو یا جیسے شدید گرمی میں کسی ماں کا لعل سویا ہوا ہو اور وہ اسے ہاتھ کا پنکھا چلا کر راحت پہنچا رہی ہو۔ مرحوم کا چہرہ پر سکون تھا اور اس پر وہی سنجیدگی اور شرافت و متانت نظر آ رہی تھی جو زندگی میں ان کی پہچان تھی۔ خان صاحب نے بانی جماعت سید مودودیؒ کا عہد دیکھا، مرشد کے قریب رہنے کا شرف حاصل رہا۔ پھر دوسرے امیر جماعت محترم میاں طفیل محمد مرحوم کے ساتھ بھی طویل اور نہایت قریبی رفاقت رہی۔ تیسرے امیر جماعت جناب قاضی حسین احمد صاحب بھی خان صاحب اور ان کے پورے خاندان کے ہمیشہ قدردان رہے۔ چوتھے اور موجودہ امیر جماعت سید منور حسن دورِ طالب علمی سے عبدالوحید خان صاحب کو جانتے تھے اور ان کی گوناگوں خوبیوں کے معترف و قدردان ہیں۔ جنازے میں موجود ہر بڑے اور چھوٹے کے سینے میں بیسیوں حسین یادیں موجزن تھیں۔ امیر جماعت سید منور حسن صاحب نے مرحوم کا جنازہ پڑھانے سے قبل ان کی خدماتِ جلیلہ پر ان کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ مرحوم نے اپنے پیچھے بیوہ کے علاوہ چار بیٹے، نو بیٹیاں، سولہ نواسے، سولہ نواسیاں، پانچ پوتے پوتیاں اور بے شمار احباب سوگوار چھوڑے ہیں۔

Marfat.com

حاجی حافظ محمد صدیق سُجرا

(۱۹۲۸ء-۲۰۱۲ء)

بزرگ رکنِ جماعت

جماعت اسلامی کے بزرگ رکن اور مردِ درویش حافظ محمد صدیق صاحب ۳۱ مئی ۲۰۱۲ء کو اپنے گاؤں لڈے والا ضلع سرگودھا میں وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے، مرحوم حافظ محمد صدیق صاحب سے کئی سال پرانا تعلق تھا۔ پہلی بار ان کو اپنے دورِ طالب علمی میں حکیم عبدالرحمان ہاشمی مرحوم ومغفور کے مطب پر مسلم بازار سرگودھا میں (غالباً ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء میں) دیکھا۔ اس وقت حافظ صاحب جوان تھے اور جماعت اسلامی کے سرگرم رکن۔ برادرم حکیم عبدالعزیز ہاشمی صاحب نے موصوف سے تعارف کرایا اور اپنے مخصوص پیارے انداز میں ''حافِظَیْن'' [دو حافظوں] کا تذکرہ کیا۔ حافظ محمد صدیق صاحب غائبانہ طور پر مجھ سے متعارف تھے۔ فرمانے لگے'' آپ ہیں حافظ ادریس، اسلامی جمعیت طلبہ والے؟''میں نے عرض کیا جی ہاں یہی خاکسار ہے۔

باوقار اور عظیم زندگی

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۷۱ء میں جب میں باقاعدہ جماعت اسلامی میں شامل ہوا اور پھر کچھ سال بیرون ملک رہنے کے بعد ۱۹۸۵ء میں مرکز جماعت میں امیر جماعت محترم میاں طفیل محمد صاحب نے تنظیمی ذمہ داریوں پر میرا تقرر کیا تو ضلع سرگودھا میں مختلف پروگراموں میں حافظ محمد صدیق صاحب سے کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ لڈے والا جماعت کے امیر تھے اور سکوٹر پر مختلف علاقوں اور دیہاتوں کے بھرپور دورے کرتے رہتے تھے۔ انتہائی مخلص اور منکسر

Marfat.com

المزاج بزرگ تھے۔ اس کے ساتھ ایسے پرعزم کے علاقے کہ فرعون صفت وڈیروں کی چیرہ دستیوں کا اس مردانگی سے مقابلہ کیا کہ علاقے بھر کے لوگ آج بھی ان کی جرأت و عزیمت اور مردانگی کے معترف ہیں۔ اس مضمون میں ان کے ایسے چند ایمان افروز واقعات کا تذکرہ کیا جائے گا، جس سے قارئین ان کی عظمت کا اندازہ لگا سکیں گے۔ حافظ صاحب کی دعوتی سرگرمیوں کا تو اندازہ پہلے ہی سے تھا مگر ان کی وڈیرہ شاہی کے خلاف جدوجہد اور کامیابیوں کی تفاصیل ان کی وفات کے بعد ان کے اہل و عیال اور جماعتی احباب کی زبانی معلوم ہوئیں۔

تعزیتی مجلس

۸۲ سالہ حیاتِ مستعار مکمل کر کے ۳۱ مئی ۲۰۱۲ء کی شام کو حافظ صاحب طویل علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مجھے برادر گرامی قدر حکیم عبدالعزیز ہاشمی صاحب نے اور مرحوم کے بیٹے قیم ضلع سرگودھا برادرم مسعود الحسن صاحب نے وفات کی اطلاع دی۔ اگلے روز نماز جنازہ کا پروگرام تھا مگر میں پہلے سے طے شدہ بعض اجلاسوں کی وجہ سے جنازے میں حاضری سے معذور تھا۔ اسی وجہ سے بصد ادب معذرت کرنا پڑی۔ دو روز بعد میں تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو چوپال میں کئی لوگ تعزیت کے لیے موجود تھے۔ ہر شخص مرحوم کو خراج عقیدت پیش کر رہا تھا۔ ان لوگوں میں معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ امرا و وزرا بھی اور مزدور و فقراء بھی۔ جماعت اسلامی کے وابستگان بھی اور ہر سیاسی و دینی جماعت کے زعما بھی۔ حکمران طبقے کے نمایندے بھی اور حزب اختلاف کے کارندے بھی۔ محترم عبدالعزیز ہاشمی صاحب تو میرے ساتھ ہی سرگودھا سے آئے تھے۔ سابق ایم این اے و رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان جناب جاوید اقبال چیمہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے فون پر مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کب سرگودھا پہنچوں گا تو میں نے بتا دیا تھا کہ لڈے والا ہی میں ملاقات ہوگی، چنانچہ وہ میرے پہنچنے سے قبل وہاں تشریف فرما تھے۔ ان کا بھی حافظ صاحب مرحوم سے طویل اور نہایت محبت بھرا تعلق تھا۔ سرگودھا سے قومی اسمبلی کے رکن اور وزیر مملکت برائے پانی و بجلی تسنیم قریشی بھی ہمارے پہنچنے کے

Marfat.com

بعد اپنے دوست احباب کے ساتھ تعزیت کے لیے آئے۔ جماعت کے ہر سطح کے لوگ اور اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوان بھی موجود تھے کیوں کہ حافظ صاحب کے پوتے، نواسے جمعیت میں قائدانہ فرائض ادا کر رہے ہیں۔ ان کے بیٹے، بیٹیاں بھی جماعتی ذمہ داریوں پر فائز ہیں جو مرحوم کے لیے ایک جانب صدقۂ جاریہ ہیں اور دوسری جانب وابستگان جماعت اور پوری قیادت کے لیے بہترین مثال ہیں کہ ارکانِ جماعت کو اپنے اہل وعیال اور خاندان میں کس انداز میں کام کرنا چاہیے۔

ابتدائی زندگی

حافظ محمد صدیق ۱۹۲۸ء میں چک نمبر ۵۲۔ الف شمالی، لڈے والا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پرائمری سکول لڈے والا میں حاصل کی اور اس کے بعد حفظ قرآن وعربی تعلیم کے لیے مختلف مدارس میں وقت گزارا۔ اس عرصے میں صرف ونحو اور عربی کورس کے ساتھ باترجمہ قرآن مجید کی بھی تعلیم حاصل کی۔ حافظ صاحب نے بچپن سے جماعت اسلامی کے ارکان دو بھائیوں جناب محبوب شاہ ہاشمی اور محترم حکیم عبدالرحمان ہاشمی سے بہت کچھ سیکھا۔ حافظ صاحب کا خاندانی پس منظر بھی دینی وعلمی تھا مگر ان دونوں بھائیوں نے تو انھیں کندن بنا دیا۔ حافظ صاحب مرحوم، حکیم عبد الرحمان ہاشمی رحمۃ اللہ علیہ کے تو شاگرد بھی تھے اور انتہائی زیادہ عقیدت مند بھی۔ تعلیم بہت زیادہ نہ تھی مگر اپنے مطالعہ سے حافظ صاحب نے اسلامی علوم، تفسیرِ قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی تاریخ پر بہت زیادہ تفقہ حاصل کر لیا تھا۔ ان کے دروس بہت موثر ہوتے تھے۔

ہاشمی خاندان

حافظ محمد صدیق کے والد محترم حاجی محمد حیات جو ایک زمیندار تھے، نے تلہ گنگ کے موضع مصریال سے ایک عالم دین اور استاد جناب مولانا محمد عالم شاہ ہاشمی صاحب کو اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی جو ہاشمی صاحب نے قبول فرمالی۔ محمد عالم شاہ صاحب، محبوب ہاشمی اور عبدالرحمٰن ہاشمی کے والد تھے۔ موصوف نے لڈے والا میں دینی تعلیم کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ مدرسہ قائم کیا جہاں وہ بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے تھے۔ اپنی فیملی کے ساتھ لڈے والا میں

Marfat.com

مستقل رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ جب عالم شاہ صاحب کے بچے جوان ہو گئے تو عبدالرحمٰن ہاشمی صاحب نے لڈے والا ہی میں دواخانہ بنالیا اور محبوب شاہ ہاشمی صاحب دیگر چھوٹے موٹے کام کرتے رہے۔ محبوب شاہ ہاشمی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے والد تھے اور مولانا مودودی کے عاشقِ صادق۔ محبوب شاہ صاحب نے زندگی کے آخری سال منصورہ میں گزارے۔ ہم نے ان کو قریب سے دیکھا بڑی ہمت والے بزرگ تھے۔ بہت مضبوط جسم اور طاقت سے بھرپور جوانی کی بدولت سرگودھا سے سائیکل پر تقسیم ہند سے پہلے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کے لیے پٹھانکوٹ گئے۔ وہاں سے کتابچے اور رسالہ جات لے کر واپس آئے اور عبدالرحمٰن ہاشمی اور حافظ محمد صدیق کو مطالعہ کے لیے دیے۔ اس ایمان افروز لٹریچر سے متاثر ہو کر حافظ محمد صدیق بھی محبوب شاہ ہاشمی کے ساتھ ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ زمانے میں پٹھانکوٹ گئے اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کی اور جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہاں سے واپس آ کر اپنے علاقے میں جماعت اسلامی کی دعوت کی بھرپور مہم شروع کر دی اور عبدالرحمٰن ہاشمی صاحب کے ساتھ مل کر ان کے دواخانہ میں کام بھی کیا۔

ہاشمیوں کی گاؤں سے سرگودھا منتقلی

لڈے والا سے عبدالرحمٰن ہاشمی صاحب نے اپنی حکمت کی پریکٹس کے لیے شہر منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ باہمی مشاورت سے انھوں نے مسلم بازار سرگودھا بالمقابل جامع مسجد بلاک نمبر ایک میں دکان کرایہ پر لے لی اور وہاں اپنا دواخانہ قائم کیا جو اللہ کے فضل سے بہت مقبول ہوا اور مرجعِ خلائق بنا۔ اس عرصے میں کچھ ہی مہینوں کے بعد چودھری محمد سلیم صاحب سے حکیم عبدالرحمٰن ہاشمی صاحب کی ملاقات ہوئی اور دیہاتوں کے ساتھ جماعت اسلامی کا کام شہر میں بھی شروع کر دیا۔ جماعت اسلامی میں چودھری محمد سلیم مرحوم کی خدمات بے شمار ہیں۔ انھوں نے شہر، ضلع، ڈویژن کی امارت کے علاوہ صوبہ پنجاب میں نائب امارت اور پھر مرکز میں ناظم انتخابات کے طور پر بڑا یادگار کام کیا۔ وہ اسعد گیلانی مرحوم، حکیم عبدالرحمان ہاشمی مرحوم اور اس دور کے دیگر بزرگان کے ساتھ دعوت و

Marfat.com

تربیت کے کاموں میں زندگی بھر مصروف رہے۔ ہاشمی صاحب نے شروع میں تو دکان کرائے پر لی تھی، بعد میں یہی دکان خرید کر عبدالرحمن ہاشمی صاحب کے والد اپنے پورے خاندان سمیت اس کی بالائی منزل پر رہائش پذیر ہوگئے۔ اس نقل مکانی کے باوجود لڈے والا کے ساتھ ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ میں جب تعزیت کے لیے لڈے والا حاضر ہوا تو مسعود الحسن صاحب اور عبدالعزیز ہاشمی صاحب نے مجھے وہ مکان بھی دکھایا جہاں سال ہا سال ہاشمی خاندان مقیم رہا۔

انتقامی کارروائیاں

حافظ محمد صدیق نے جب لڈے والا میں جماعت اسلامی کا کام پوری لگن کے ساتھ شروع کر دیا تو لڈے والا کے ایک جاگیردار جو کہ ایک صد مربع زمین (یعنی پچیس صد ایکڑ) کے مالک تھے، سیخ پا ہوگئے۔ انھوں نے حافظ صاحب کو انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے اپنی روایتی حرکتیں شروع کر دیں۔ اس جاگیردار گھرانے کا اتنا رعب و دبدبہ تھا کہ پورے علاقے میں کوئی شخص دم نہ مار سکتا تھا۔ اس وڈیرے سے تمام زمیندار ڈرتے تھے۔ وہ سب روزانہ سلام کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے اور اسے حافظ محمد صدیق کے خلاف اکساتے رہتے تھے کہ وہ کبھی سلامی کے لیے دربار میں نہیں آئے۔ اس جاگیردار نے حافظ محمد صدیق کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ دور دراز کے قصبے بھکر ضلع میانوالی میں درج کرا دیا۔ جب مقدمہ کی تاریخ پر عدالت میں حاضری کے لیے گئے تو حافظ محمد صدیق صاحب بظاہر یکہ و تنہا تھے مگر انھیں اللہ کی نصرت کا یقین تھا۔ اس جاگیردار کا اتنا اثر تھا کہ حافظ محمد صدیق کا دفاع کرنے کے لیے سرگودھا اور بھکر سے کوئی وکیل آمادہ نہ ہوا۔ آخر وہ خود عدالت میں پیش ہوگئے اور صورت حال پر کھل کر بات کی توجج نے کہا کہ جب اگلی پیشی پر آپ آجائیں گے، اس وقت سماعت کے لیے آپ کو بلایا جائے گا۔ آپ خود ہی اپنا دفاع کیجیے، آپ کو سنا جائے گا۔ یہ کیس گرمیوں کے موسم اور ماہ رمضان میں زیر سماعت تھا اور تاریخوں پہ تاریخیں پڑتی چلی جاتی تھیں۔ حافظ محمد صدیق رمضان کے مہینے میں روزے کے ساتھ بڑی مشقت سے رات کو سفر شروع کرتے۔ اس زمانے

Marfat.com

میں پبلک ٹرانسپورٹ کی سہولیات بھی کچھ زیادہ نہ تھیں۔ حافظ صاحب مرحوم نے بڑی مشکلات اٹھائیں مگر اس جابر کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔

مرشد کی خدمت میں حاضری

یوں تو حافظ صاحب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے زمانہ قیام پٹھان کوٹ ہی سے متعارف تھے مگر ایک مرتبہ اس کیس کے سلسلے میں مولانا سے ملنے لاہور گئے تو مرکز جماعت اچھرہ میں ملک غلام علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے استقبال کیا اور کہا کہ مولانا کی طبیعت ناساز ہے۔ اس وقت آپ آرام کریں، عصر کے بعد آپ کی ملاقات کروا دیں گے لیکن اسی دوران مولانا اپنے کمرے (دفتر + لائبریری) میں پہنچ گئے اور گفت گو سن لی۔ پھر ملک صاحب سے کہا ''ملک صاحب مہمانوں کو اندر آنے دیں، میں کمرے میں آ گیا ہوں۔'' جب کمرے میں ملاقات ہوئی اور دعا سلام، حال احوال کے بعد حافظ صاحب نے کہا کہ مولانا ایک رکن نے یہ ڈھوڈھا بطور تحفہ بھیجا ہے تو مولانا نے لفظ کی فوراً تصحیح کر دی اور فرمایا ''ڈھوڈا'' کہتے ہیں۔ حافظ صاحب مرحوم بیان کیا کرتے تھے کہ مولانا مودودی نے اس موقع پر فرمایا اس کارکن کے لیے میرا تحفہ بھی لیتے جائیں اور وہ یہ کہ میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام پیش کر دیں۔ اس کے بعد حافظ صاحب نے مولانا محترم کے سامنے کیس کا ذکر کیا کہ ایک بہت بڑا جاگیردار ہمارے خلاف جھوٹا مقدمہ بنا کر تنگ کر رہا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ ہم بھی ہر ممکن چارہ جوئی کریں گے مگر آپ لوگ مقامی سطح پر بھی جماعتی نظم کے تحت اس ظالم کے خلاف جگہ جگہ جلسے کریں، لوگوں کو بیدار کریں اور اس کے ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ کچھ سالوں بعد جب مولانا محترم سے حافظ صاحب کی دوبارہ ملاقات ہوئی تو مولانا محترم نے پوچھا کہ آپ کے کیس کا کیا بنا ہے یعنی کئی سال بعد بھی مولانا مرحوم و مغفور کو وہ کیس یاد تھا۔ اس حوالے سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کئی یادگار اور ایمان افروز واقعات ذہن میں آ رہے ہیں۔ وہ عام کارکنان کا بھی بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے۔ نبی مہربان صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی سنتِ مطہرہ یہی تھی۔

Marfat.com

جاگیردار وڈیرے کی ہزیمت

اس کیس کے بارے میں ڈاکٹر محمد اسلم چغتائی صاحب کو بھی مرکز جماعت سے متوجہ کیا گیا۔ وہ اس زمانے میں جماعت اسلامی سرگودھا شہر کے امیر تھے۔ ڈاکٹر محمد اسلم چغتائی مرحوم ڈاکٹر محمد امجد چغتائی کے والد تھے۔ میرے دور امارت صوبہ میں ڈاکٹر امجد چغتائی صاحب امیر شہر تھے۔ عظیم باپ کا عظیم بیٹا! آج کل امجد صاحب پشاور منتقل ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم مرحوم بہت کامیاب معالج تھے۔ کئی بڑے بڑے خاندانوں کے معالج خاص بھی تھے۔ حافظ صاحب نے جب ان سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ میں ملک امیر محمد خاں، نواب آف کالا باغ کا خاندانی معالج ہوں، اس موضوع پر اس سے بات کرتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ چلو اسی وقت کالا باغ چلتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم چغتائی کے ساتھ حافظ محمد صدیق کالا باغ گئے تو نواب آف کالا باغ نے چغتائی صاحب کی بڑی آؤ بھگت کی۔ جب اسے کیس کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے ایک تحریر بنا کر دی کہ اس جج کو دے دیں جو کیس کی سماعت کر رہا ہے۔ بھکر اس زمانے میں ضلع میانوالی کی تحصیل تھی۔ جب تحریر پیش کی گئی تو جج نے حافظ محمد صدیق اور ان کے تینوں ساتھیوں کو بری کر دیا۔ اس پر جاگیردار صاحب برہم ہوئے تو جج نے انھیں تحریر دکھا دی۔ تحریر دیکھتے ہی ٹوانہ صاحب کی ہوا اکھڑ گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ واپس آ کر حافظ محمد صدیق صاحب کی بیٹھک پر آ گیا اور معذرت کی۔ حافظ محمد صدیق صاحب نے فوراً معاف کر دیا اور بغیر کسی شکوے شکایت کے فرمایا کہ اللہ کی رضا کے لیے میں نے معاف کر دیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لوگوں کے دلوں میں ٹوانہ صاحب کا وہ رعب اور دبدبہ ختم ہوتا چلا گیا اور جماعت کا کام تسلسل کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اللہ اپنے بندوں کی مدد کبھی فساق و فجار سے بھی کرا دیتا ہے۔ جائز کام کے لیے کسی سے مدد لینا اور ظلم کا مداوا کرنا کوئی گناہ نہیں۔

طائف کا سفرِ نبوی اور سرگودھا کی سنگ باری

۱۹۷۰ء کے الیکشن، جس میں اس علاقے سے جماعت اسلامی کی طرف سے سید اسعد گیلانی

Marfat.com

قومی اسمبلی اور حکیم عبدالرحمٰن ہاشمی صوبائی اسمبلی کے امیدوار تھے، کے دوران حافظ محمد صدیق نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سارے چکوک میں زبردست مہم چلائی۔ اس دوران انھوں نے تقریباً تمام لوگوں سے براہ راست ملاقاتیں کیں۔ اس سلسلہ میں گھروں کے علاوہ لوگوں کے ڈیرہ جات پر جاکر بھی دعوت پہنچائی حتیٰ کہ جب کوئی آدمی کھیتوں میں ہل چلا رہا ہوتا تو اس کے ساتھ چلتے چلتے دعوت دیتے رہتے تاکہ کوئی آدمی رہ نہ جائے جس تک ہماری دعوت نہ پہنچے۔ ہر سوال کا نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیتے اور آخر میں کہتے کہ یہ ووٹ آپ اسلام کو دیں گے کیوں کہ یہ نمایندے اسلامی نظام کے علمبردار ہیں۔ اسی مہم کے دوران چک نمبر ۴۶ شمالی میں دعوت کے سلسلے میں گئے تو وہاں کے کئی ایک زمینداروں اور ایک سابق ایم این اے نے بچوں کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ حافظ محمد صدیق نے جناح کیپ پہنی ہوئی تھی، بچوں نے پتھر پھینکنے شروع کر دیے جس سے حافظ محمد صدیق کی ٹوپی بھی سر سے اڑ گئی۔ اور بھی دو ساتھی اس موقع پر آپ کے ساتھ تھے جو پتھروں کی زد میں آئے۔ جب سنگ باری جاری تھی تو ایک مقامی آدمی دوڑ کر آیا اور اس نے بچوں کو دور بھگا دیا اور انھیں برا بھلا کہا کہ اتنے معزز آدمی کے ساتھ تم یہ سلوک کر رہے ہو۔ حافظ صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کوئی بات نہیں سنت ادا ہوئی ہے۔ اس شخص نے بھی تائید کی تو حافظ محمد صدیق نے کہا کہ افسوس یہ ہے کہ اللہ کے نبی کو طائف میں کافروں نے پتھر مارے تھے اور ہمیں آج یہ پتھر مسلمانوں نے مارے ہیں۔

داعی حق اور مدرس قرآن وحدیث

حافظ محمد صدیق مثالی داعی حق تھے، زندگی بھر دعوت، تدریس اور تذکیر میں مصروف رہے۔ مرحوم نے جماعتی کام کے لیے اپنا ذاتی سکوٹر ویسپا خریدا ہوا تھا، اس پر تحصیل بھر میں جا کر ہر قصبے اور گاؤں میں خطبہ جمعہ دیتے۔ پھر وہاں متفق بناتے، کتابیں تقسیم کرتے اور ملاقاتیں کر کے اس چک سے واپس لوٹتے تھے۔ شاید ہی کوئی چک ایسا رہ گیا ہو جہاں انھوں نے جمعہ نہ پڑھایا ہو یا جماعت کی دعوت نہ پہنچائی ہو۔ تمام دیہات کے چھوٹے اور بڑے بلکہ دیہاتی خواتین بھی حافظ

Marfat.com

صاحب کو پہچانتی تھیں۔ اللہ نے اپنے دین اور اس کی دعوت کی بدولت حافظ صاحب کو بہت زیادہ عزت دی۔ انھوں نے جب اس قافلے کو پہچان لیا تو پھر اپنی تمام زندگی اسی کام کے لیے لگا دی۔ حافظ صاحب کے اہل و عیال کے بقول مرحوم نے اپنا ذاتی کام اور کاروبار نہیں کیا۔ ہر روز کا معمول تھا کہ صبح بعد نماز فجر درس قرآن دیتے جس میں تقریباً چھ مرتبہ اول سے آخر تک پورا قرآن مکمل کیا اور ۳۶ بار رمضان شریف میں قرآن پاک سنایا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ سوا پارہ تراویح میں قرآن سناتے۔ اس کے بعد تلاوت شدہ آیات کا مفہوم بیان کرنا بھی ان کی زندگی کا معمول تھا۔ اسی طرح ہر روز عصر کے بعد مسجد میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ وفات سے پہلے اپنے بچوں اور جماعتی ساتھیوں کو وصیت کی کہ یہ کام جاری رہنا چاہیے۔ الحمدللہ یہ کام اب بھی جاری ہے اور مجھے بتایا گیا کہ ایک بہت بڑے مدرسے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔

چمنِ مودودی کا مالی اور خادمِ خلق

حافظ صاحب کی مسلسل اور عمر بھر کی جدوجہد کی بدولت لڈے والا جماعت کا مرکز بن گیا ہے۔ اس چک میں مرحوم نے دس رکن اپنی سجرا برادری میں سے بنائے جس میں ان کے دو بیٹے بھی شامل ہیں۔ دو رکن ارائیں فیملی سے ہیں اور تین رکن اعوان برادری سے۔ اسی طرح ایک رکن مسلم شیخ برادری سے بھی ہیں۔ کسی بھی تحریک کے کارکن اور لیڈر کی کامیابی کا پیمانہ یہ ہے کہ اس نے اپنے اہل و عیال، خاندان برادری اور علاقے کے لوگوں کو کس حد تک اپنے رنگ میں رنگنے کا فرض ادا کیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی اہم بات ہے کہ مظلوموں کی دادرسی اور عوام الناس کے حقوق کی حفاظت کا کس قدر اہتمام کیا ہے۔ مرحوم اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ حافظ صاحب غریب اور محروم طبقات کی بڑی قدر افزائی کیا کرتے تھے۔ یہی سنتِ رسول اور طریقۂ اہل اللہ ہے۔ حاجی جاوید اقبال چیمہ صاحب نے بتایا کہ جب وہ دوسری بار ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے تو حافظ صاحب نے ان سے کہا "ایک بہت ضروری کام آپ کے ذمہ ہے۔ یہ جہاد بھی ہے اور خدمتِ خلق بھی۔" کام یہ تھا کہ چار پانچ دیہات جو راجباہ کی ٹیل پر تھے، آبپاشی کے پانی سے محروم رہتے

Marfat.com

تھے۔ ابتدا میں ٹوانوں اور دیگر وڈیروں کے رقبے تھے۔ وہ آگے پانی جانے ہی نہ دیتے تھے۔ حافظ صاحب نے چیمہ صاحب سے کہا کہ ان دیہات کے لیے نیا راجباہ نکلوایا جائے جو ان وڈیروں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ چنانچہ ۱۹۹۱ء میں چیمہ صاحب کی کاوش سے یہ راجباہ نکالا گیا اور یہ دیہات پانی سے فیض یاب ہوئے۔

مثالی گھرانہ

حافظ صاحب کی خدمات ہر میدان میں قابل قدر تھیں۔ دو دفعہ عشر وزکوٰۃ کمیٹی کے چیئر مین منتخب ہوئے۔ حافظ صاحب کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کا بڑا بیٹا محمد سعید سجرا ضلع کونسل کا ممبر منتخب ہوا اور دوسرے بیٹے مسعود الحسن جماعت اسلامی ضلع سرگودھا کے امیر رہے، جو اس وقت قیم ضلع کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ تیسرے بیٹے محمود الحسن ہیں جو مقامی جماعت کے امیر رہے اور اب سرکل کے ناظم ہیں۔ حافظ صاحب کے ایک بیٹے حاجی امین احسن مرحوم تھے۔ ان کا نام مولانا امین احسن اصلاحی کے نام پر رکھا گیا وہ سعودی عرب میں ملازمت کرتے رہے اور پورے خاندان کے ساتھ مالی تعاون کرتے رہے۔ چند سال قبل سعودی عرب سے پاکستان واپس آئے تو پاکستان کے دگرگوں حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو دل کا دورہ پڑا اور وفات پا گئے۔ حافظ صاحب کے پانچویں بیٹے کا نام خالد فاروق جو مولانا مودودی کے بیٹے خالد فاروق مودودی کے نام پر رکھا گیا۔ خالد فاروق نے ایک بھینس چور کے ساتھ مقابلے میں اسے قتل کیا جس پر اس کے خلاف کیس بنا اور وہ جیل میں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے۔ حافظ صاحب کی بیٹیوں میں سے زبیدہ بیگم سعودی عرب میں مقیم ہیں اور وہاں تحریکی حلقے میں فعال کردار اور اہم ذمہ داریاں ادا کر رہی ہیں۔ حافظ صاحب کی دیگر دو بیٹیاں صفیہ بیگم اور تسلیم کوثر پاکستان میں مقیم ہیں اور وہ بھی تحریک کی کارکن ہیں۔ ان دونوں بہنوں نے اپنے والدین کی خدمت کا حق ادا کیا۔

پورے خاندان کو مرحوم نے اپنے ساتھ اس کاروانِ دعوت و عزیمت میں شامل ہونے کی ترغیب و تربیت دی اور اللہ نے ان کی کاوشوں کو ثمر آور بنایا۔ ان کے پوتے یعنی ان کے

Marfat.com

صاحبزادے مسعود الحسن کے ایک بیٹے اسلامی جمعیت طلبہ سرگودھا ڈویژن کے ناظم ہیں، سرگودھا یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں اور مرکزی شوریٰ کے بھی رکن ہیں۔ مسعود بھائی کے دوسرے بیٹے بھی جمعیت کے رکن اور ایک حلقہ کے ناظم ہیں اور ایک بیٹی اسلامی جمعیت طالبات سرگودھا ڈویژن کی ناظمہ رہی ہیں اور دوسری بیٹی ناظمہ ضلع اسلامی جمعیت طالبات کی معاون رہی ہیں۔ یعنی تمام خاندان جماعت سے منسلک ہے اور پوری برادری بھی جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون کرتی ہے جس کی وجہ سے جماعت اسلامی نے لڈے والا میں ناظم یونین کونسل کا الیکشن جیتا تھا۔ لڈے والا کے علاوہ قریب کے چکوک میں بھی جماعت کا کام جاری ہے۔

ایک متقی انسان

چک ہذا میں تقریباً تمام مرحومین، جو مختلف جماعتوں اور برادریوں سے تعلق رکھتے تھے، کے لواحقین کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حافظ محمد صدیق صاحب پڑھائیں۔ ہر شخص مرحوم کے تقویٰ و نیکی کا قائل تھا۔ حافظ صاحب ہمیشہ ان مرحومین کے گھروں پر حاضری دیتے، لواحقین کو صبر و حوصلے کی تلقین فرماتے اور نہایت خشوع و خضوع سے نماز جنازہ پڑھاتے تھے۔ یہ بات خوشگوار حیرت کا باعث ہے کہ ان کے بچوں نے بتایا کہ مخالفین گھرانوں کے بھی کئی بزرگ فوت ہونے سے قبل وصیت کر جاتے کہ ہمارا جنازہ حافظ صدیق پڑھائیں۔ حافظ صاحب ہر نماز جنازہ پر خطاب فرماتے اور قرآن و حدیث اور آخرت کے موضوع کے علاوہ حالات حاضرہ پر بھی خطاب کرتے کہ حالات کی اصلاح ہی سے ہماری آخرت کا سفر آسان ہو سکتا ہے، نیکی کے ماحول اور برائی سے نفرت کے نتیجے میں اعمال صالحہ آسان ہو جاتے ہیں۔

آخری ایام

وفات سے تین سال قبل مرحوم کو ہائی بلڈ پریشر ہوا اور فالج کا اثر دائیں طرف ہاتھ پاؤں، زبان اور دماغ پر پڑا۔ لیکن ایک ہفتہ کے اندر اللہ کے فضل سے زبان بھی تقریباً ٹھیک ہو گئی اور ہاتھ پاؤں بھی بالکل ٹھیک ہو گئے۔ صرف یادداشت میں کمی آ گئی۔ اس کے باوجود بیماری کے

Marfat.com

سارے عرصے میں اشاروں سے ہر نماز بروقت اور بلا تاخیر ادا کرتے رہے۔ جمعہ کے روز انھیں مسجد میں لے جایا جاتا جہاں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے اور لوگوں سے ملاقات بھی فرماتے۔ تقریباً تین ماہ پہلے چلتے ہوئے گر پڑے اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ان کے بچوں کے بقول آپریشن کروایا گیا جس سے درد وغیرہ ٹھیک ہو گیا لیکن چل پھر نہیں سکتے تھے۔ اس سارے عرصے میں زبان سے اللہ کا ذکر کرتے رہے۔ مرحوم نے زندگی بھر تہجد کی نماز کا اہتمام کیا اور ۳۱ مئی بروز جمعرات کو صبح تہجد کے وقت ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ حافظ صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور نیکیوں کو شرف قبولیت بخشے اور انسانی غلطیوں و بشری کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور ان کے بچوں کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ مرحوم اپنے پیچھے نیک اولاد اور علم کے حوالے سے جو صدقہ جاریہ چھوڑ گئے ہیں، اللہ اسے قائم و دائم رکھے۔

Marfat.com

مریم جمیلہ مرحومہ (۱)

(۱۹۳۴ء-۲۰۱۲ء)

مقدر کی بات

دنیا میں آنے والے ہر انسان کا نوشتۂ مقدر کتاب مبین میں اللہ کے ہاں محفوظ و مکتوب ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایک مخصوص ماحول، معاشرے اور مذہبی و نسلی پس منظر میں دنیا میں نمودار ہوتے ہیں مگر کوئی بھی نہیں جانتا کہ ان کی منزل کہاں ہے۔ کچھ لوگوں کو پیدائشی طور پر اچھا ماحول میسر آتا ہے مگر ان کی قسمت میں برا انجام آتا ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ فساد زدہ ماحول میں آنکھ کھولتے ہیں مگر ان کے مقدر میں انتہائی صالح اور قابلِ رشک منزل لکھی ہوتی ہے۔ یہ لکھا ہونا بھی قدرت کا حصہ ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ لکھے ہونے کی اصطلاح کو بنیاد بنا کر کہہ دیا جائے کہ انسان تو مجبورِ محض ہے، پھر اس کے لیے جزا و سزا کا قانون کس انصاف کی بنیاد پر لاگو ہوتا ہے۔ دراصل لکھے ہونے کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور غائب بھی اس سے پوشیدہ نہیں، مستقبل میں کوئی اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے، اپنی آزاد مرضی سے کیا کمائے گا، یہ بھی اس کے علم میں ہے۔ یہی قضا و قدر ہے۔ اسے تبدیل کرنا اللہ کے اختیار میں ہے مگر اللہ ہر انسان کو انتخاب و عمل کی آزادی عطا فرماتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی قوت و صلاحیت بخشتا ہے۔

یہودیت و صہیونیت

نیویارک امریکہ میں آباد جرمنی سے تعلق رکھنے والا ایک یہودی خاندان اپنے کاروباری پس منظر اور سماجی خدمات کی وجہ سے خاصا معروف تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا خاندان تھا مگر اس کے ارکان کا وسیع حلقۂ تعارف و احباب تھا۔ اسرائیل کے قیام کے لیے متحرک یہودی تنظیموں میں اس

Marfat.com

خاندان کا بڑا کردار تھا۔ وہ ''مظلوم'' یہودیوں کے لیے چندے جمع کرنے میں مصروف رہتے اور اسرائیلی ریاست کے لیے ہر سرگرمی کا حصہ ہوتے۔ نیویارک کے علاقے روشیلے (Rochelle) میں مقیم اس خاندان کا ایک فرد مارکوس (Marcus) بڑا پکا یہودی تھا جو ہر ہفتے کے روز عبادت خانے میں پوری فیملی کے ساتھ حاضر ہوتا اور ربی کی ہر بات پورے غور سے سنتا۔ نہ صرف ربی کا سرمن سنتا بلکہ دی گئی ہدایات کے مطابق پورا عمل بھی کرتا۔ وہ پکا صہیونی تھا، محض ایک یہودی نہیں۔ مریم جمیلہ اس گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام مارگریٹ رکھا گیا۔ اس کے ننھیالی اور ددھیالی خاندان عینکوں اور گارمنٹس (بالخصوص) نیک ٹائی کا کاروبار کرتے تھے۔

اللہ کا منصوبہ

مارکوس کے ہاں تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے ایک بہت چھوٹی عمر ہی میں فوت ہو گئی۔ جو زندہ رہیں، ان میں سے پہلی ۱۹۲۸ء میں اور دوسری ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئی۔ پہلی کا نام الزبیتھ رکھا گیا اور دوسری کا نام مارگریٹ۔ خاندانی یادداشتوں میں اس خاندان کے ارکان نے ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ الزبیتھ تقریباً سات سال کی ہو چکی تھی کہ اس کی بہن مارگریٹ پیدا ہوئی۔ الزبیتھ نے اپنے والدین سے پوچھا کہ اس کی دیگر ہم جولیوں اور سہیلیوں کے بہن بھائیوں میں تو اتنا فاصلہ نہیں۔ ہم دونوں بہنوں کی عمروں میں اتنا تفاوت کیوں ہے؟ اس کے والدین نے اسے بتایا کہ اس عرصے میں بنکوں اور معاشی اداروں پر جو مندی اور شدید بحران کا دور آیا اور ملک کی اقتصادی صورت حال از حد مخدوش ہو گئی تو خاندانی منصوبہ بندی کرنا پڑی۔ یہ تو ان کی اپنی توجیہ تھی اصل میں تو اللہ کا اپنا منصوبہ تھا جس کے مطابق مارگریٹ کو دنیا میں آنا تھا۔ اللہ نے اسے خصوصی سوچ اور پسند و ناپسند کے انوکھے معیار عطا فرمائے تھے جن سے اس کا خاندان اور گردونواح کا پورا ماحول ناواقف تھا۔

انصاف کی علمبردار

پکے یہودی خاندان میں پیدا ہونے والی مارگریٹ کو یہودیت نے ہرگز متاثر نہ کیا۔ وہ بالکل

Marfat.com

ابتدا ہی میں اس کے متعلق اپنے اشکال اور ذہنی تحفظات کا اظہار کرتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہودی نظریات سے مسلسل چڑ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ فلسطین اور اس کے اصل باشندوں سے اپنائیت اور محبت کا اظہار کرتی تھی۔ دراصل ننھی مارگریٹ ظلم اور ظالم سے متنفر اور مظلوم کی حامی تھی۔ اس کے گھر اور سماج کا ماحول اس کے تصورات سے متصادم تھا۔ اس کے والدین اسے سینیگاگ (صومعہ) ہر ہفتے کو باقاعدگی سے لے جاتے مگر ننھی مارگریٹ کو ربی کی باتوں میں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی۔ بعض اوقات وہ سرمن کے دوران تنقیدی انداز میں مسکراتی اور اپنے ردعمل کا خاموش اظہار کرتی۔ ربی نے یہ نوٹ کر لیا اور اس کے والدین کو متوجہ کیا، پھر سرزنش بھی کی۔ والدین نے اپنی سی کوشش کی کہ مارگریٹ کو ان "حرکتوں" سے باز رکھیں مگر ننھی بچی دلیل سے بات کرتی اور محض خوش خیالی اور جامد تقلید کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی۔ وہ عدل وانصاف کی علمبردار تھی۔ اللہ نے مارگریٹ کو مریم جمیلہ بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا، اسے کون ٹال سکتا تھا۔

ذہنی مرض؟

مریم جمیلہ (مارگریٹ) کے ذہنی ہسپتال میں داخلے کا المیہ بھی اس کی ذہنی کشمکش کی بدولت وجود پذیر ہوا۔ ڈاکٹروں نے اس کے مرض کی تشخیص بھی غلط کی اور اس کا علاج بھی غلط سمت میں ہوتا رہا۔ وہ ذہنی مریضہ نہ تھی، بدقسمتی سے بنا دی گئی۔ مریم جمیلہ نے بچپن ہی میں سیکڑوں کتب پڑھ ڈالیں۔ تلاشِ حقیقت کا یہ سفر کٹھن، صبر آزما اور انتہائی کڑا امتحان تھا۔ اس نے عیسائیت، بہائی مذہب اور دیگر مشرقی و مغربی مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے ذوقِ سلیم نے ٹھکرا دیا۔ آخر اسے اسلام کے مطالعہ کا موقع ملا اور اس نے پورے تعمق کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا۔ اس کی تنقیدی نظر یہاں بھی کسی رو رعایت کی روادار نہ تھی مگر اسلام کی ہر بات اسے اپنی فطرت کے قریب تر اور ہر اصول ذہن کے خلجان کا حل نظر آیا۔ مریم جمیلہ نے پہلا ترجمہ قرآن مجید جو پڑھا وہ ایک متعصب عیسائی مستشرق جارج سیل کے قلم سے کیا گیا تھا۔ مریم جمیلہ عربی زبان سے ناواقف تھیں مگر ذہن میں بار بار خیال آتا کہ ترجمے میں کچھ گڑبڑ ہے۔ آخر محمد مارمیڈیوک

Marfat.com

پکتھال کا ترجمہ قرآن ہاتھ آیا تو اسے لفظاً لفظاً پڑھا اور ساتھ ساتھ دل سے آواز اٹھتی رہی کہ ہاں یہ کلام ربانی ہے۔

مظلوم کی ساتھی قلم کار

مریم جمیلہ بچپن ہی سے ذہین، حساس اور منطقی ذہن رکھتی تھیں۔ بالکل ابتدائی عمر میں وہ فلسطینیوں کے حق میں مضامین لکھتیں، خاکے بناتیں اور صیہونیت کے علمبرداروں کو بلا معذرت بتاتیں کہ ''ہولوکاسٹ'' کا بدلہ مظلوم فلسطینیوں سے لینا ظلم کی بدترین مثال ہے۔ مریم جمیلہ کی پہلی کتاب جو انھوں نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں لکھنی شروع کی ایک دلچسپ ناول ہے جس کا نفسِ مضمون فلسطین اور اہل فلسطین ہیں۔ اس ناول کا نام احمد خلیل ہے جو ایک مظلوم فلسطینی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ پورے ناول میں یہودی نژاد قلم کار نے یہودیوں کے مکروہ چہرے کو جس کامیابی سے نمایاں کیا ہے وہ اسے ایک بہترین ناول نگار، منفرد ادیبہ اور ظلم سے متنفر قلم کار کی صورت میں ممتاز کرتی ہے۔ مریم جمیلہ نے مظلوم فلسطینیوں کی حالتِ زار اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کو ایسے دردِ دل کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے کہ ہر باضمیر انسان اس کے لیے عش عش کر اٹھتا ہے۔

کرب کا دور

مریم جمیلہ کو ذہنی امراض کے ہسپتال میں بچپن میں بھی داخل کرایا گیا تھا، اب ذہنی بیماری (Schizophrenia) کے تحت ایک بار پھر ہسپتال داخل کرادیا گیا۔ دراصل اس کے گھر والے اور پورا معاشرہ بشمول اطبا اسے سمجھ ہی نہیں پائے تھے۔ وہ ان کی دنیا کی فرد نہ تھی۔ بے چاری مریم ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک تقریباً دو سال ہسپتال میں رہیں۔ یہ دور اس بے قرار روح کے لیے انتہائی اذیت ناک تھا۔ بعد میں وہ اپنی اکثر تحریروں میں بڑے کرب کے ساتھ اس کا ذکر کرتی ہیں۔ خدا خدا کر کے ہسپتال سے چھٹی ملی تو مریم جمیلہ ۲۴-۲۵ سال کی ہوگئی تھیں۔ اب انھوں نے اسلام کا مطالعہ جاری رکھنے کے ساتھ عالمِ اسلام کی اہم شخصیات سے تعارف حاصل کرنے اور اسلام کے بارے میں مزید معلومات کی خاطر ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

Marfat.com

ان کے اپنے قول کے مطابق اس عرصے میں ان کی خط وکتابت جن شخصیات سے رہی ان میں عرب وعجم کے کئی علما اور مشاہیر شامل تھے۔ وہ اس ضمن میں تحریر فرماتی ہیں:

مسلم دانش وروں سے رابطے

''میں نے عرب ممالک اور پاکستان کے تقریباً ایک درجن نوجوان دانشوروں سے خط و کتابت شروع کی، مگر ان میں سے بیشتر حضرات نے اپنے یورپین طرزِ زندگی، اسلامی عقائد و معاشرت کے ضمن میں بے حسی بلکہ بعض اوقات برملا مخاصمانہ رویے اور بچگانہ اندازِ فکر کے حوالے سے مجھے بہت مایوس کیا اور ان لوگوں سے میری مراسلت چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکی۔ بالآخر میں نے بالغ نظر اور بارسوخ مسلمان رہنماؤں بالخصوص علما سے رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۶۰ء کے اختتام تک میں اقوامِ متحدہ میں عراق کے سابق مندوبِ اعلیٰ ڈاکٹر فاضل جمالی، واشنگٹن میں اسلامک سنٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمود حب اللہ، الجزائری علما کے سرخیل اور فرانسیسی استعمار کے خلاف جہادِ آزادی کے ہیرو شیخ محمد بشیر ابراہیمی، الازہر کے ڈاکٹر محمد البھی، پیرس کے ڈاکٹر حمید اللہ، اسلامی فقہ وقانون کے نامور ماہر، دمشق یونیورسٹی میں علم شریعت کے پروفیسر اور شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر معروف دوالیبی، اور جینوا میں اسلامک سنٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سعید رمضان سے خطوط کا تبادلہ کر چکی تھی۔ سید قطب شہید سے رابطہ قائم کرنے کی سر توڑ کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی کہ وہ اس وقت مصر میں لمبی قید کاٹ رہے تھے۔''

مولانا مودودی سے تعارف

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس قدر متجسس اور وسیع المطالعہ امریکی لڑکی کو اتنا عرصہ مولانا مودودیؒ اور ان کی تحریک سے کوئی تعارف حاصل نہ ہو سکا۔ گویا جو اصل منزل تھی، وہی اب تک نظروں سے اوجھل رہی، بہر حال اللہ کے ہر کام میں حکمت و مصلحت ہوتی ہے۔ آخر کار مسافر کو منزل کا سراغ مل ہی گیا۔ کیسے؟ وہ خود بتاتی ہیں: ''اس زمانے میں شیخ حسن البنا اور اخوان المسلمین کا ذکر، اگرچہ منفی انداز میں سہی، نیویارک کے اخبارات و جرائد میں کثرت سے آتا تھا، لیکن امریکی

Marfat.com

سکالروں اور صحافیوں کو ابھی تک مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی اہمیت وحیثیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ تقریباً دس برس سے انگریزی کتابوں اور رسالوں کے بے تحاشا مطالعے کے باوجود میں مولانا مودودی کے نام تک سے واقف نہ تھی نہ جماعتِ اسلامی کے بارے میں کچھ جانتی تھی، ۱۹۶۰ء میں کینتھ مورگن کی کتاب ''اسلام، صراطِ مستقیم'' ISLAM THE STRAIGHT PATH میں مظہرالدین صدیقی کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا جس میں مولانا مودودی کا ذکر تھا۔ یہ بھی محض اتفاق کی بات ہے کہ میں نے ''دی مسلم ڈائجسٹ ڈربن'' میں اسی نام کے تحت ایک شاندار مضمون پڑھا اور میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ایسے غیر معمولی ذہین اور صلاحیتوں کے حامل انسان سے مراسلت کی جائے۔ چنانچہ میں نے جریدۂ مذکور کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر مولانا موصوف کا ایڈریس حاصل کرلیا۔''

مراسلت

مولانا سے خط وکتابت بڑی دلچسپ ہے اور خاصی طویل بھی۔ مریم جمیلہ جب پہلا خط لکھ رہی تھی تو اسے مختلف قسم کے خیالات وخدشات نے گھیر رکھا تھا۔ یہ مصروف ترین آدمی خط کے جواب میں کیا لکھے گا، کچھ معلوم نہ تھا۔ فرماتی ہیں: ''میں نے مولانا مودودی کو پہلا خط لکھا تو زیادہ سے زیادہ میں ایسے مختصر سے جواب کی توقع لگائے بیٹھی تھی جس میں باہم یکساں خیالات ونظریات پر مسرت وخیر خواہی کا ذکر کیا گیا ہوگا۔ اُس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ خط وکتابت میری ساری زندگی کے لیے فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہوگی۔'' (دیباچہ مراسلت مابین مولانا مودودیؒ ومریم جمیلہ)

مولانا مودودی سے مریم جمیلہ کی طویل خط وکتابت رہی۔ یہ خط وکتابت بعد میں انگریزی اور اردو میں چھپ کر کتابی صورت میں بھی محفوظ ہوگئی۔ اردو میں اس کا ترجمہ پروفیسر عبدالغنی فاروق نے کیا۔ اس میں مریم جمیلہ کے طویل خطوط مولانا مودودی کے نام اور مولانا کے بھی طویل خطوط محترمہ کے نام ہیں۔ یہ خطوط بھی اپنے اندر دین کے فہم وعلم کے دریا سموئے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

مریم جمیلہ پہلے ہی سے قلبی طور پر تو مسلمان تھیں مگر ان خطوط کے نتیجے میں مریم جمیلہ نے باقاعدہ اور علی الاعلان اسلام قبول کیا اور ۱۹۶۲ء میں ہمیشہ کے لیے پاکستان ہجرت کر آئیں۔ ایک بار آئیں تو پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، نہ ہی کبھی واپس گئیں۔

مریم جمیلہ خود لکھتی ہیں:

''مولانا مودودی نے مجھے قبولِ اسلام کی ترغیب نہیں دی۔ اس کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ میں اس سے پہلے ہی عین اسلام کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی تھی اور اپنا آخری فیصلہ اُن کے علم کے بغیر بھی کر سکتی تھی۔ اسی طرح مولانا موصوف نے میری علمی زندگی کے حوالے سے کوئی فیصلہ کن اثرات مرتب نہیں کیے کہ ان سے تعارف حاصل ہونے سے کم وبیش ایک سال پہلے سے میں اسلام کی مدافعت اور حمایت میں مقالات لکھ رہی تھی اور ایک دوسرے سے باہم متعارف ہونے سے قبل ہی میرے خیالات ونظریات کا ڈھانچہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہو چکا تھا۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خط وکتابت کے اثر سے مجھے جو وسیع معلومات حاصل ہوئیں اور بصیرت کو جو روشنی وگہرائی ملی، اس کے نتیجے میں میرے خیالات کی شیرازہ بندی ہو گئی اور میری تحریر کو نیا عُمق اور پختگی نصیب ہوئی۔'' (ایضاً)

والدین کو مشورہ

اس عرصے میں یعنی ۵ر دسمبر ۱۹۶۰ء سے ۱۸ر اپریل ۱۹۶۲ء تک مریم جمیلہ کے گیارہ خطوط مولانا کو ملے اور مولانا کی طرف سے بھی گیارہ جواب ارسال کیے گئے۔ اس دوران مریم جمیلہ صاحبہ کے پاکستان ہجرت کر آنے سے قبل مولانا نے ایک خط ۱۸ر اپریل ہی کو مریم جمیلہ کے والدین کے نام لکھا جس میں تحریر فرمایا:

''لاہور

۱۸ر اپریل ۱۹۶۲ء

محترمی مسٹر ومسز مارکوس

Marfat.com

میں آپ کو یہ خط پاکستان سے لکھ رہا ہوں۔ ہمارے تعارف اور رابطے کا ذریعہ آپ کی بیٹی مس مارگریٹ مارکوس ہے جس سے گزشتہ ڈیڑھ برس سے میری خط و کتابت جاری ہے۔ میں یہاں مختصراً یہ خط لکھنے کی وجوہ بیان کروں گا۔

جہاں تک میرا خیال ہے آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی گزشتہ کئی برسوں سے اسلام کا مطالعہ کر رہی ہے اور باقاعدہ قبولِ اسلام سے قبل ہی اس نے اسلام کے دفاع اور حمایت میں مضامین اور مقالات لکھنے شروع کر دیے تھے۔ بعد ازاں گہرے غور و خوض اور طویل سوچ بچار کے بعد اُس نے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے اور اسے نئے ضابطۂ حیات کے طور پر باقاعدہ اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چونکہ میں بھی اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور سنِ بلوغ ہی سے اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں ہوں، اس لیے نظریات و عقائد کی ہم آہنگی ہمارے درمیان رابطے کا ذریعہ بن گئی اور ہم ایک دوسرے سے اچھے خاصے متعارف ہو گئے۔

دعوت بطور سرپرست و مربّی

جیسا کہ آپ کی بیٹی نے اپنی حالیہ اور آیندہ مشکلات کے بارے میں لکھا ہے، میں نے اندازہ کیا ہے کہ امریکی معاشرے میں اب اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ مجھے خدشہ ہے کہ اگر وہ امریکہ میں رہتی ہے اور وہ جن حالات سے دوچار ہے وہ جوں کے توں رہتے ہیں، تو اس کی پوری زندگی تباہ ہو کے رہ جائے گی۔ یہی سبب ہے کہ میں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ کسی اسلامی ملک میں رہائش اختیار کر لے اور اس کے لیے اگر وہ پاکستان کو منتخب کرے تو میرے گھر کے دروازے اپنے لیے کھلے پائے گی۔ محض عارضی مہمان کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اگر وہ چاہے تو میرے خاندان کے مستقل رکن کی حیثیت سے بھی، میرے دل میں اُس کے کردار اور خیالات کے لیے بڑی قدر ہے اور میں اسے اتنا ہی عزیز جانتا ہوں جتنا کسی خونی رشتے دار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت میں نے اسے پیش کش کی ہے کہ وہ پاکستان آ جائے اور میرے خاندان کا ایک فرد بن کر زندگی گزارے۔ وہ میری دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہے، مگر جب تک اُس کے شفیق والدین

Marfat.com

اجازت نہ دیں، وہ کوئی قدم اٹھانے سے گریزاں ہے اور یہی پسِ منظر آپ کو خط لکھنے کا ہے۔

اگر آپ میرے بارے میں پہلے سے باخبر ہوتے تو مجھے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ میں آپ کے لیے قطعی اجنبی ہوں اس لیے میں یہی یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ اس معاملے میں مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں فطری طور پر آپ کا پہلا ردِعمل تو یہ ہوگا کہ آپ اپنی بیٹی کا امریکہ سے ترکِ وطن کر کے کسی مشرقی ملک میں آباد ہونا پسند نہیں فرمائیں گے، لیکن سنجیدگی اور ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں گے اور اپنی بیٹی کی زندگی بھر کی بھلائی کو پیشِ نظر رکھیں گے، تو میرا خیال ہے کہ آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ وہ جس خطرناک اور انتہائی ناگوار صورتِ حالات سے دوچار ہے، اس سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

دیگر اسلامی ملکوں کے مقابلے میں اس کے لیے پاکستان اس لیے قابلِ ترجیح ہے کہ یہاں انگریزی زبان بخوبی سمجھی اور بولی جاتی ہے اور نومسلموں کی لوگ بے حد عزت کرتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مس مارگریٹ سے آپ سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میری بیوی اور بچے اگر اس کے لیے کسی امریکی خاندان سے بہتر ثابت نہ بھی ہوئے، تو کم از کم اُس کے برابر حسنِ سلوک ضرور کر سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آپ کو اس کے مستقبل کے بارے میں ہرگز کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تسلیمات کے ساتھ،

آپ کا مخلص......ابوالاعلیٰ"

مولانا کے خط کا جواب جو مریم جمیلہ کے والد مارکوس کی طرف سے ارسال کیا گیا، اس کا مضمون بلاشبہ بہت متوازن اور متعاون ہے۔ انھیں یقیناً یہ احساس ہو گیا ہوگا کہ دعوت دینے والا شخص مخلص، نیک نیت اور دیانت دار ہے۔ اپنے اس خط میں انھوں نے لکھا:

والد کا متوازن مکتوب

"نیویارک

۲رمئی ۱۹۶۲ء

Marfat.com

محترمی مودودی صاحب

شکر گزار ہوں کہ آپ نے خط (مورخہ ۱۸/اپریل) تحریر فرمایا۔ آپ نے میری بیٹی مارگریٹ کو اپنے گھر میں آکر رہنے کی جو دعوت دی ہے، اُس کے لیے میں سراپا سپاس ہوں۔ میں اور میری بیگم آپ کے غیر معمولی جذبۂ مروت و مہمانداری سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔

گزشتہ ایک برس سے جب سے کہ مارگریٹ نے اسلام قبول کیا اور ایک پر جوش و سرگرم نومسلم کی زندگی گزارنی شروع کی ہے، صاف نظر آتا ہے کہ ہماری سوسائٹی میں اُس کے لیے کئی نوع کی عملی دشواریاں موجود ہیں۔ مارگریٹ آپ کی پیش کش قبول کرنے پر بڑے اشتیاق سے آمادہ ہے اور والدین کی حیثیت سے ہم اُس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے اس کی اجازت دیتے ہیں اگرچہ وہ ایک دور دراز مقام پر چلی جائے گی۔ خصوصاً اسلام کے لیے وہ اپنے اندر جس قدر گرم جوشی اور فعالیت رکھتی ہے، اس کے پیش نظر ہم بھی مطمئن ہیں کہ پاکستان میں اُسے ایک پُرمسرت اور بامقصد زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔

ایک ایسے ملک میں رہائش اختیار کرنا جہاں کا کلچر قطعی نامانوس اور اجنبی ہو، وہاں کی معاشرت سے مطابقت حاصل کرنے کے لیے اچھی خاصی استقامت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ آپ کے خطوط میں جس ہمدردی، اخلاص اور عزم کا پتہ چلتا ہے اور خود مارگریٹ اسلام اور اب پاکستان کے لیے جو اشتیاق رکھتی ہے، اس کے پیشِ نظر ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کے خاندان میں مطمئن اور خوش رہے گی۔

آپ نے شہریت اور شادی کے بارے میں مارگریٹ کو جو مشورہ دیا ہے، اس پر بھی میں بہت خوش ہوں، ایک باپ کی حیثیت سے میری بھی یہی رائے ہے کہ پاکستان میں ایک مناسب مدت کی رہائش کے بعد ہی اسے اس قسم کے دوررس اور ٹھوس عملی قدم اٹھانے چاہییں۔

آپ کے ملک کو بھیجتے ہوئے ہماری دعائیں اس کے شاملِ حال رہیں گی اور ہم اس کی فوز و فلاح میں تواتر کے ساتھ دلچسپی برقرار رکھیں گے، اس لیے اس کے بارے میں آپ آیندہ بھی جب

Marfat.com

چاہیں، مجھے آگاہ کر سکتے ہیں اوراس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

میری اہلیہ اور میری جانب سے آپ، آپ کی اہلیہ اور بچوں کے لیے نیک خواہشات۔

مخلص...... ہربرٹ ایس۔ مارکوس''

پاکستان نیا وطن

پاکستان آنے کے بعد محترمہ مریم جمیلہ کا قیام کچھ عرصہ تو مولانا مودودی کے گھر رہا۔ پھر وہ چند ایام کے لیے تبدیلی آب وہوا اور ماحول کے لیے مولانا کے دوست اور جماعت کے بزرگ ساتھی حکیم رانا نعمت العلی کے ہاں پتوکی چلی گئیں۔ حکیم صاحب کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ دیہاتی ماحول اور حکیم صاحب کی بیگم صاحبہ کے انتہائی محبت بھرے سلوک سے مریم جمیلہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کے مشورے سے لاہور سے اپنا سامان (کتب وغیرہ) لے کر طویل قیام کے لیے یہاں آگئیں۔ یہاں سے انھوں نے اپنے والدین کے نام خطوط لکھے جو (At Home in Pakistan) کے نام سے چھپے۔ ان خطوط میں مریم جمیلہ نے اپنے گردونواح اور ماحول کا خوب صورت نقشہ کھینچا ہے، جس میں ادبی منظر کشی بھی ہے اور اخلاص وسادگی بھی۔ ان کے اپنے بقول یہ ان کے نئے وطن میں قیام کے دوران ان کی سوانح عمری ہے۔ اس دوران انھیں دماغی امراض کے ہسپتال بھی رہنا پڑا۔ یہاں ڈاکٹر محمد رشید چودھری اور ڈاکٹر سعیدہ کے حسن سلوک کا بالخصوص محترمہ نے تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات خاصی دلچسپ اور اطمینان بخش ہے کہ مریم جمیلہ نے امریکہ میں دماغی امراض کے ہسپتال میں گزرے ہوئے اپنے ایام کا پاکستانی ہسپتال سے موازنہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کا ماحول امریکی ہسپتال کے ماحول سے کئی گنا بہتر ہے۔ اس عرصے میں مریم جمیلہ نے ہسپتال ہی میں عید قربان کے موقع پر ایک چھترے کی قربانی دی اور گوشت مستحقین میں تقسیم کیا۔ قربانی کا چھترا ستر روپے میں آیا تھا۔ اسی عرصے میں مریم جمیلہ ہسپتال سے فارغ کر دی گئیں اور بیگم عثمانی کے گھر میں بالائی منزل پر رہائش پذیر ہوگئیں۔

Marfat.com

خوب صورت تصویر کشی

مریم جمیلہ کی شادی بھی اسی گھر میں قیام کے دوران محمد یوسف خاں صاحب کے ساتھ ہوئی۔ اس کا تفصیلی تذکرہ بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ سنت نگر میں یوسف خاں صاحب کے دومنزلہ مکان میں منتقل ہوگئیں جہاں موصوف کی پہلی اہلیہ اور بچوں کے علاوہ ان کی بوڑھی والدہ بھی رہائش رکھتی تھیں۔ مریم جمیلہ کے بقول شفیقہ خانم شروع میں اس دوسری شادی کی وجہ سے خاصی پریشان رہیں مگر کبھی کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ تاہم کچھ ہی وقت گزرنے کے بعد وہ سمجھ گئیں کہ ان کے خاوند دونوں بیویوں کے ساتھ مکمل عدل وانصاف کا معاملہ کرتے ہیں تو ان کو اطمینان حاصل ہوگیا۔ اب دونوں کے درمیان بہت مثالی تعلقات قائم ہو گئے۔ شفیقہ نے اس قدر ایثار کیا کہ وہ یادگار اور قابل داد وتحسین ہے۔ مریم جمیلہ کے بچوں کو بھی اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا، محولہ بالا کتاب میں مریم جمیلہ نے پورے خاندان اور ان کے رشتہ داروں اور تمام ارکان کا بہترین تعارف کرایا ہے، رہن سہن، کھانے پینے اور معاشرت کے معاملات کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ قاری اس میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔

یوسف خاں اور مریم جمیلہ کی شادی

مولانا مودودی نے مریم جمیلہ کو جب بھی خط لکھے، انھیں بہن کہہ کر مخاطب کیا اور خود کو برادر مگر جب وہ پاکستان آگئیں تو مولانا نے اپنے گھر میں ان کو بطور بیٹی ٹھہرایا۔ وہ اپنی بیٹیوں ہی کی طرح ان سے محبت کیا کرتے تھے۔ انھیں مریم کی شادی کی اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ فکرمندی تھی کیوں کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسلام کی آغوش میں آئی تھیں۔ مریم جمیلہ کی شادی ۱۹۶۲ء میں محمد یوسف خاں صاحب سے ہوئی۔ اس شادی کا پس منظر یوسف خاں صاحب خود یوں بیان کرتے ہیں۔

”میں ہمیشہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور جو کام بھی وہ میرے سپرد کرتے اسے بطریق احسن پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مریم جب پاکستان آئی تو یہاں بھی اسے کچھ عرصہ ہسپتال میں رہنا پڑا۔ مولانا کے حکم سے میں اسے ضرورت کی ہر چیز پہنچایا کرتا تھا۔ ایک روز ۵۔

Marfat.com

اے ذیلدار پارک کے لان میں جہاں آج مولانا کی قبر ہے، میں، خواجہ علاؤ الدین اور بشیر بٹ کھڑے تھے۔ مولانا اپنے دفتر سے باہر آئے اور ہمارے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ باہمی حال احوال اور علیک سلیک کے بعد مولانا نے فرمایا ''میں مریم کی شادی کے لیے بہت پریشان ہوں۔'' مولانا نے یہ فقرہ تین مرتبہ دہرایا۔ خواجہ علاؤ الدین بولے ''یوسف خاں صاحب! مولانا کا روئے سخن آپ کی طرف ہے۔'' میں پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس وقت میرے چار بچے بھی تھے۔ مولانا سمیت سبھی لوگوں کو اس کا علم بھی تھا۔ میں نے عرض کیا ''مولانا! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ مجھے ذرا گھر تک جانے دیجیے۔'' مولانا نے فرمایا ''ٹھیک ہے۔''

میں گھر آیا اور اپنی پہلی اہلیہ کو ساری بات بتائی۔ اللہ کی اس نیک بندی نے ذرا سا سوچا اور پھر کہا ''خان صاحب! مولانا کی بات کو حکم سمجھو اور عمل کر گزرو۔ اللہ بہتری کرے گا۔'' میری طرف سے میری اہلیہ شفیقہ خانم مولانا کے پاس گئیں اور مریم کے رشتے کی بات کی۔ یوں یہ رشتہ طے ہوا۔'' اس زمانے میں مریم جمیلہ بیگم عثمانی کے مکان سنت نگر میں مقیم تھیں۔ مولانا ان کی جملہ ضروریات کا خیال رکھا کرتے تھے۔

یادگار ملاقاتیں

خان صاحب نے یہ بات اپنے گھر میں پہلے بھی کئی بار مجھ سے براہ راست کہی تھی۔ اس وقت محترمہ مریم جمیلہ بھی خان صاحب کے ساتھ مجلس میں موجود ہوا کرتی تھیں۔ خان صاحب کے ہاں میرا آنا جانا باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ اگر ملاقاتوں کے درمیان کا وقفہ طویل ہو جاتا تو خان صاحب کا فون آ جاتا، سو میں حاضر ہو جاتا۔ کئی مرتبہ ان نشستوں کا کچھ حال میں نے اخبارات و رسائل کو بھی بھجوایا اور وہ رپورٹیں ان میں چھپتی بھی رہیں۔ مریم جمیلہ شروع میں تو پردے کا زبردست اہتمام کرتی تھیں مگر آخری سالوں میں جب وہ بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھیں تو مجلس میں چادر اوڑھ کر شریک ہوا کرتی تھیں۔ یہ سب ملاقاتیں، معلوماتی، دلچسپ، ایمان افروز اور یادگار ہوا کرتی تھیں۔

Marfat.com

تعزیت کے لیے حاضری

مریم جمیلہ کی وفات کے بعد تیسرے چوتھے روز جب ان کے بیٹے حیدر فاروق امریکہ سے آئے اور مجھے پیغام ملا کہ میں خان صاحب کے گھر آؤں تو میں گیا۔ (وفات کے روز بھی حاضر ہوا تھا اور مرحومہ کا جنازہ بھی خان صاحب اور ان کے پورے خاندان کے کہنے پر پڑھایا تھا۔) گھر حاضر ہوا تو حیدر فاروق اور خان صاحب کے سب سے بڑے بیٹے عمر فاروق نے استقبال کیا۔ حیدر، عمر اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ میں نے بارِ دیگر تعزیت کی۔ پھر مرحومہ کا تذکرہ دیر تک ہوتا رہا۔ مریم جمیلہ کی بیٹی ماریہ خانم اور ان کے خاوند بھی موجود تھے۔ دیر تک تبادلۂ خیالات کے بعد میں نے اجازت چاہی تو خان صاحب نے فرمایا ''نہیں حافظ صاحب ذرا بیٹھو۔ پھر تمام بچوں اور عزیزوں سے کہا کہ آپ لوگ باہر چلے جائیں۔'' میں نے عرض کیا '' آپ کی آواز تو پورا محلہ سنتا ہے، یہ باہر کیوں چلے جائیں مگر خان صاحب کا اصرار تھا، سو وہ چلے گئے۔ اس کے بعد خان صاحب نے مذکورہ بالا واقعہ بسلسلہ شادی دوبارہ سنایا۔ میں نے کہا کہ پہلے بھی آپ کی زبان سے سنا تھا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں مگر یہ اہم واقعہ ہے۔

کافی عرصہ پہلے خان صاحب نے یہی واقعہ سنایا تو میں نے عرض کیا '' مریم جمیلہ صاحبہ نے تو ذرا مختلف انداز میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ فرمانے لگے '' ہاں وہ بھی درست ہے کیوں کہ شفیقہ (پہلی بیوی) مولانا کے ہاں گئی تھی، مریم سے اس نے جا کر بات نہیں کی تھی۔ مولانا سے بات ہو جانے کے بعد میں نے مریم سے خود جا کر بات کی جو اس زمانے میں بیگم عثمانی کے گھر میں بالائی منزل پر کرائے دار کے طور پر مقیم تھی اور میں مولانا کے حکم سے ساری ضروریاتِ زندگی اس تک بیگم عثمانی ہی کی معرفت پہنچایا کرتا تھا۔

رشتے کی بات اور سوال و جواب

مریم جمیلہ صاحبہ نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔ '' ایک خوشگوار دن میں بیگم عثمانی کے گھر سے مولانا مودودیؒ کے گھر گئی۔۔ مولانا نے مجھے عشائیے کی دعوت دی تھی۔ اس دوران دن کے

Marfat.com

وقت محمد یوسف خان، بیگم عثمانی کے گھر میرے پاس آئے اور مجھے ایک بات کہی جو اس سے قبل انھوں نے کبھی نہ کہی تھی، انھوں نے کہا: ''کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی؟'' اچانک یہ بات سن کر میں ششدر رہ گئی۔ میری انتیس سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی ذمہ دار شخص نے سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے رشتے کی بات کی تھی۔ میں خاموش تھی کہ یوسف خان نے اپنی بات پھر دہرائی، میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے ذہنا تیار نہ تھی اور میرے علم میں یہ بھی تھا کہ یوسف خان پہلے ہی شادی شدہ ہیں اور اُن کے چار بچے بھی ہیں، ان کی فیملی مجھ سے ملنے کے لیے اس سے قبل میرے پاس آچکی تھی۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا، ''آپ کیا بات کر رہے ہیں؟ آپ کے تو پہلے سے بیوی بچے ہیں۔ کیا آپ اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتے؟''

یوسف خان نے جواب دیا: ''یقیناً میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں مگر آپ جانتی ہیں کہ اسلام میں ایک مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ مولانا مودودیؒ نے مجھے آپ کا خیال رکھنے اور ہر طرح کی خدمت کی تلقین فرمائی ہے۔ میں ہر چیز ان کے حکم کے مطابق آپ تک پہنچا تا رہا ہوں مگر ہم دونوں آپس میں غیر محرم ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے آپ کے پاس یوں میرا آنا جانا قطعاً مناسب نہیں۔ میں نے جب پھر پہلی بیوی اور بچوں کے بارے میں کہا تو یوسف خان بولے، ''آپ کوئی فکر نہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے کہا، ''میں کوئی فیصلہ کرنے سے قبل مولانا مودودیؒ سے مشورہ اور اجازت لینا چاہتی ہوں، ان کے مشورے کے بغیر میں کوئی اقدام نہیں کروں گی۔''

مرشد کا مشورہ

اس کے بعد مریم جمیلہ نے اگلے مراحل کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مولانا سے مشورہ مانگا تو انھوں نے یوسف خان کے کردار کی تعریف کی اور فرمایا کہ ''ان شاء اللہ ان کے ساتھ نباہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔'' چنانچہ اس کے بعد ۸ / اگست ۱۹۶۳ء کو بیگم عثمانی کے گھر چند بزرگوں کی موجودگی میں محمد یوسف خان صاحب اور محترمہ مریم جمیلہ نکاح کے بندھن میں ایک

Marfat.com

دوسرے کے ساتھ بندھ گئے اور پھر نصف صدی کی مدت خوب گزری۔ شادی کے اس واقعہ کو مریم جمیلہ صاحبہ نے اپنے والدین کے نام اپنے مکتوب مؤرخہ ۱۱رنومبر ۱۹۶۳ء میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ اتنا طویل خط ہے کہ مطبوعہ بیس صفحات کا ایک کتابچہ بن جاتا ہے۔ اس خط میں نکاح کے بعد کی خوشگوار زندگی کے ابتدائی چار مہینوں کا بہت خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس میں یوسف خان صاحب کے پورے خاندان اور یہاں کی معاشرت کا بہترین تعارف بھی کرایا گیا ہے۔(بحوالہ At Home in Pakistan۔ صفحہ ۱۷۰ تا ۱۸۸)

میاں بیوی کی بیان کردہ تفصیلات میں کوئی تضاد نہیں۔ کچھ کام وہ تھے جو مولانا مودودی کو کرنا تھے، کچھ ذمہ داریاں خان صاحب کی پہلی بیگم محترمہ شفیقہ خانم کو ادا کرنا تھیں۔ حکمت کے ساتھ یہ سب کام انجام پذیر ہوئے اور یوں ایک بہترین اور مثالی جوڑا ہی نہیں، تعدّد ازدواج کا خوشنما نمونہ اور مثالی گھرانہ بھی ہماری تاریخ میں وقوع پذیر ہوا۔ مریم جمیلہ کو اس سے بہتر گھرانہ اور بہتر جیون ساتھی کہیں اور نہ مل سکتا تھا۔ اس فیصلے میں ان کے لیے خیر ہی خیر تھا۔“

یوسف خاں کا خاندان

یوسف خاں صاحب نے بتایا کہ ان کی دونوں بیگمات کی پیدائش ۱۹۳۴ء کی ہے۔ دونوں کا کوئی بھائی نہ تھا اور دونوں کی ایک ایک بہن تھی۔ یوسف خاں صاحب کی اپنی پیدائش ۱۹۲۴ء کی ہے۔ یوسف خاں صاحب کہتے ہیں کہ ان کی دونوں بیویاں آپس میں ایک دوسری سے مثالی محبت کرتی تھیں۔ دونوں سے اللہ نے بچے عطا فرمائے۔ مریم جمیلہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتی تھیں اور شفیقہ خانم نے اپنے اور ان کے بچوں کو یکساں محبت اور توجہ سے پالا پوسا۔ سبھی بچے شفیقہ خانم کو امی اور مریم جمیلہ کو آپا کہتے تھے۔ پہلی بیوی سے خاں صاحب کے ہاں دس بچے (چھ بیٹیاں اور چار بیٹے) پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی عائشہ بچپن ہی میں فوت ہوگئی جبکہ ایک بیٹا محمد فاروق بھی جوانی کے عالم میں ۲۰۰۵ء میں وفات پا گیا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کا ایک بیٹا ہے، مومن خاں جو اس وقت کالج میں زیر تعلیم ہے۔ مریم جمیلہ سے خان صاحب کو اللہ نے پانچ بچے عطا فرمائے۔ ان

Marfat.com

میں سے بھی ایک بچی بچپن ہی میں فوت ہوگئیں۔ اتفاق سے اس کا نام بھی عائشہ ہی تھا۔ اس وقت مریم جمیلہ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں موجود ہیں۔ خان صاحب کو ''عائشہ'' اس قدر محبوب نام ہے کہ اس نام کی دو بیٹیاں فوت ہو جانے کے بعد اپنی ایک اور بیٹی کا نام بھی عائشہ رکھا اور ماشاء اللہ وہ حیات ہیں اور دیگر بہن بھائیوں کی طرح صاحب اولاد ہیں۔

خان صاحب کے بچوں کے نام یوں ہیں

شفیقہ خانم سے عائشہ (مرحومہ)، عمر فاروق، احمد فاروق، محمد فاروق (مرحوم)، حسین فاروق، حمیرا خانم، اسماء خانم، میمونہ خانم، عائشہ خانم ثالثہ، ریحانہ خانم۔

مریم جمیلہ سے عائشہ ثانیہ (مرحومہ) حلیمہ سعدیہ، خالد فاروق، حیدر فاروق، ماریہ خانم۔

عزیمت واستقامت

مریم جمیلہ جب مسلمان ہو کر پاکستان آئیں تو یہاں کے ماحول میں باوجود مختلف مشکلات کے کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی۔ وہ واقعۃً کشتیاں جلا کر آئی تھیں اور پھر واپس ایک بار بھی امریکہ نہیں گئیں۔ ان کے والدین اپنی زندگی میں ان سے ملنے کے لیے پاکستان آتے رہے مگر ان کی بہن باوجود کئی مرتبہ دعوت دینے کے نہ آسکیں۔ البتہ مریم جمیلہ کے بیٹے خالد فاروق اور حیدر فاروق امریکہ میں ان سے ملتے رہتے ہیں۔ ان کی خالہ ان سے محبت کرتی ہیں مگر وہ اسلام کی طرف مائل نہیں ہوسکیں۔ مریم جمیلہ کے عزمِ صمیم اور غیرت اسلامی کو صدرِ اول کے اہل عزیمت کی مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ مریم جمیلہ کے بیٹے حیدر فاروق نے بتایا کہ میں جب امریکہ گیا تو تحریکی ساتھیوں نے مجھ سے کہا ''انگریزی میں تقریر کرو''۔ ان کا خیال تھا کہ والدہ کی وجہ سے انگریزی میری مادری زبان ہوگی۔ میں نے کہا ''نہیں میں تو اردو ہی میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔'' اس پر سب لوگوں کو ازحد تعجب ہوا۔ دراصل آپا نے ہمیں یہی سمجھایا تھا کہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور اسی میں ہمیں تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ میں نے ایک بار امریکہ سے اپنے خط میں یہ شکایت لکھی کہ ہمیں انگریزی مین کمال اور مہارت آپ نے فراہم نہیں کی تو جواب لکھا ''تم میرے انگریزی مکتوب کو

Marfat.com

اچھی طرح سمجھ لیتے ہو اور مجھے جواب بھی لکھ دیتے ہو۔اتنی انگریزی تمھارے لیے کیا کم ہے؟''

صبغۃ اللہ

حیدرہی نے یہ بھی بتایا کہ پندرہ سال قبل وہ امریکہ سے ایک فارم لے کر آیا جس میں مریم جمیلہ صاحبہ کو سوشل سیکورٹی کے تحت کئی مراعات اور فنڈز قانونی طور پر مل سکتے تھے مگر آپا نے بالکل انکار کر دیا۔جب زیادہ اصرار کیا تو اللہ کی اس مخلص بندی نے یہ فارم ہاتھ میں پکڑا اور اسے پڑھے بغیر پھاڑ دیا۔پھر فرمایا کہ میں جس ملک اور معاشرے کو چھوڑ آئی ہوں، اس سے مراعات حاصل کرنا چہ معنی دارد؟ یہ ہے حقیقی تبدیلی اور صبغۃ اللہ! بہت سے یہاں کے پلے بڑھے مسلمان زندگی کے کسی بھی حصے میں ان مادی مراعات کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے ہیں۔مگر اللہ کی اس بندی نے کتنی اعلیٰ مثال قائم کی ہے!!

بنت اسلام

حضرت سلمان فارسیؓ کا قبولِ اسلام سے پہلے حق کی تلاش میں گھر سے نکلنا اور دربدر کی ٹھوکریں کھانا ہماری تاریخ کا ایک یادگار باب ہے۔اس قیمتی ہیرے کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا مگر سچی تڑپ نے طالب کو منزل سے ہم کنار کر دیا۔اللہ نے اسلام کی دولت بھی بخشی اور غلامی سے آزادی بھی اپنے محبوبؐ اور ان کے صحابہؓ کے ذریعے دلا دی۔سلمان فارس کے معزز خاندان سے تھے مگر جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کا حسب نسب کیا ہے تو فرمایا ''سلمان بن اسلام بن اسلام۔'' گویا ان کی پہچان ہی اسلام اور ایمان تھا۔اسی پر ان کو فخر تھا اور اسی سے امیدیں وابستہ تھیں۔ان کے اس جواب اور عظیم کردار کی بدولت نبی مہربانؐ نے فرمایا تھا ''سلمان مِنّا اهل البیت ''یعنی سلمان تو ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔مریم جمیلہ نے بھی اسلام ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔اسی کو اپنی پہچان اور شناخت قرار دیا۔وہ واقعی بنت اسلام تھیں۔

مریم جمیلہ کی کتب ان کے علمی مقام ومرتبے کی بہترین شہادت ہے۔انھوں نے تین درجن کے لگ بھگ وقیع کتب تحریر فرمائیں۔ان میں سے بعض کے نام اور مختصر تعارف درجِ ذیل ہے۔

Marfat.com

علمی خدمات اور سرمایہ

1۔اسلام بمقابلہ مغرب:(Islam versus the West)

مریم جمیلہ کی یہ کتاب اسلامی اقدار اور معاملات کا مغربی تہذیب وتمدن سے موازنہ کرتی ہے اور مثالوں کے ذریعے اسلام کی برتری کے دلائل دیتی ہے۔ممکن ہے کوئی مغربی ذہن رکھنے والا نام نہاد دانشور یا کوئی متعصب مستشرق مصنفہ پر جانبداری کا الزام لگا دے مگر خالی الذہن ہو کر منصفانہ انداز میں جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ مصنفہ کے صائب ہونے کا انکار نہیں کر سکے گا۔

2۔اسلام اور جدیدیت:(Islam and Modernism)

اس میں نام نہاد متجددین اور مغربی مرعوبیت کے تحت اسلام کو نیا جامہ پہنانے کے خواہش مند سیکولر اور منحرف طبقات کو چیلنج کیا گیا ہے۔

3۔اسلام،نظریہ اور عمل:(Islam in Theory and Practice)

یہ کتاب اسلام کا بہت جامع اور بنیادی تعارف ہے،جس میں مریم جمیلہ نے اپنے طویل اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔

4۔اسلام بمقابلہ اہلِ کتاب:(Islam Versus Ahl Al Kitab- Past and Present)

اس میں مصنفہ نے تینوں الہامی مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اہل کتاب کی تاریخِ اسلامی کے صدرِ اول سے دورِ جدید تک کی ریشہ دوانیوں اور زیادتیوں کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔

5۔احمد خلیل:(Ahmad Khalil: The Story of a Palestinian Refugee and his Family)

فلسطین کے تناظر میں لکھا گیا عبرت انگیز ناول

نصف صدی قبل چھپنے والا یہ ناول آج بھی صہیونی حکومت کے مظالم اور بے یارومددگار اہلِ فلسطین کے مصائب کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ناول پڑھتے ہوئے بار بار آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

Marfat.com

6۔اسلام اوراستشراق:(Islam and Orientalism)

مستشرقین کا بھیانک چہرہ دیکھنا ہو اور اسلام کے خلاف ان کے رکیک حملوں کی حقیقت جاننا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

7۔تہذیبِ مغرب خود اپنی نگاہ میں قابلِ مذمت: (Western Civilization Condemned by Itself (Vol:I-II)

یہ بھی مغربی تہذیب ہی کا پوسٹ مارٹم ہے جس میں خود اس کی اندرونی کہانی، اس کا تجزیہ اور اس سے نکلنے والے منطقی نتائج زیرِ قلم آئے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور مریم جمیلہ کی سب سے ضخیم تصنیف یہی ہے۔

8۔مراسلت مابین مولانا مودودیؒ اور مریم جمیلہ: (Correspondence Between Maulana Maudoodi and Maryam Jameelah)

یہ بہت اہم چوبیس خطوط ہیں جن میں سے گیارہ مریم جمیلہ کی طرف سے مولانا مودودیؒ کے نام لکھے گئے ہیں اور مولانا کی طرف سے بھی جواب میں گیارہ خطوط لکھے گئے ہیں۔ جبکہ ایک مولانا مودودیؒ نے مریم جمیلہ کے والدین کے نام لکھا اور پھر ان کی طرف سے مولانا کو خط کی صورت میں جواب موصول ہوا۔

9۔اسلام اور مغربی معاشرہ:(Islam and Western Society)

اپنے آپ کو کم تر سمجھنے والے اور مغربی مرعوبیت کے شکار مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ اس شکست خوردگی سے باہر نکلیں اور حقائق کا ادراک کریں۔

10۔ اسلام موجودہ بحرانوں کے روبرو: (Islam Face to Face with the Current Crisis)

دورِ حاضر کے گوناگوں مسائل اور اسلام کے موقف پر مشتمل تحریر۔

11۔میں کیوں مسلمان ہوئی؟:(Why I Embraced Islam)

اپنے قبولِ اسلام کی دلچسپ روداد بیان کرتی ہیں۔

Marfat.com

12۔دورِجدید میں اسلام اور مسلم خاتون:(Islam and the Muslim Women Today)

اسلام ہر دور میں معاشرے کے تمام طبقات اور ہر صنف کے لیے صراطِ مستقیم ہے۔خواتین کے تناظر میں اسی موضوع پر بات کی گئی۔اسلام نے عورت کو عزت اور حقوق دیے ہیں۔اسلام سے باہر ان کی تلاش حماقت ہے۔

13۔اسلام اور ہمارے معاشرتی رویے:(Islam and Our Social Habits)

14۔اسلامی ثقافت،نظریے اور عمل کی روشنی میں: (Islamic Culture in Theory and Practice)

15۔ماضی قریب میں عرب دنیا کی تین اسلامی تحریکیں:

(Three Great Islamic Movements in the Arab World of the Recent Past)

شمالی اور شمال مغربی افریقہ کے عرب ممالک کی جہادی تحریکوں کا تعارف۔

16۔مولانا مودودیؒ کون ہیں؟:(Who is Maudoodi?)

یہ مولانا کا ایک تعارف ہے۔

17۔امام حسن البنا اور اخوان المسلمون: (Shaikh Hassan al Banna and al Ikhwan al Muslimun)

اخوان اور بانی اخوان کا جامع اور مستند تعارف۔

18۔ترکی کی عظیم اسلامی تحریک:(A Great Islamic Movement in Turkey)

بدیع الزماں سعید نورسی کی انقلابی تحریک اور عظیم شخصیت کا بھرپور تعارف۔

19۔ شیخ عثمان بن فودیو مغربی افریقہ کے عظیم مجدد:

(Shehu Uthman Dan Fadio: A Great Mujaddid of West Africa)

نائیجیریا کے کامیاب مجدد شیخ عثمان بن فودیو اور ان کی قائم کردہ سکوٹو خلافت کا تعارف۔

اس کے علاوہ مرحومہ کی یہ کتب بھی بہت معلومات افزا ہیں۔

Marfat.com

20۔مغربی استعمار:(Western Imperialism Menaces Muslims)

21۔اسلام میں عائلی زندگی:(Family Life in Islam)

22۔نسلوں کے درمیان خلا،اسباب اور عواقب: (The Generation Gap: Its Causes and Consequences)

23۔کیا مغربی تہذیب میں عالمگیریت ہے؟:(Is Western Civilization Universal?)

24۔اسلام اور جدت پسند انسان (دو حصے):(Islam and Modern Man (Part: I-II)

35۔ احیائے اسلام اور استعمار کی غلامی سے ہماری آزادی : (The Resurgence of Islam and our Liberation from the Colonial Yoke)

26۔والدین کو دعوتِ اسلام:(Invitation to Islam, An open letter to My Parents)

27۔ امریکہ میں بچپن اور عنفوان شباب کی یادیں:(Memoirs of Childhood and Youth in America (1934-1962)

اٹھائیس سالہ ابتدائی زندگی کی سوانح

28۔پاکستان نیا وطن:

(At Home in Pakistan (1962-1989) The Tale of an American Expatnate in her adopted Country)

29۔والدین کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ:

یہ محض خطوط نہیں بلکہ پاکستان کی ثقافت اور اپنے ذاتی احوال کا خوبصورت مرقع ہے۔

30- Two Mujhahideen of the Recent Past and their Struggle for Freedom Against Foreign Rule.

31- Westernization Versus Muslims

32- Westernization and Human Welfare

33- Modern Technology and the Dehumanization of Man

34۔مراسلت:مولانا مودودی اور مریم جمیلہ

Marfat.com

ایک روشن ستارہ!

میں مریم جمیلہ کی وفات پر ان کے گھر گیا تو خان صاحب کو غمزدہ حالت مگر پورے صبرو استقامت میں پایا۔ دیگر باتوں کے علاوہ فرمانے لگے کہ نماز جنازہ میں اعلان کر دینا کہ مریم نے ایک مثالی بیوی کی طرح مکمل اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ میرا ہی نہیں سارے خاندان کے کسی فرد کا کبھی ذرّہ بھر دل نہ دکھایا۔ اسے اپنی موت کا وقت قریب لگ رہا تھا۔ پہلے تو کہا کہ میری قبر جماعتی اکابرین کی قبور کے ساتھ بنانا۔ پھر کہنے لگی کہ نہیں، میری قبر شفیقہ خانم مرحومہ (یوسف خاں کی پہلی بیوی) کے پہلو میں بنانا۔ دنیا میں بھی ہم اکٹھی تھیں، آخرت میں بھی ان شاء اللہ ایک ساتھ محبت سے رہیں گی۔

مریم جمیلہ کی موت محض ایک فرد کی موت نہیں، تاریخ کا ایک زریں باب اختتام پذیر ہو گیا ہے۔ وہ علم و ادب اور عرفان و حکمت کی چلتی پھرتی تصویر تھیں۔ وہ ایک شمع تھیں جس نے اپنے قلم کے نور سے تاریک ماحول کو منور کیا۔ وہ ایک صوتِ حق تھیں جس نے باطل کے بت اپنے قلم سے پاش پاش کیے، وہ صحابہ کی طرح اسلام کی آغوش میں آئی تھیں۔ ان جیسی شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ وہ امت کا بیش بہا سرمایہ تھیں۔ وہ روشن ستارا تھیں جو مغربی افق پر نمودار ہوا اور مشرقی افق پر سال ہا سال روشنی بکھیر کر ۳۱ راکتوبر ۲۰۱۲ء کو غروب ہو گیا۔ حق تعالیٰ مرحومہ کی حسنات کو شرفِ قبولیت بخشے، ان کے انسانی تسامحات سے صرفِ نظر فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات سے نوازے۔

Marfat.com

یوسف خان اور مریم جمیلہ کا گھرانہ

(۲)

قافلے کی شناخت

سید مودودیؒ کا قافلۂ سخت جاں دور جدید میں اللہ کی عظیم رحمت ہے۔ ہر قافلے کی اپنی پہچان ہوتی ہے، اپنی حدی خوانی اور اپنی بانگِ درا پر لوگ اتراتے ہیں۔ ہمارا قافلہ نیا نہیں، قدیم ہے۔ اس کی اپنی شناخت ہے اور اپنی منزل۔ اس قافلے کی پہچان ہے، اللہ کی خاطر محبت اور اسی کی خاطر نفرت! الحمدللہ یہ درماندہ راہ رو بھی، آخری صفوں میں سہی، بہرحال اس قافلے کا حصہ ہے۔ سید مودودیؒ کے دور کی یادگار شخصیات اب دنیا میں خال خال رہ گئی ہیں۔ چند سال قبل راقم کو بہت زیادہ دورے اور سفر درپیش رہتے تھے۔ اس زمانے میں جہاں کہیں سید کا کوئی پرانا ساتھی ہوتا، اس کی خدمت میں حاضری دے کر دعائیں لینے اور اپنے ایمان کو تازہ کرنے کی سعی ضرور کی جاتی۔ اب سفر بہت کم ہوتا ہے، پھر بھی کہیں جانا آنا ہو جائے تو ان قیمتی ہیروں کی زیارت کی کوشش کرتا ہوں۔

مجاہد کی خدمت میں درویش کی حاضری

لاہور کے بزرگ ارکانِ جماعت میں ملک محمد اسلم صاحب اور جناب محمد یوسف خان صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ دونوں ملاقات کے لیے یاد کرتے رہتے ہیں۔ جب کچھ دن بیت جائیں تو یوسف خان صاحب کے بچے ان کی طرف سے فون پر ان کے گھر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ درویش اس دعوت کو اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔ پچھلے دنوں اس عظیم مجاہد کی بیٹی نے ان کی طرف سے فون کر کے دعوت دی۔ میں نے جناب حفیظ احمد صاحب (امیر جماعت اسلامی حلقہ این اے ۱۲۶ لاہور) کے ساتھ حاضری کا پروگرام بنایا۔ ۲۸ رفروری (۲۰۱۲ء) بروز منگل عصر

Marfat.com

کے بعد کا وقت طے ہوا۔ ہم نے سوچا کہ عصر کی نماز خان صاحب کے ساتھ ان کے گھر میں باجماعت ادا کریں گے۔ خان صاحب ان دنوں نماز کے لیے بھی مسجد نہیں جا پاتے۔ وہاں پہنچے تو دونوں میاں بیوی نماز پڑھ چکے تھے اور ہمارے انتظار میں تھے۔ خان صاحب کے بیٹے حسین فاروق نے ملحقہ کمرے میں صف بچھا دی اور ہمارے ساتھ باجماعت نماز میں شریک ہو گئے۔ ہمارے ڈرائیور بھی نماز میں شریک تھے۔

''عزیمت کے راہی''

میں خان صاحب کی خدمت میں جاتے ہوئے اپنی تازہ ترین تصنیف عزیمت کے راہی (حصہ سوم) ساتھ لے گیا تھا جو خان صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ جب ہم نماز کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے تو خان صاحب کتاب کے اوراق پلٹنے لگے۔ ماشاء اللہ نظر ٹھیک ہے۔ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے نقل و حرکت میں دقت ہے۔ جب واپس آئے تو خان صاحب ملی جلی اردو انگریزی میں مریم جمیلہ صاحبہ کو سمجھا رہے تھے کہ پہلا مضمون اخوان کے بانی حسن البنا شہید کے متعلق ہے اور حسن البناؒ کا جنازہ ان کی شہادت کے بعد، ان کے گھر کی خواتین کو اٹھانا پڑا تھا۔ خان صاحب آبدیدہ تھے اور مریم جمیلہ پر بھی رقت طاری تھی۔ مریم جمیلہ خود امام حسن البنا شہید کے متعلق نہ صرف بہت کچھ جانتی ہیں بلکہ بہت کچھ لکھ بھی چکی ہیں۔ جناب محمد یوسف خان اور مریم جمیلہ کا گھر ایک مثالی اسلامی گھرانہ ہے۔ مریم جمیلہ جو نیویارک کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں، اللہ کی خاص توفیق سے نہ صرف اسلام سے روشناس ہوئیں بلکہ قبولِ اسلام کے بعد اسلام کی نمائندگی اور انگریزی زبان میں قلمی جہاد کا حق ادا کرنے میں سرخرو ہوئیں۔ ان کی کتابیں بہت معلوماتی اور عمل پر ابھارنے والی ہیں۔ حسن البنا شہیدؒ، سید مودودیؒ، علامہ اقبالؒ اور سید قطب شہیدؒ کی تحریروں کی طرح مریم جمیلہ کی تحریروں میں بھی مغربی مرعوبیت کی مکمل نفی اور اسلام پر فخر کرنے کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔

Marfat.com

سوتن نہیں سہیلی

یوسف خان صاحب ہر پیمانے سے ایک عظیم مردِ مومن ہیں۔ خان صاحب موصوف سے جب مریم جمیلہ کی شادی ہوئی تو اس سے پہلے وہ شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھے۔ ان کی دونوں بیگمات نے بلاشبہ ایک دوسری کا حد درجہ احترام کیا۔ سوتن کا رشتہ حسد و نفرت کا موجب ہوتا ہے مگر اس گھر میں ایسے کوئی جذبات دیکھنے میں کبھی نہیں آئے تھے۔ دونوں سعادت مند خواتین ایک دوسری سے بہنوں کی طرح محبت کرتی تھیں۔ وہ سوتن نہیں سہیلیاں بن گئی تھیں۔ یوسف صاحب کی پہلی اہلیہ کئی سال قبل وفات پا گئی تھیں۔ مریم جمیلہ کے بچوں کو بھی انھوں نے اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا۔ سب بچے بڑی بیگم کو امی جی اور مریم جمیلہ کو آپا کہہ کر پکارتے تھے۔ یوسف خان صاحب کا دورِ جوانی بہت عظیم تھا۔ ماشاء اللہ اب بھی ان کی یادداشت بالکل ٹھیک ہے۔ سب احباب کے احوال نام لے کر پوچھتے ہیں۔ ثقلِ سماعت کی وجہ سے ان تک بات پہنچانا مشکل ہو جاتا ہے مگر قریب بیٹھ کر بات کریں تو پوری طرح سمجھ جاتے ہیں۔ ان کی آواز فطری طور پر بھی بہت اونچی تھی، اب اور بھی اونچا بولتے ہیں۔ عزیمت کے راہی کے صفحات پلٹ رہے تھے۔ میاں طفیل محمدؒ کا تذکرہ ایک نظر دیکھا تو اس بہادر پٹھان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

گولیوں کی بوچھاڑ اور جرأت مومنانہ

مولانا مودودیؒ اور میاں طفیل محمدؒ کے ساتھ خان صاحب کا اتنا والہانہ وعقیدت مندانہ تعلق تھا کہ جب بھی ان سے ملاقات ہو، ان دونوں شخصیتوں کے حوالے سے کئی واقعات سناتے اور آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ مولانا کے گھر پر کئی مرتبہ خان صاحب راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد بھی جب کبھی بیگم مودودی مرحومہ انھیں کوئی ذمہ داری یا پہرے داری سونپتیں تو وہ بڑی خوشی کے ساتھ، بلاتردد اپنی خدمات پیش کر دیتے۔ ۱۹۶۳ء میں جماعت اسلامی کے کل پاکستان اجتماعِ عام منعقدہ بیرون بھاٹی گیٹ میں جب سرکاری غنڈوں نے گولیاں چلائیں تو جن رضا کاروں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ان کے قائد یوسف خان صاحب ہی تھے۔ میں نے خود

Marfat.com

اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ انھوں نے مسلح غنڈوں کو پکڑ کر باندھ لیا۔ یہ غنڈے پولیس کی حفاظت وسر براہی میں سب کچھ کر رہے تھے۔ انھیں پولیس کے حوالے کیا گیا تو پولیس نے تھپکیاں دے کر انھیں چھوڑ دیا۔ میں نے ایک مرتبہ یوسف خان صاحب سے پوچھا کہ خان صاحب آپ کا پستول تو آپ کی کمر سے ہی لٹکا ہوا تھا اور آپ نے غنڈوں کو پکڑ لیا، کیا آپ کو ڈر نہ لگا۔ قہقہہ لگا کر فرمانے لگے گوالمنڈی اور بھاٹی گیٹ کے ان تمام غنڈوں کو میں نام بہ نام کئی سالوں سے جانتا تھا اور وہ بھی مجھے بخوبی پہچانتے تھے۔ میں ان بھڑووں سے کہاں ڈرتا تھا۔ مجھے ان کی قوت کا پورا اندازہ تھا اور وہ بھی میری قوت سے بے خبر نہیں تھے۔

قابل فخر جوڑا

اجتماع عام ۱۹۶۳ء اور گولی چلنے، اللہ بخش کے شہید ہونے اور خان صاحب کے غنڈوں کو قابو کرنے کے ان واقعات کو محترمہ مریم جمیلہ نے اپنی کتاب "At Home in Pakistan" میں بہت تفصیل کے ساتھ انتہائی خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ دراصل ان کی یہ کتاب اپنے والدین کے نام لکھے گئے خطوط کا ریکارڈ ہے۔ انھوں نے اپنے بہادر خاوند کے علاوہ صوبہ سرحد کے دیگر جماعتی ساتھیوں (پٹھانوں) کی جرأت و بہادری کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ اپنے والدین کو بتاتی ہیں کہ ان کا جیون ساتھی ایک نیک، صالح اور پرہیز گار مذہبی انسان بھی ہے اور اس کے ساتھ ایک شیر دل، بہادر اور جرأت مند مومن و مجاہد بھی ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ کو خان صاحب پر فخر ہے اور محترم محمد یوسف خاں صاحب کو اپنی اس عظیم مومنہ اہلیہ پر فخر ہے۔ دونوں ہی عظیم ہیں۔ (بحوالہ مکتوب مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء)

بزرگان کی نشانیاں

مجھے یاد ہے کہ دور طالب علمی میں میری گرفتاریاں جب بھی ہوتیں تو طلبہ برادری کے علاوہ جو بزرگان میرے لیے بھاگ دوڑ کرتے، فوجی اور سول عدالتوں میں حاضریاں دیتے، تھانے کی حوالات سے لے کر جیل اور عدالت تک میں خبر گیری کے لیے آتے، ان میں چودھری غلام

Marfat.com

جیلانی مرحوم، حاجی محمد سلیم مرحوم (رام گلی والے)، محمد یوسف خان صاحب، رانا اللہ داد خان مرحوم، ملک محمد اسلم صاحب اور عبدالحمید کھوکھر مرحوم خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ باقی سب بزرگان تو اللہ کو پیارے ہو گئے، خان صاحب اور ملک صاحب اس دور کی یادگار ہیں۔ خان صاحب صرف جماعت کے باہر کی مخالفانہ قوتوں ہی کے مقابلے پر آہنی دیوار نہیں بن جایا کرتے تھے بلکہ جماعت کے اندر بھی جب کوئی فتنہ اٹھا تو خان صاحب پوری جرأت کے ساتھ اس کے سامنے ڈٹ گئے۔ اگلے وقتوں کے یہ لوگ بہت قیمتی ہیں۔ اللہ خان صاحب کو سلامت رکھے۔
اس مرتبہ مریم جمیلہ صاحبہ بہت کمزور نظر آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ پچھلے دنوں رات کو بالائی منزل سے نیچے اترنے لگیں تو اچانک بجلی غائب ہو گئی۔ بجلی کا غائب ہونا بھی اب یہاں کوئی خبر نہیں بلکہ بجلی کا آنا خبر بن کر رہ گیا ہے، بے چاری پاؤں پھسلنے سے گریں اور سر میں شدید چوٹیں آئیں، ہسپتال لے جانا پڑا اور کئی ٹانکے لگے۔ اب زخم ٹھیک تھے۔

قرونِ اولیٰ کی یادگار

مریم جمیلہ کی ساری دلچسپیاں لکھنے پڑھنے ہی سے ہیں۔ یہ ان کے لیے غذا اور دوا سے بھی زیادہ ضروری اور اہم کام ہے۔ اس مرتبہ بار بار ایک شکایت کرتی رہیں کہ مسلم ورلڈ ریویو (Muslim World Review) نہیں مل رہا۔ برطانیہ میں ڈاکٹر مناظر احسن کو اور اسلام آباد میں پروفیسر خورشید احمد صاحب کو خط لکھے ہیں مگر جواب نہیں آیا۔ میں نے یقین دہانی کرائی کہ یہ دونوں حضرات خطوط کے جواب باقاعدگی سے دیتے ہیں، ممکن ہے کہ آپ کا خط انھیں نہ ملا ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میں خورشید صاحب سے تو آج ہی رابطہ کر کے معلوم کروں گا۔ رابطے پر خورشید بھائی نے بتایا کہ ان کو خط نہیں ملا۔ بہرحال بعد میں محترمہ کو تمام پرچے مل گئے اور وہ بہت خوش ہوئیں۔ مجھے بھی اطلاع بھجوائی اور شکریہ بھی ادا کیا۔ خان صاحب کی مجلس میں کئی امور کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ماضی کے واقعات کے ساتھ خان صاحب مستقبل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ بصیرت مومنانہ ان کی گفتگو اور تجزیے کو بہت وزنی اور مدلل بنا دیتی ہے۔ بھرپوری زندگی مولانا مودودیؒ کے ساتھ

Marfat.com

رہنا اور میاں طفیل محمدؒ کی رفاقت سے استفادہ کرنا ان کی ایسی صفات ہیں کہ وہ سونے پر سہاگہ ہیں۔ کئی لوگ امریکہ اور یورپ جانے اور وہیں سکونت پذیر ہو جانے کے لیے پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ اللہ کی یہ بندی مریم جمیلہ جب ایک بار اس ملک کو خیر باد کہہ کر اسلام کی طرف چل پڑیں تو پھر کبھی دل میں خیال بھی نہ آنے دیا کہ دوبارہ وہاں جانا ہے۔ ان کے بچوں میں سے کئی امریکہ میں مقیم ہیں اور ان کو دعوت دیتے رہتے ہیں مگر وہ افغان پارک سے ملحق سُنّت نگر کے اسی پرانے گھر میں خوش ہیں۔ یہ لوگ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تصویر ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔

ماں کی بے مثال محبت

تمام قارئین کے لیے یہ امر باعث حیرت ہوگا کہ مریم جمیلہ سے جب بھی پوچھا جاتا ہے کہ بچوں میں سے سب سے زیادہ پیار کس سے ہے تو فرماتی ہیں "حسین فاروق سے۔" واضح رہے کہ حسین خاں صاحب کی پہلی بیوی شفیقہ خانم کا بیٹا ہے۔ وہ خان صاحب کے ساتھ رہائش پذیر ہے اور ماں باپ کی خدمت کا حق ادا کرتا ہے۔ اس کی بیوی بھی انتہائی زیادہ خدمت گزار اور اطاعت شعار ہے۔ چونکہ حقِ خدمت حسین ادا کرتا ہے، اس لیے محبت اور دعاؤں کا بھی وہ سب سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ اپنی بیٹی ماریہ خانم اور اس کے بچوں سے بھی بہت پیار ہے۔ یہ بھی لاہور میں اور قریب رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے والدین کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی دعائیں لیتے رہتے ہیں۔ باقی دونوں بیویوں کے تمام بچوں سے بھی ماں باپ کو بہت محبت وانس ہے۔

Marfat.com

محترمہ مریم جمیلہ، علم و عمل کی بہترین مثال

(۳)

اسلام اور ہجرت

محترمہ مریم جمیلہ کا نام تو دورِ طالب علمی میں سنا تھا۔ پھر مولانا مودودیؒ کے ساتھ ان کی مراسلت نظر سے گزری تو خوشگوار حیرت ہوئی کہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان کی چشم و چراغ نوجوان، اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون، تلاشِ حق کے لیے سرگرداں ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ مریم جمیلہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئی ہیں اور یہیں مقیم ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اسی دوران وہ اسلام قبول کر چکی تھیں۔ یہ گذشتہ صدی کے ساتویں عشرے (۶۰ کی دہائی) کی بات ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ مریم جمیلہ کی شادی ہمارے محبوب راہ نما اور بزرگ و مشفق دوست جناب محمد یوسف خان صاحب کے ساتھ ہو گئی ہے۔ اس سے اور بھی خوشی ہوئی۔ قرآن مجید میں ایمان، ہجرت، جہاد اور راہ خدا میں اذیتوں کا تذکرہ اکثر ایک ساتھ ملتا ہے۔ اس خاتونِ اسلام کو دیکھ کر مجھے وہ تمام آیات قرآنی یاد آ جاتی ہیں۔ کیا خوش نصیب انسان ہے!

علمی کارنامے

مریم جمیلہ صاحبہ اس عرصے میں مسلسل علمی کام کر رہی تھیں۔ ان کا مطالعہ انتہائی عمیق و وسیع تھا۔ مغرب و مشرق تمام تہذیبوں پر ان کی نظر تھی۔ ان کی کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہونے لگیں تو پہلی بار ان کے اصل علمی مقام و مرتبے کا اندازہ ہوا۔ یہ ستر کی دہائی کی بات ہے کہ میں نے ان کی تمام کتابیں پڑھ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان سے اپنی تحریری و تقریری سرگرمیوں میں بہت استفادہ کیا۔ یہ دور میں نے افریقہ میں گزارا اور اس عرصے میں دنیا کے مختلف ممالک میں

Marfat.com

جانے اور علمی کانفرنسوں، مذاکروں اور مباحثوں میں شرکت کے مواقع ملے۔ مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کے بعد انھی کتب سے زیادہ تر استفادہ کر کے بیشتر مذاکروں میں کچھ مفید شرکت ممکن ہو سکی۔

دفاعِ دین

تاریخ اسلام کے آغاز سے غیر مسلم آبادیوں میں اسلام کے متعلق تجسّس اور معلومات حاصل کرنے کی تحریک موجود رہی ہے۔ وسائل کی ترقی کے ساتھ اس تجسّس اور فکری سیاحت کا دائرہ بھی پھیلتا چلا گیا۔ اس کی وجہ سے کئی اعلیٰ پائے کی شخصیات حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان نومسلموں میں جنھوں نے گذشتہ صدی میں اسلام قبول کیا، محترمہ مریم جمیلہ اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہیں کہ انھوں نے قبول اسلام کے بعد اپنی زندگی مثالی انداز میں دین اسلام کی دعوت و تبلیغ میں بسر کی۔ انھوں نے اپنی تصنیفات میں اسلام کے بارے میں مستشرقین اور مغربی فکر و نظر سے مرعوب مسلمان دانشوروں کے مغالطوں اور اسلام کے بارے میں غلط تعبیرات کی تصحیح کو اپنی علمی تحقیق کا مرکز بنایا۔ وہ صحیح معنوں میں دفاعِ اسلام کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ میں انھیں غازیِ ایمان (Defender of Faith) کہتا ہوں۔

مغربی تہذیب کا تجزیہ

مریم جمیلہ نے مغربی علوم عمرانیات کی لادینی بنیادوں، مغربی تہذیب و ثقافت کی تخریب کاری اور مغربی سیکولر افکار و نظریات کی ناپائیداری کو نہایت ٹھوس علمی و عملی شواہد اور محکم استدلال کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مغربی تہذیب و ثقافت جن عقائد و نظریات پر مبنی ہے، محترمہ نے اس کا ابطال بھی مغربی احوال و ظروف اور تاریخی حقائق سے کیا ہے۔ مغربی معاشرے میں آنکھ کھولنے کی بدولت انھیں مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور مغربی لادینی نظریات کے مظاہر کا براہ راست مشاہدہ کیا، اس بنا پر ان کی مغرب پر زوردار تنقید، اپنے اندر ایسے حقائق رکھتی ہے جنھیں آسانی سے ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب کے فلسفیوں، نظام حیات کے مادہ پرستانہ نظریات کے علم برداروں اور مختلف ازموں اور لادینی فکری تحریکوں کے بانیوں کی علمی بنیادوں کو منہدم کرنے میں

Marfat.com

محترمہ مریم جمیلہ نے نہایت قابل قدر تنقیدی لٹریچر فراہم کیا ہے۔ انھوں نے استعماری طاقتوں کی انسانیت کش یلغاروں، تہذیبی استیلا کی کاوشوں، عسکری خوں ریزیوں اور معاشی استحصال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مغربی نظام حیات اور حکمرانی کے ضابطے بنی نوع انسان کو امن و سکون نہیں دے سکتے۔

اسلام کی ترجمانی

محترمہ مریم جمیلہ نے خوب جانچ پرکھ کر اسلام قبول کیا ہے۔ انھیں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کے بعد یقین حاصل ہو گیا کہ دین اسلام ہی سچا دین ہے اور یہی انسانوں کی دینی واخروی نجات کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس یقین کے بعد انھوں نے دنیا میں مروجہ نظام حیات کے مظاہر پر نظر ڈالی تو انھیں معلوم ہوا کہ جس طرح مغرب اپنی اصل راہ سے ہٹ گیا ہے، اسی طرح اسلامی ممالک بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے فراہم کردہ صراط مستقیم سے منحرف ہو کر دنیا کے باطل نظاموں کے زنغے میں گرفتار ہیں۔ انھوں نے نہایت جچے تلے علمی انداز میں مسلمانوں کے حال اور ماضی قریب کے مفکرین کی قائدانہ لغزشوں کا محاکمہ کیا۔ اس سلسلے میں سرسید وطہٰ حسین سے لے کر عہد حاضر کے متجددین تک کی فکری اور عملی ناہمواریوں پر گرفت کی اور مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ یہ طبقہ مغرب کے علمی وسیاسی تسلط سے اس حد تک مرعوب ہے کہ دین اسلام کے بنیادی عقائد سے انحراف میں بھی انھیں کوئی باک نہیں۔ اسی طرح شام، مصر، ترکی، عراق اور مسلم ممالک کے دیگر مغرب زدہ مسلم مفکرین پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسلام کی غلط تعبیروں پر مشتمل ان کے نظریات وافکار کو مسترد کر دیا۔ اس حوالے سے ان کی کتاب (Islam in Theory & Practice) بہت وقیع علمی دستاویز ہے۔ مسلمان ممالک میں مغربی تہذیب وثقافت کی ترویج کو ہدف تنقید بناتے ہوئے مصنفہ نے مسلم امہ کو اصل اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ہے۔

Marfat.com

محاکمہ و محاسبۂ مغرب

مریم جمیلہ نے اپنی دوسری کتاب (Islam & the West) میں بھی مغرب کا جرأت مندانہ اور مدلّل محاکمہ و محاسبہ کیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مغرب کا تہذیبی استیلا وقتی اور عارضی ہے، اس لیے امتِ مسلمہ کے لیے اس کا مقابلہ ممکن ہے بشرطیکہ انفرادی و اجتماعی، ہر سطح پر اسلام کی پایدار تہذیب اور ابدی حقائق کو لائحہ عمل بنایا جائے۔ مغربی تہذیب کا حقیقی چہرہ انھوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب (Western Civilization Condemned by itself) میں خوب بے نقاب کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے قاری ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'' کی ضرب المثل کا مفہوم بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اسلامی تہذیب مسلمانوں کے اسلام پر عمل پیرا ہونے سے متشکل ہوگی۔ لہٰذا امت مسلمہ کو شریعت اسلامیہ کے مطابق اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات کو روبہ عمل لانا ہوگا ورنہ ادبار کی موجودہ صورتِ حال سے چھٹکارا ممکن نہ ہوگا۔

پابندِ اسلام

مسلم ممالک میں جن اہل علم نے اسلامی شریعت کے قیام اور مغربی استبداد کے مقابلے کے لیے جدوجہد کی، محترمہ مریم جمیلہ نے ان کی کاوشوں کو نظرِ تحسین سے دیکھا ہے اور ان کی تحریک، فکر اور لائحہ عمل کو قابل قدر ورثہ قرار دیا ہے۔ محترمہ نے معاصر علمی شخصیتوں کے لٹریچر کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ان کی مراسلت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں سید مودودی سے مکالمہ اور مراسلت کے بعد اور ان کے لٹریچر کے مطالعے سے، اپنے افکار و خیالات میں یکسوئی حاصل کرنے میں مقابلتاً زیادہ مدد ملی ہے۔ ان کے نزدیک شریعت اسلامیہ کی تعلیمات اتنی معقول اور مبرہن ہیں کہ کوئی دانش مند آدمی شاذ ہی ان سے آنکھیں بند کر سکتا ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ اپنی جوانی میں پردے کی اس قدر پابند تھیں کہ قبولِ اسلام کے بعد کسی غیر محرم نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ محض سکارف یا عمومی نقاب نہیں بلکہ مکمل برقع پہنا کرتی تھیں۔ برقع میں ملبوس ان کی محجوب تصویر بھی ان کی کتب کے اندرونی ٹائٹل پر چھپا کرتی تھی۔ اس دور میں محترم محمد یوسف خان

Marfat.com

صاحب کے ہاں جانے کا موقع ملتا تو ''آپا'' سے یوسف صاحب کے ہمراہ پردے میں ملاقات اور تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا۔ اب جبکہ مریم جمیلہ قرآن کی اصطلاح ''القواعد'' (سورہ النور) کے مطابق بڑھاپے میں داخل ہو چکی ہیں تو پہلے والا پردہ نہیں کرتیں۔ اس وقت عمر ۷۶ سال کے لگ بھگ ہے۔ اب ہمارا خان صاحب کے گھر آنا جانا ہو تو خان صاحب اور آپا ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں اور ہم ان کے سامنے بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔

امی اور آپا

مریم جمیلہ اردو اور پنجابی کے چند جملے ہی بولتی اور سمجھتی ہیں۔ اس طرح خان صاحب بھی انگریزی میں محدود اظہارِ خیال کر سکتے ہیں مگر دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے بات چیت کرنے اور مفہوم سمجھنے سمجھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ یوسف خان صاحب کی فیملی کی خواتین، ان کے بچے بلکہ خود مریم جمیلہ کے بچے بھی انھیں ''آپا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ سو ہم بھی انھیں آپا ہی کہا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یوسف خان صاحب کی پہلی اہلیہ مرحومہ نے اپنے بچوں کے علاوہ مریم جمیلہ کے بچوں کو بھی خود پالا پوسا اور یہ مثال شاید دنیا میں انوکھی اور واحد مثال ہی ہوگی کہ خان صاحب کے پہلے اور پچھلے تمام بچے خان صاحب کی پہلی بیوی کو ''امی'' اور مریم جمیلہ کو ''آپا'' کہا کرتے تھے۔ آپا ایک عظیم کردار ہے۔ ان کی علمی کاوشوں پر ملت اسلامیہ انھیں مبارک باد پیش کرتی ہے کہ انھوں نے اسلام قبول کر کے دین اسلام کی دعوت و تبلیغ میں اپنی زندگی وقف رکھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید ہمت و توفیق دے اور صحت و عافیت عطا کرے تاکہ وہ اسلام کی دعوت و سربلندی کے لیے مزید عملی کام کر سکیں۔ (آمین)

Marfat.com

مولانا محمد وزیر خان

(۱۹۲۴ء-۲۰۱۲ء)

جنازے سے محرومی

۱۰ رنومبر ۲۰۱۲ء کو محترم امیر جماعت نے مرکز جماعت میں ایک مشاورت طلب کی تھی اور فرمایا تھا کہ اُس میں ضرور شرکت کی جائے۔ اُسی روز امیر جماعت اسلامی ضلع سرگودھا برادرم زبیر گوندل صاحب کا فون آیا کہ حضرت مولانا محمد وزیر خان صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، اور ان کا جنازہ بعد نمازِ عصر سرگودھا میں ہے۔ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ مرحوم نے وصیت فرمائی تھی کہ آپ ان کا جنازہ پڑھائیں۔ میں نے زبیر بھائی کے سامنے صورتِ حال رکھی اور بتایا کہ میں اس وقت مشاورت میں ہوں اور معلوم نہیں ہم کس وقت فارغ ہوں گے۔ ہم لوگ عملاً اڑھائی بجے مشاورت سے فارغ ہوئے۔ مولانا محمد وزیر خان صاحب کے جنازے میں شرکت نہ ہو سکی جس کا خاصا افسوس ہوا، بعد میں مولانا کے اہل و عیال سے تعزیت کے لیے ان کے یہاں حاضر ہوا تو مولانا کی یادوں کا دریچہ کھلا اور ایک وسیع و عریض، دلربا باغیچہ آنکھوں کے سامنے رونق افروز ہو گیا۔ مولانا نے 86 سال عمر پائی مگر اللہ کے فضل سے بینائی درست تھی اور دانت بالکل اصلی۔ مولانا کو چنے اور مکھانے چبانے کا شوق تھا جو آخر دم تک قائم رہا۔

وادیٔ چھچھ کا موتی

مولانا کی پیدائش وادیٔ چھچھ میں حضرو کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں نرتوپہ میں ہوئی۔ وادی چھچھ میں چوراسی دیہات ہیں جن میں سے نرتوپہ سب سے بڑا گاؤں ہے۔ یہ علاقہ بڑا مردم خیز ہے جہاں سے علم دین کی خدمت کرنے والی بہت سی شخصیات میدانِ عمل میں

Marfat.com

آئیں اور اہلِ ایمان کی تعلیم و تربیت کے کارنامے سرانجام دیے۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان کا گاؤں کالو بھی مولانا محمد وزیر خاں کے گاؤں سے قریب واقع ہے۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالحمید عرف باباجی وادیٔ چھچھ کی نامور علمی شخصیت تھے۔ اسی طرح جماعت اسلامی کے سابق امیر ضلع اٹک اور رکن مرکزی مجلس شوریٰ حاجی مجدد خان صاحب اور مشہور مصنف و مبلغ مولانا محمد یوسف اصلاحی صاحب کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔

خاندانی پس منظر

مولانا کی وفات پر جب میں ان کے گھر تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو ان کے بچوں نے اپنا خاندانی پس منظر ان الفاظ میں بیان کیا: ''افغانستان میں صوبہ وردگ سے جو لوگ سلطان محمود غزنوی کے سپہ سالار قطب شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے ان میں سے بیشتر اعوان قبیلے کے افراد تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد انھی لشکروں کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے ہندوستان (موجودہ پاکستان) کے مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہوئے۔ چونکہ یہ لوگ پہاڑوں میں بسا کرتے تھے اس لیے یہاں بھی انھوں نے پہاڑی علاقوں کو اپنا مسکن بنایا۔ ہمارے آباؤ اجداد علاقہ چھچھ میں پہاڑوں کے درمیان کی وادی میں آباد ہو گئے جبکہ کچھ دیگر لوگ وادی سون سکیسر میں رہائش پذیر ہیں، ہم بنیادی طور پر قطب شاہی اعوان ہیں۔ ہماری مادری زبان بھی ہندکو ہے۔ گو برادری کے اکثر لوگ پشتو میں بھی بات کرتے ہیں۔ برصغیر میں آمد سے پہلے افغانستان ہی ہمارا مسکن تھا اس لیے ہم پٹھان اور خان مشہور ہو گئے۔

تعلیم و تدریس

اباجی کے ابتدائی اساتذہ میں علاقہ چھچھ کی معروف روحانی شخصیت شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحمید عرف باباجی کا بڑا کردار تھا۔ انھوں نے اباجی کے دل میں علومِ دینیہ کی اتنی محبت پیدا کی کہ پھر اباجی نے اپنی پوری جوانی حصول تعلیم کے لیے وقف کر دی۔ اباجی کے یہ استاد مرحوم بہت مہمان نواز تھے۔ اباجی بتاتے تھے کہ ان کی وفات پر سخت دھوپ میں پرندوں نے جنازے پر سایہ

Marfat.com

کیے رکھا۔ اباجی نے علاقے کے دیہات، کالو، غور غشتی اور شینکہ میں بھی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں کئی اساتذہ سے استفادہ کیا جن میں حضرت مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت اور مفتی محمد شفیع مرحوم سرگودھا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم جامع مسجد بلاک نمبر ایک میں کبھی کبھار ابا جی کو جمعہ پڑھانے کا بھی حکم دیا کرتے تھے۔ اباجی نے جوانی میں بھینسوں کا کاروبار بھی کیا مگر ان کی طبیعت کاروبار نہیں درس و تدریس کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ آپ کا یادرفتگان کا کالم از حد مقبول تحریر ہوتی ہے۔ اسے لوگ شوق سے پڑھتے ہیں پھر یہ کتابی صورت میں چھپ کر بھی تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے اس لیے اس تاریخی پس منظر سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ امید ہے آپ اباجی مرحوم پر مضمون لکھیں گے۔ وہ آپ کے ساتھ نہایت قریبی اور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔“

شوق علم اور سفر

مولانا محمد وزیر خان صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی پھر چھچھ کے اس موتی نے مزید تعلیم کے لیے برصغیر کے مختلف علاقوں کی خاک چھانی۔ یہاں تک کہ گجرات کاٹھیاواڑ تک بھی گئے۔ مولانا کی یادداشتوں اور ریکارڈ کے مطابق انھوں نے مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری (گجرات)، مفتی سید سیاح الدین کاکا خیل (فیصل آباد)، مولانا مفتی محمد شفیع (سرگودھا) اور مولانا محمد الیاس، بانی تبلیغی جماعت، کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا ضلع سرگودھا میں آئے اور مختلف دیہات میں لوگوں سے ملاقاتیں رہیں۔ اس زمانے میں ضلع خوشاب سرگودھا کی ایک تحصیل ہوا کرتا تھا۔ مولانا کے پیشِ نظر یہ تھا کہ کسی قصبے یا گاؤں میں بیٹھ جاؤں اور وہاں بچوں کو تعلیم دینے کے علاوہ بڑی عمر کے لوگوں کی بھی دینی تربیت کرسکوں۔ جوانی کا دور تھا اور صحت بہت اچھی تھی۔

جماعت سے تعارف

اسی دور میں ایک روز سرگودھا شہر میں آئے۔ مسلم مسجد بلاک نمبر ایک میں عصر کی نماز پڑھی، جماعت ہو چکی تھی، تنہا نماز پڑھ رہے تھے اور قریب ہی تین چار لوگ بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر

Marfat.com

رہے تھے۔ ایک شخص پڑھ رہا تھا اور باقی توجہ سے سن رہے تھے۔ پڑھنے والا رک رک کر اس انداز میں پڑھ رہا تھا کہ ایک ایک لفظ واضح اور صاف سنائی دے۔ نماز ہی کے دوران چند فقرے نوجوان پٹھان کے کانوں سے ٹکرائے تو دل کو بہت بھلے لگے۔ سلام پھیرنے کے بعد مطالعہ کرنے والوں کے قریب ہو کر پوچھا، اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟ اہل مجلس نے نہ صرف اثبات میں جواب دیا بلکہ انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ کتاب پڑھنے والے محبوب شاہ ہاشمی مرحوم (والدِ گرامی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی) تھے، اور کتاب مولانا مودودیؒ کی خطبات تھی۔ جتنی بھی عبارت سنی، مولانا وزیر خان کے بقول، انھیں یوں لگا جیسے یہ سب کچھ ان کے دل کی آواز ہے۔ ان کے دل و دماغ میں دین کا جو تصور تھا، صاحبِ تصنیف نے بالکل اسی کی عکاسی کی تھی۔ اس سے قبل بھی مولانا مودودی کا نام تو سن رکھا تھا اور مفتی سید سیاح الدین ان کا تذکرہ ادب و احترام سے کرتے تھے مگر کبھی مولانا مودودیؒ سے ان کی کتب کے ذریعے براہِ راست استفادے کا موقع نہ ملا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ یوں اچانک مجھے جاگ لگی اور تحریک اسلامی کا سفر شروع ہوا۔ بہت جلد جماعت کے رکن بن گئے۔ پھر مختلف ذمہ داریاں ان کے سپرد ہوئیں اور آخر میں چودھری محمد سلیم، امیر ضلع سرگودھا کے ساتھ بطور قیم ضلع کئی سالوں تک کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

شادی میں فحاشی؟

جماعتی ذمہ داریوں سے قبل مولانا نے سرگودھا شہر کے قریب چک نمبر ۷۴ میں بالکل عنفوانِ شباب میں بطور امام مسجد خدمتِ دین کا کام شروع کیا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سمیت یہاں رہتے تھے۔ گاؤں کے نمبردار چودھری غلام نبی تھے جنھوں نے مولانا وزیر خان صاحب کی بڑی عزت و توقیر کی اور کہا کہ تم مجھے میرے بیٹوں کی طرح عزیز ہو، میں نے تمھیں اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ اس گاؤں میں ایک دوسرے زمین دار میاں پیر محمد بھٹی بھی تھے جو انتہائی نیک دل اور پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ وہ بھی مولانا کی بہت عزت و قدر کرتے تھے۔ اس عرصے میں نمبردار غلام نبی کے بیٹے محمد

Marfat.com

صادق کی شادی کا مرحلہ آیا۔ شادی کی تقریب میں دور و نزدیک کے دیہات سے نمبردار صاحب کے رشتہ دار اور احباب بڑی تعداد میں شریکِ محفل تھے۔ اچانک گانے بجانے اور رقص کرنے والے مردوں اور عورتوں کا ایک طائفہ بمع اپنے آلات موسیقی نمودار ہوا اور ڈھول ڈھمکے کے ساتھ تقریب میں آ گیا۔ دولھا اور اس کے خاندان کی طرف سے ان کی خدمات باقاعدہ کرائے پہ حاصل کی گئی تھیں۔

مردِ حق کا کلمۂ حق

جب یہ سارا طوفانِ بدتمیزی شروع ہوا تو مولانا وزیر خان صاحب سے نہ رہا گیا۔ وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بلند آواز سے کہا: ''یہ شیطانی کھیل یہاں نہیں چل سکے گا۔'' نمبردار صاحب نے آ کر مولانا کو پیار بھرے لہجے میں سمجھایا کہ اب جو غلطی ہو چکی اس کی تلافی تو ممکن نہیں مگر دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے ہماری بہت بے توقیری ہوگی، اس لیے غصہ جانے دو۔ مولانا نے جواب میں کہا کہ نمبردار صاحب! آپ مجھے بیٹا بھی کہتے ہیں اور میرے پیچھے نماز بھی پڑھتے ہیں، میں اللہ کو کیا جواب دوں گا اگر یہ سب کچھ اس بستی میں ہوتا رہا جس میں میں امام ہوں۔

معرکۂ حق و باطل

بات طول کھینچ گئی اور کافی بحث و تکرار ہوئی مگر قصہ کوتاہ، معرکۂ حق و باطل بپا ہو گیا، فولادی مومن میدان میں اتر آیا۔ یوں مولانا سٹیج پر چڑھ گئے اور اپنی کمر سے گراری والا چاقو نکالا اور جب اُسے کھولا تو تمام فنکاروں کی چیخیں نکل گئیں اور وہ ادھر ادھر بھاگ گئے۔ مولانا نے تمام ڈھول پھاڑ دیے، اس کے نتیجے میں اچھا خاصا تصادم ہو گیا۔ مولانا کی حمایت میں چند افراد کھڑے ہوئے جن میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک بااثر زمین دار اور ایک بے چارا کمی۔ باقی سب لوگ لاٹھیاں، برچھیاں لے کر مولانا کو مارنے کے لیے دوڑے۔ حمایت کرنے والوں میں زمیندار میاں پیر محمد بھٹی پیش پیش تھا، اس نے کہا ''امام صاحب جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے اور یہ سارا جشن ہم سب کے لیے باعثِ عار ہے۔ میں مولوی وزیر خان کا بھائی ہوں اور اُس کے اس

Marfat.com

کلمۂ حق کی تائید کرتا ہوں، میں اس کی خاطر جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔'' دوسرا شخص، رحماں (عبدالرحمان) ماچھی تھا جو کلہاڑی چلانے کا بڑا ماہر تھا۔ اُس نے بھی اپنی کلہاڑی اٹھالی اور اعلان کر دیا کہ میں مولوی وزیر کے ساتھ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ یوں یہ شیطانی جشن تو ختم ہو گیا مگر مولانا وزیر صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس گاؤں میں مزید قیام نہیں کریں گے چنانچہ وہ چک نمبر ۲۸ میں چلے گئے اور وہاں امامت کا فریضہ ادا کرنے لگے۔

طبلہ و سارنگی پر نعتِ رسولؐ؟

کچھ عرصہ گزرا تو یہاں بھی ایسا ہی ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہو گیا۔ گاؤں میں سیرت النبیؐ کا جلسہ تھا جس کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ اس گاؤں میں شیعہ مسلک کے لوگ بھی آباد تھے اور ان میں کئی اچھے خاصے کھاتے پیتے زمین دار تھے۔ نمبردار بھی انھی میں سے تھا۔ جونہی جلسہ شروع ہوا، کچھ لوگ سرنگی اور طبلہ لے کر سٹیج پر آ گئے اور تقریب سے قبل ہی انھوں نے طبلہ سرنگی بجانا شروع کر دیا۔ مولانا نے کہا ''ارے یہ کیا خرافات تم نے شروع کر دی ہے؟'' اس پر گاؤں کا نمبردار بول اٹھا، ''مولوی! کچھ ہوش سے بات کرو، یہ خرافات نہیں بلکہ یہ تو نعت رسول پڑھ رہے ہیں۔'' مولانا نے کہا: ''یہ شیطانی آلات ہیں ان پر نعت نہیں پڑھی جا سکتی۔'' چنانچہ یہاں بھی تصادم ہوا۔

واپس چک ۷۴ میں

چک ۷۴ والے پیر محمد بھٹی کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو وہ ٹانگا لے کر آیا اور مولوی وزیر خان صاحب سے کہا ''مولوی صاحب آپ چک ۷۴ تشریف لائیں۔'' اُنھوں نے فرمایا ''بھٹی صاحب! میں تو پہلے ہی وہاں سے نکالا گیا ہوں۔'' بھٹی صاحب نے کہا ''نہیں اب وہ بات نہیں ہو گی۔'' چنانچہ اس نیک دل دوست کے ساتھ مولوی صاحب اپنے بیوی بچوں سمیت اپنا معمولی سا سامان لے کر چک نمبر ۲۸ سے ایک بار پھر چک نمبر ۷۴ میں آ گئے اور پھر یہی چک اس خاندان کی مستقل رہائش قرار پا گیا۔ یہیں مولانا نے وسیع پلاٹ خریدے اور سب بچوں کے مکان بنوائے۔ چک نمبر ۷۴ میں اس قیام کے دوران مولانا کے قریبی دوستانہ تعلقات جن شخصیات سے قائم ہوئے وہ

Marfat.com

جماعت کے بہت اہم لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ان میں حاجی جاوید اقبال چیمہ کے والد جناب چودھری محمد فاضل چیمہ مرحوم، میاں عبدالخالق مرحوم، چودھری شیر محمد ساہی مرحوم اور چودھری پیر محمد بھٹی مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔مولانا کے بیٹے بشیر خان کہتے ہیں کہ جب دوسرا واقعہ (چک ۲۸ میں) ہوا تو میں اس وقت کچی پکی جماعت میں تھا۔عمر یہی کوئی پانچ، چھے سال ہوگی، جب تصادم ہوا اور اباجی نے سرنگی طبلے سٹیج سے نیچے پھینکے اور لڑائی شروع ہوگئی، تو میں ڈر گیا۔میں نے کہا کہ اب پتہ نہیں کیا ہوگا مگر والد صاحب بالکل بے خوف تھے۔

حفظ قرآن کی سعادت

جب دوبارہ چک ۷۴ میں وارد ہوئے تو یہی مستقل مسکن قرار پایا۔اللہ کو یہی منظور تھا۔اب یہ چک شہر کے اندر آچکا ہے اور مولانا کے بچوں کے گھر اور کاروبار یہیں واقع ہیں۔مولانا نے آخری ایام بھی یہیں گزارے۔اس مرتبہ جب دوبارہ یہاں آئے تو ایک چودھری نے کسی سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ یہ ہمارا امام ہے جو پہلے بھی یہاں رہا تھا۔اس نے کہا کہ کیا یہ حافظ بھی ہے؟ جواب ملا ''نہیں''۔اس پر چودھری پکار اٹھا، ''اگر حافظ نہیں تو اس کی امامت پر کون راضی ہوگا؟'' مولانا کو پتہ چلا تو فرمایا، ''چودھری صاحب خاطر جمع رکھیں، میں قرآن مجید جلد ہی حفظ کرلوں گا۔'' مولانا کے بچوں کے بقول مولانا نے دو مہینے میں پورا قرآن حفظ کرلیا۔وہ ہر روز آدھا پارا حفظ کرتے تھے۔راقم الحروف کے نزدیک یہ ناممکن نہیں کیونکہ دین سے وابستگی رکھنے والے اہل علم لوگ حافظِ قرآن نہ بھی ہوں تو قرآن کی تلاوت ان کا شعار و معمول ہوتا ہے۔پھر بہت سی سورتیں اور قرآن کے مختلف حصے لازماً انھیں یاد بھی ہوتے ہیں اس لیے وہ پوری توجہ اور شوق سے اس عظیم مشن میں لگ جائیں تو اللہ کی مدد سے جلد پورا قرآن اپنے سینے میں محفوظ کرسکتے ہیں۔اسی طرح کا دلچسپ واقعہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (تبلیغی جماعت) نے اپنی کتاب ''سرگزشتِ ایام'' میں اپنے استاد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے بارے میں بھی نقل کیا ہے جنھوں نے رمضان کے ایک مہینے میں پورا قرآن پاک حفظ کیا تھا اور پھر اس کے بعد

Marfat.com

ہر سال ماہِ رمضان میں تراویح میں پورا قرآن سنایا کرتے تھے۔

ان تھک مجاہد

مولانا وزیر خان جب جماعت کی ذمہ داریوں پر آئے تو پھر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ وہ ایسے ان تھک مجاہد تھے کہ آج بھی لوگ انھیں یاد کرتے ہیں۔ سابق امیر ضلع سرگودھا ڈاکٹر مبشر احمد صدیقی مولانا کی وفات کے بعد مجھے بتا رہے تھے کہ ہم جس گاؤں میں بھی جائیں، لوگ مولانا مرحوم کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ اب تو آپ لوگوں کے پاس گاڑیاں اور کم از کم موٹر سائیکلیں ہیں پھر بھی تم بہت زمانے کے بعد آتے ہو۔ مولوی وزیر خان کے پاس سائیکل ہوا کرتی تھی اور وہ سال میں کئی مرتبہ دورہ کیا کرتے تھے۔ مولانا کے بیٹے بشیر خان اور طاہر خان نے بتایا کہ ہم نے ابا جی کو دیکھا کہ ان کی سائیکل اور اس کے پیچھے کی کاٹھی پر ایک بیگ ان کی زندگی کا مستقل ساتھی تھا۔ جب سفر سے آتے تو میلے کپڑے بیگ سے نکالتے اور دھلے ہوئے اس میں رکھ دیتے۔ ان میں ایک دھوتی اور شلوار قمیص کے دو جوڑے ہوا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کنگھی، شیشہ، سرمہ اور موچنا بھی ان کے مستقل شریکِ سفر تھے۔ سائیکل کے سامان میں بھی کچھ چیزیں ہوتی تھیں جن میں پمپ، رنچ اور ایک آدھ چھوٹا موٹا اوزار اور ہوتا تھا۔ اسی سامان میں ایک ہوائی چپل بھی ہوتی تھی۔

وسائل کا درست استعمال

مولانا کے ہم عصر جماعتی ذمہ داران دیگر اضلاع میں بھی کم و بیش اُس زمانے میں اسی انداز میں میدانِ عمل میں نکلا کرتے تھے۔ وہ ایک دور تھا جو بیت گیا۔ آج کے دور کے اپنے تقاضے ہیں اور اپنی ترجیحات، مگر یہ حقیقت ہے کہ کام کی تڑپ رکھنے والے آج بھی اسی جذبے اور شوق کے ساتھ میدان میں نکلتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اللہ نے اب سفر کے لیے سہولیات فراہم کر دی ہیں۔ ان سہولیات کو دعوت و تبلیغ حق کے کام میں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ ضروری ہیں۔ بعض احباب انتہائی سادہ لوحی سے ان وسائل کے استعمال کو بھی قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ یہ سوچ

Marfat.com

بالکل غلط ہے۔ وسائل کا استعمال اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے۔ ان کا غلط استعمال ہرگز جائز نہیں۔

پہلوان مولوی

مولانا نے اپنی زندگی میں دعوتی میدان میں کئی معرکے سرانجام دیے جو بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ مولانا ایک واقعہ سرگودھا کے گاؤں مانگنی کا بھی بیان کیا کرتے تھے۔ مرحوم وہاں تشریف لے گئے، رات قیام کیا، فجر کی نماز کے بعد مسجد میں درس دے رہے تھے کہ چھوٹے سے قد کا ایک تیز طرّار چودھری کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا ''او مولوی! یہ سلسلہ بند کر، میں مولوی مودودیؒ کا نام بھی نہیں سننا چاہتا۔'' مولانا نے تحمل کے ساتھ اسے تذکیر کی کہ بات سن لے، بعد میں سوال کرے۔ بعض سامعین نے بھی اسے سمجھایا مگر وہ آستینیں چڑھانے لگا۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس نے میرے لیے تو واحد کا صیغہ استعمال کیا مگر مجھے ہرگز کوئی تعجب اور افسوس نہ ہوا۔ جب اس نے مولانا مودودیؒ کی بار بار توہین کی تو میرے اندر کا مسلمان اور پٹھان جاگ اٹھا۔ میں نے اس سے کہا ''جانہ لیں او، جنے دیا پترا!'' (جنے دیا پترا مولانا کا تکیہ کلام بھی تھا، جب کسی سے خوش ہوتے تو تحسین کے انداز میں اس سے یوں مخاطب ہوتے اور جب کسی سے مقابلہ کرنے کے لیے پالا پڑ جاتا تو چیلنج کے انداز میں یہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔) مولانا کے اس فقرے کا مطلب ہے ''او جواں مرد کے بیٹے! اب بھاگ نہ جانا۔'' یہ الفاظ کہہ کر مولانا نے چودھری صاحب کی خوب مرمت کی۔ چودھری صاحب سوجے ہوئے منہ کے ساتھ مسجد سے بھاگ نکلے، آپ کو تعجب ہوگا کہ یہی چودھری صاحب بعد میں جماعت کے رکن بنے اور جماعت کے لیے اثاثہ ثابت ہوئے۔ ان کا نام چودھری محمد امیر ہے اور یہ مولانا محمد وزیر خان صاحب کے مداحوں میں سے ہیں۔

اعزاز

جماعت اسلامی کے کل پاکستان اجتماع عام ۱۹۶۳ء (بھاٹی گیٹ، لاہور) میں جب ایوبی

Marfat.com

حکومت نے لاؤڈ سپیکر پر پابندی لگا دی تو مولانا مودودیؒ نے بارہ نقیب یا مکبّر مقرر فرمائے۔ ان کو مولانا کی لکھی ہوئی تقریر لوگوں کو سنانا تھی۔ سٹیج پر مولانا خود تقریر فرما رہے تھے اور پھر برابر فاصلوں سے یہ بارہ نقیب وہی تقریر پڑھ کر سامعین تک آواز پہنچا رہے تھے۔ مولانا محمد وزیر خاں صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آپ بھی ان بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے۔ مولانا کی آواز میں بڑی گھن گرج تھی۔ وہ محض مولوی نہیں پہلوان، کبڈی باز، گتکا باز اور باکسر بھی تھے۔ یہ سارے فنون انھوں نے اپنی جوانی میں بڑی محنت اور ریاضت سے حاصل کیے تھے۔ مولانا وزیر خان صاحب تھوڑے سے عرصے کے لیے جمعیت اتحاد العلما پاکستان کے قائم مقام صدر بھی رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنی اس حیثیت میں مشرقی پاکستان کا دورہ بھی کیا تھا۔

قبرستان میں خطاب

ایک مرتبہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات عام میں مولانا وزیر خاں جماعت کے امیدوار مولانا گلزار احمد مظاہری صاحب کی انتخابی مہم کے لیے ایک گاؤں چک ۲۶ وڑانچا نوالہ گئے۔ اس چک میں اس زمانے میں جماعت کا حامی کوئی نہ تھا۔ مولانا اپنی سائیکل پر لاؤڈ سپیکر، بیٹری اور ہارن لے کر آئے تھے۔ گاؤں والوں نے انھیں مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا، کسی ڈیرے، چوپال اور چوک میں بھی تقریر کرنے کی اجازت نہ دی۔ مولانا نے قبرستان جا کر لاؤڈ سپیکر فٹ کیا اور تقریر شروع کر دی اور فرمایا میں ان مردوں کو سناؤں گا، یہ درخت اور قبریں روز قیامت میری گواہی دیں گی۔ میں کلمۂ حق سنائے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔ مولانا کی تقریر موثر ثابت ہوئی۔ یہ گاؤں بعد میں جماعت اسلامی کا گڑھ بن گیا۔ چودھری ثناء اللہ، چودھری ظفر اللہ اور چودھری رفاقت جیسے قیمتی ساتھی اسی گاؤں سے جماعت کو ملے۔

اللہ کی خصوصی مدد

مولانا وزیر خان صاحب اپنی سائیکل پہ صبح وشام سفر کیا کرتے تھے۔ بیان کیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ انھیں اللہ نے نئی زندگی عطا فرمائی۔ اگر اللہ کی خصوصی رحمت نہ ہوتی تو اس روز بچ نکلنا

Marfat.com

ناممکن تھا۔'' ہوا یوں کہ میں ضلع خوشاب کے علاقے نور پور تھل سے شام کو پروگرام سے فارغ ہوا تو سوچا کہ نکل چلوں۔ ابھی سورج غروب ہونے میں کچھ وقت تھا۔ سائیکل لی اور چل پڑا۔ راستے میں مغرب کی نماز پڑھی۔ ارادہ یہی تھا کہ جوہر آباد پہنچ جاؤں۔ شام کا اندھیرا تو ابھی نہیں چھایا تھا مگر اچانک زبردست جھکڑ اور آندھی نے ایک طوفان برپا کر دیا۔ تھل کی ریت ہر جانب اُڑ رہی تھی اور آندھی اتنی تیز کہ ہر لمحے یوں محسوس ہوتا کہ ابھی اڑا کر لے جائے گی۔

جنگل کا چیتا اور اسلام کا سپاہی!

میری ایک جانب قریب ہی ایک جنگل بھی تھا۔ میں نے اسی راستے پر ایک درخت سے اپنے آپ کو چادر کے ساتھ باندھ لیا۔ قریب ہی میری سائیکل پڑی تھی۔ آندھی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اللہ کو یاد کر کے اس سے مدد مانگ رہا تھا کہ اچانک جنگل کی طرف سے ایک چیتا خراماں خراماں میری جانب بڑھتا نظر آیا۔ مجھے احساس ہوا کہ بس اب میری موت آگئی۔ نہ کوئی بھاگنے کا راستہ تھا نہ کوئی جائے پناہ۔ میں نے دل میں کلمہ پڑھا اور اللہ پر توکل کر کے اپنی سانس روک لی۔ پھر یوں جامد و ساکت درخت کے ساتھ چمٹ گیا جیسے بے جان ہوں۔ چیتا آیا، میرے گرد اُس نے چکر لگایا، پھر قریب آ کر مجھے سونگھا مگر میری طرف نہ تو پنجہ بڑھایا نہ دانت کھولے۔ میں نے یہی کوشش کی کہ دم سادھے کھڑا رہوں۔ کچھ دیر سونگھنے کے بعد چیتا واپس جنگل کی طرف چلا گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کچھ دیر کے بعد جب آندھی رکی تو میں نے خود کو درخت سے کھولا، اپنی سائیکل اٹھا کر اس پر سوار ہوا اور قریب ہی ایک بستی میں جا کر رات گزاری۔''

مولانا وزیر خاں مرحوم کا یہ واقعہ بڑا ایمان افروز ہے۔ اللہ کی راہ میں نکلنے والوں کو اللہ کی معیت اور اس کی رحمت حاصل رہتی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کی حفاظت عجیب وغریب طریقے سے فرماتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی یہ واقعات تاریخ میں منقول ہیں کہ افریقہ کے جنگلوں میں پہنچ کر میر سپاہ اعلان کرتے تھے کہ جنگل کے جانورو! ہم محمد رسول اللہؐ کے غلام ہیں، اللہ کے راستے میں گھروں سے نکلے ہیں۔ تم ہمارے لیے یہ علاقہ اور اس کے راستے خالی کر دو۔'' جنگلی درندے

Marfat.com

ان مقامات سے دور ہجرت کر جاتے تھے۔ مولوی وزیر خان بھی اللہ کے راستے میں نکلے ہوئے تھے۔ اللہ نے انھیں بھی محفوظ رکھا۔

مزید تعلیم

مولانا محمد وزیر خان ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی تھے۔ جامعہ دارالعلوم سرگودھا میں پڑھائی کے دوران حکیم عبدالرحمان ہاشمی سے متعارف ہوئے اور ان سے ہومیو پیتھک کورس مکمل کیا۔ یوں ہاشمی صاحب مولانا کے استاد تھے۔ چک ۷۴ میں دوبارہ واپسی پر پرائیویٹ بی اے بھی کرلیا اور جب ناروے جانے کا مرحلہ آیا تو اس سے قبل پرائیویٹ ایم اے عربی میں کرلیا۔ یوں سمجھیے کہ جوانی ہی نہیں، پختہ اور ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی مولانا نے اپنے ذوقِ علمی کی تسکین کے لیے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ مطالعہ کا ذوق بہت اچھا تھا۔ علمی کتب اور تحریکی رسائل میں چھپنے والے تمام مضامین کا مطالعہ اور تجزیہ کرتے رہتے تھے۔ اپنے حاصل مطالعہ کو دوسرے احباب کے ساتھ شیئر (Share) بھی کرتے تھے۔ بچپن میں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل نہ کرسکے برطانیہ جاکر اس کا بڑا احساس ہوا مگر اب انگریزی سیکھنا آسان نہ تھا۔ مرحوم کے بیرون ملک قیام کا دور بھی بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ ”ادھر ڈوبے ادھر نکلے“ کے مصداق خوب گہما گہمی میں وقت گزارا۔

بیرون ملک دعوتی کام

مولانا محمد وزیر خان صاحب ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اسلامک کلچرل سنٹر ناروے کی دعوت پر مولانا خلیل حامدی کے توسط سے اوسلو (ناروے) تشریف لے گئے۔ اس قیام کے دوران مولانا نے کئی بچوں کو ان کے گھروں میں قرآن کی تعلیم دی اور پنجابی آبادی میں خاصے وسیع پیمانے پر دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ تین سکھ لڑکیاں بھی مولانا کے ہاتھ پر مسلمان ہوئیں، جن کی شادیاں سوڈان، مراکش اور تیونس کے نوجوانوں سے ہوگئیں۔ یہ عرب نوجوان بھی مولانا کے دوست اور شاگرد تھے۔ یہاں وہ تقریباً تین سال رہے، مگر مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے ان کے اور انتظامیہ کے درمیان زیادہ ہم آہنگی نہ پیدا ہوسکی۔ چنانچہ مولانا ناروے سے برطانیہ منتقل

Marfat.com

ہو گئے۔ یہاں ان کا قیام تقریباً بیس بائیس سال رہا۔ کچھ عرصہ انھوں نے یو کے اسلامک مشن کے ساتھ کام کیا۔ پھر اپنے طور پر گھروں میں بچوں کو تعلیم اور ٹیوشن کے ذریعے کام کرتے رہے۔ وہ مختلف شہروں میں مقیم رہے، مگر برطانوی شہریت حاصل نہیں کی۔ لندن کے علاقے سلاؤ میں بے شمار بچوں اور بچیوں کو قرآن پاک اور ترجمہ پڑھایا۔ ان کے شاگردوں میں ایک نوجوان مدثر احمد نے مولانا کی اس قدر خدمت کی، ان کے بچے حسرت کرتے ہیں کہ ہم اپنے والد گرامی قدر کی اتنی خدمت نہ کر سکے۔ مدثر احمد کی والدہ محترمہ شہناز بی بی نے مولانا سے قرآن کریم پڑھا۔ وہ بھی مولانا کی اپنے والدین کی طرح خدمت کرتی تھیں۔

مجھ سے آخری مرتبہ ان کی ملاقات لندن کے قریب ایک شہر سلاؤ میں ہوئی۔ یہاں مولانا اپنی انفرادی حیثیت میں خاصے فعال تھے۔ کینیا سے یہاں منتقل ہونے والے میرے ایک دوست محمد عتیق صدیقی صاحب سے بھی مولانا کا اچھا دوستانہ تھا۔ صدیقی صاحب جمالی آدمی تھے اور مولانا جلالی مگر دونوں میں خوب محبت تھی۔ اللہ ان دونوں مرحومین کے درجات بلند فرمائے۔

تحریکی خاندان

بیرونِ ملک قیام کے دوران جماعت کے اجتماعات بالخصوص کل پاکستان اجتماعات میں وہ باقاعدگی سے تشریف لاتے تھے۔ اس سارے عرصے میں مولانا کی فیملی پاکستان ہی میں مقیم رہی۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ جس دور میں مولانا ضلع سرگودھا کے قیم تھے، اس زمانے میں انھوں نے اپنی اہلیہ کو بھی جماعتی لٹریچر پڑھایا اور جلد ہی ان کی رکنیت مرکزِ جماعت سے منظور ہو گئی۔ مولانا کی اہلیہ ۲۲ سال قبل ۱۹۹۱ء میں وفات پا گئی تھیں۔ اس سے قبل مولانا نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اسی سال حج کیا۔ حج سے واپسی پر مولانا کی اہلیہ بیمار تھیں، چنانچہ ۷ محرم کو خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

مرحومہ ضلع سرگودھا میں حلقہ خواتین کی ضلعی ناظمہ بھی رہیں۔ مولانا کو اللہ نے تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا فرمائی۔ بڑے بیٹے محمد اقبال خاں فوج میں ملازم تھے۔ جماعت کے متفق اور کارکن تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سرگودھا ہی میں اپنے گھر کے قریب ایک دکان بنائی اور خوب محنت و

Marfat.com

دیانت سے اپنا کاروبار منظم کیا۔ محمد اقبال خاں ۲۰۰۷ء میں وفات پا گئے۔ انھوں نے اپنے پیچھے سات بچے چھوڑے، چار بیٹے اور تین بیٹیاں۔ دوسرے بیٹے محمد بشیر خاں جماعت کے رکن اور مزدور تنظیم این ایل ایف کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی اہلیہ جماعت کی امیدوار رکنیت ہے۔ وہ بھی دکانداری کرتے ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ تیسرے بیٹے محمد طاہر خاں محکمہ تعلیم میں ملازم ہیں۔ جماعت کے سرگرم حامی ہیں۔ ان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ مولانا کی اکلوتی بیٹی ظاہر پیر ضلع رحیم خان میں ہوتی ہیں۔ اس کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ مولانا کے تمام بچے اور پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بے تکلفی

مولانا اپنے بچوں سے بے تکلف تھے۔ باہمی ہنسی مزاح چلتا رہتا تھا۔ کہا کرتے تھے بچوں سے دوستی کا بھی اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ بشیر خان کے بقول اس نے مولانا کے لیے بھنے ہوئے چنے اور مکھانے لاکر دیے تو دراز میں رکھ دیے۔ وہاں سے طلب کے مطابق لیتے اور کھاتے۔ چھوٹے بچوں کی نظر پڑی تو انھوں نے بھی کچھ ہاتھ دکھایا۔ مولانا فرمانے لگے ''بھئی بڑے چھوٹے جمع ہو جاؤ۔ جرگہ ہے۔'' پھر فرمایا ''میری چوری ہوگئی ہے۔ چور پکڑنے میں میری مدد کرو۔ میرے چنے اور مکھانے کوئی چرا کے لے گیا ہے''۔ گفت گو کے دوران میں ذرا ہنسا تو فرمانے لگے ''چور پکڑا گیا ہے۔'' سب نے پوچھا ''ابا جی وہ کون ہے؟'' فرمایا ''بشیر خاں'' اس پر میں نے کہا ''ابا جی آپ سے چوک ہوگئی۔ میرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔'' یہ سن کر خوب ہنسے۔ مولانا کے دانت سلامت تھے جبکہ بشیر خاں کے سبھی دانت نکل چکے ہیں۔

آخری لمحات

برطانیہ سے مولانا کی مستقل واپسی ۲۰۰۷ء میں ہوئی اور وہ چک ۴۷ میں اپنے مکان پر اپنے بچوں کے ساتھ مقیم ہوگئے۔ بڑھاپے کے علاوہ کوئی خاص عارضہ لاحق نہ تھا۔ تمام معمولات ٹھیک چل رہے تھے۔ ۹ رنومبر ۲۰۱۲ء کو رات ٹھیک ٹھاک بچوں کی محفل جمی۔ بشیر خاں (بڑے

Marfat.com

صاحبزادے) معمول کے مطابق مولانا کا جسم دباتے رہے۔ پھر ان سے مولانا نے فرمایا کہ جاؤ جا کر سو جاؤ۔ مولانا اپنے چھوٹے بیٹے طاہر خاں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ تینوں بیٹوں کے مکان ساتھ ساتھ ہی ہیں۔ رات تہجد اور صبح فجر کی نماز اپنے معمول کے مطابق ادا کی۔ طاہر نے فجر کے بعد ناشتے کا کہا تو فرمایا کہ ذرا دیر بعد کروں گا، اس وقت آرام کرنے دو، ذرا غنودگی سی محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد بچوں نے آواز دی تو کوئی جواب نہ آیا۔ رضائی منہ سے اٹھائی تو مسافر اپنی منزل کو روانہ ہو چکا تھا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اللہ کے دین کے سچے سپاہی اور تحریک اسلامی کے مخلص مجاہد! اللہ تعالیٰ مرحوم کی حسنات کو قبول فرمائے اور انسانی لغزشوں کو معاف فرما کر ان کو اعلیٰ علیین میں مقام بخشے۔

Marfat.com

ڈاکٹر پرویز محمود خاں شہید

(۱۹۶۳ء-۲۰۱۲ء)

ظالم کا حریف، مظلوموں کا ساتھی

ڈاکٹر پرویز محمود خاں ایک عظیم سماجی کارکن اور سیاسی رہنما تھے۔ کراچی میں نفرتوں کے الاؤ اور گولیوں کی بوچھاڑ میں جہاں کہیں سے چند میٹھے بول اور مظلومین کے زخموں پر مرہم رکھنے والے محبت بھرے الفاظ سنائی دیتے تھے، اس جانب جس کسی نے بھی بنظر غور دیکھا اسے ایک پرعزم اور جرأت مند شخص کی تصویر نظر آئی۔ وہ ظلم کے سامنے جھکنا نہ جانتا تھا۔ وہ سر اٹھا کر جیا اور وقت کے فرعون صفت قاتلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا رہا۔ اس عظیم انسان کا نام کراچی کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہ تھا مرد حر ڈاکٹر پرویز محمود خاں۔ قاتلوں سے لوگ دبک جاتے ہیں مگر وہ ان کو للکارتا اور مظلوموں کے زخموں پر مرہم رکھتا تھا۔ وہ جرأت و دلیری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر پرویز محمود خاں اپنی انھی صفات کی وجہ سے کراچی کے بھتہ خور اجارہ داروں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس کے بارے میں قاتل مافیا کی طرف سے فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے اور یہ بات کوئی راز نہیں تھی۔ کراچی کا عام آدمی بھی جانتا تھا اور ڈاکٹر پرویز محمود بھی اس سے باخبر تھے۔ حکومتی مشینری اور قانون نافذ کرنے والے تمام اداروں کے علم میں بھی یہ سب کچھ تھا۔ ایک پیشہ ور ٹارگٹ کلر جب گرفتار ہوا تو دوران تفتیش اس نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے واضح طور پر بتا دیا کہ ڈاکٹر پرویز محمود ہٹ لسٹ پر ہے۔

شیرِ خدا

ڈاکٹر پرویز محمود کے بہی خواہوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ناظم آباد سے اپنی رہائش بدل لیں یا

Marfat.com

بیرون ملک چلے جائیں۔ وہ احتیاط کے پیش نظر مختلف اوقات میں راتیں گھر سے باہر تو گزارا کرتے تھے مگر اپنی رہائش نہ بدلی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لمحہ میرے لیے اجلِ مسمّٰی ہے اور جس گولی پہ میرا پیغامِ موت درج ہے اسے ٹالنا اور روکنا کسی کے بس میں نہیں۔ وہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی یک روزہ زندگی کو بہتر سمجھتے تھے۔ آخر وہی ہوا کہ ۱۷ ستمبر ۲۰۱۲ء کے دن ستم گر قاتلوں نے اسے نشانہ بنایا۔ آہ مظلوموں کی دادرسی کرنے والا، یتیموں اور بیواؤں کے سر پہ دستِ شفقت رکھنے والا، بے نواؤں کی امیدوں کا مرکز، ظالم مافیا کی گولیوں کا نشانہ بن گیا! خسارہ تو ظالم قاتل ہی کے حصے میں آئے گا۔ رہا یہ عظیم مجاہد، تو اس کے لیے بشارت ہے کیوں کہ وہ جامِ شہادت پی کر زندۂ جاوید ہو گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خوں غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

خاندان

ڈاکٹر پرویز محمود ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھا۔ شہید کے والد حاجی محمود خان اور ان کے آباؤ اجداد کا اصل وطن کابل (افغانستان) تھا۔ ان کا خاندان قطب شاہی اعوان نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کابل سے متحدہ ہند میں نقل مکانی کر کے آ گئے اور حسن ابدال میں ڈیرے لگا لیے۔ حاجی محمود خان صاحب اور ان کے دیگر عزیز و اقارب متحدہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کاروبار اور ملازمتوں کے سلسلے میں پھیل گئے۔ بنیادی طور پر یہ خاندان عسکری میدان کا شہ سوار تھا۔ حاجی صاحب حسن ابدال سے ۱۹۴۶ء میں کراچی چلے آئے۔ جیسا کہ بیان ہوا مارشل ریس سے تعلق کی وجہ سے وہ فوج میں ملازم ہو گئے اور فوج کی ملازمت کے سلسلے میں آزادی سے قبل متحدہ ہند اور آزادی کے بعد پاکستان میں مختلف مقامات پر تعینات رہے۔

تعلیم اور عملی زندگی

ملازمت ہی کے سلسلے میں حاجی محمود خاں کراچی آئے تھے۔ پھر اسی شہرِ امن و آشتی اور محبت و

Marfat.com

اخوت کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر میں ان کو عزت و احترام کے ساتھ اپنا وقت گزارنے اور اپنے اہل و عیال کی اچھی تربیت اور دیکھ بھال کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کا گھر مہمان نوازی کا مرکز تھا اور وہ ایک ہمہ گیر و مقبول شخصیت تھے۔ ان کے بیٹے اختر محمود خاں، جاوید محمود خاں اور پرویز محمود خاں سبھی ہونہار اور اطاعت گزار تھے۔ بڑے بھائی اختر محمود مرحوم کراچی ہی میں مقیم تھے جبکہ دوسرے جاوید محمود امریکا میں رہائش پذیر ہیں۔ ڈاکٹر پرویز محمود ذہین طالب علم تھے۔ سکول میں مختلف غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی فعّال کردار ادا کرتے اور امتحانات میں بھی اچھی پوزیشن حاصل کرتے۔ اچھی پوزیشن کے ساتھ ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھیں سندھ میڈیکل کالج میں داخلہ ملا جہاں سے انھوں نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ میڈیکل کا امتحان پاس کرنے کے کچھ عرصے بعد وہ بھی اپنے بھائی جاوید محمود کی دعوت پر امریکہ چلے گئے۔ یہاں نیویارک میں وہ اسلامی مرکز کے ساتھ بھی وابستہ تھے اور مسلم کمیونٹی کے لیے سماجی خادم کے طور پر بھی اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔

امریکہ میں سزا

جب بابری مسجد شہید ہوئی تو انڈیا کے جنونی ہندوؤں کے خلاف پوری دنیا کی طرح نیویارک اور دیگر شہروں میں بھی مسلمانوں نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ ڈاکٹر پرویز محمود خاں اس مہم میں قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر امریکی حکومت کی طرف سے مقدمہ بن گیا۔ انھیں نیویارک میں ایک عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج نے ایک آدھ پیشی کے بعد ان کو سزا سنادی اور ساتھ ہی کینساس جیل بھیج دیا۔ ان کے وکیل نے ضمانت کی درخواست دی تو عدالت نے ایک ماہ بعد ضمانت پر رہا کیا۔ انتظامیہ نے کچھ عرصے بعد ان کو ملک سے ڈی پورٹ کر دیا۔ یوں کیس بھی حکومت نے خود ہی داخل دفتر کر دیا۔ ڈاکٹر پرویز نے مغرب کا ظاہری چمک دار چہرہ دیکھ لیا اور پکار اٹھے کہ اس کا اندرون چنگیز سے تاریک تر ہے۔ پھر زندگی بھر اس جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

Marfat.com

میدانِ سیاست میں!

امریکہ جانے سے قبل، ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر صاحب ایک سال کے لیے کینیڈا میں بھی رہے تھے اوران کے بعض دوستوں کی رائے تھی کہ وہ دوبارہ کینیڈا جا کر وہاں رہائش پذیر ہو جائیں مگر انھوں نے کہا کہ نہیں میں اب پاکستان ہی میں رہوں گا۔ یہاں اور وہاں ایک ہی جیسی تہذیب ہے۔ وطن واپسی پر انھوں نے اپنے میڈیکل پروفیشن کے ساتھ ساتھ اپنی سماجی وسیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔شہید ایک محنتی، صابر اور جرأت مند انسان تھے اس لیے سیاسی میدان میں خوب پیشرفت کی۔لیاقت آباد ٹاؤن کے ٹاؤن ناظم منتخب ہوئے اور اپنے ٹاؤن میں ترقیاتی کاموں کا ایک جال بچھا دیا۔ٹاؤن میں کیے گئے ان کے ترقیاتی کاموں کو لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں۔وہ ایک مثالی بلدیاتی رہنما تھے۔ ہر کارکن اور شہری کی مشکل میں مدد اور مسائل کے حل میں دادرسی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ایم ۔کیو۔ایم کی بھتہ خوری، غنڈہ گردی اور دھونس سے جو لوگ تنگ آ جاتے وہ ڈاکٹر پرویز محمود کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔وہ ہر مظلوم کی بلا امتیاز حمایت کرتے۔ایم۔کیو۔ایم کے لوگوں نے انھیں بارہا دھمکیاں دیں۔

دھمکیاں

ایم۔کیو۔ایم سرکاری ایجنسیوں کی سرپرستی میں بنی اور پروان چڑھی۔اس کی اٹھان ہی فساد پر تھی۔لسانی عصبیت اور جرائم کے ذریعے خوف وہراس پیدا کرنا، پھر لوگوں کو یرغمال بنا کر ان سے رقوم بٹورنا اس کا کلچر بنا۔شہر امن واخوت نفرتوں اور قتل وغارت گری کا گڑھ بن گیا، روشنیوں کی جگہ ظلمات اور محبت کی جگہ آتشیں شعلے اہل کراچی کا مقدر بن گئے۔سیاست میں مار دھاڑ اور دھونس دھاندلی کا کلچر پروان چڑھا۔بیلٹ بے اثر اور بلٹ فیصلہ کن ٹھہری۔ ہر پرامن شہری کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔عذاب الٰہی کی صورت یہ مافیا شہر کے در ودیوار پر چھا گیا۔ان غنڈہ گردوں کے راہنما الطاف حسین لندن میں بیٹھے ان قاتل وبھتہ خور گروپوں کی سرپرستی بھی کرتے اور جب انھی قاتلوں کے ہاتھوں بے گناہ شہری موت کے گھاٹ اتارے جاتے تو مگر مچھ کے آنسو بہاتے

Marfat.com

ہوئے ان سے اظہارِ ہمدردی بھی کرتے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی مدت سے یہی ڈرامہ چل رہا تھا۔

الطاف کے نام کھلا خط

ڈاکٹر پرویز محمود نے ناظم ٹاؤن کی حیثیت سے ۳ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ایم۔کیو۔ایم کے قائد کے نام ایک کھلا خط لکھا جو کراچی کے کئی اخبارات نے چھاپا۔ ڈاکٹر صاحب کا نام ہٹ لسٹ پر تو پہلے ہی سے تھا مگر اس خط کا چھپنا تھا کہ ان کا نام ہٹ لسٹ پر سرفہرست آ گیا۔ ایک نظر یہ خط بھی پڑھ لیجیے، ایک مردِ حق، بے باک مجاہد اور خالد و طارق کے جانشین کا ہر لفظ جرأت و ایمان کی تفسیر ہے۔ لکھتے ہیں:

"جمعہ ۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۵ ہجری، ۳ ستمبر ۲۰۰۴ء

الطاف حسین صاحب.........متحدہ قومی موومنٹ

آپ نے جب سے ختمِ نبوت کے انکاری آنجہانی مرزا غلام طاہر کے مرنے پر مغفرت کی دعا کی، آپ کو سلام یعنی آپ پر سلامتی بھیجنے کو دل نہیں مانتا۔ ان دنوں شہر کراچی کی دیواریں "اپنا قائد صرف الطاف" "Only Altaf" اور "ہم کو منزل نہیں رہنما چاہیے" کے نعروں سے بدصورت ہو رہی ہیں۔ آپ جیسے "رہنما" کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

قافلے دلدلوں میں جا ٹھیرے
رہنما پھر بھی رہنما ٹھیرے

چور مچائے شور

۱۸ اگست سے اخبارات میں آپ کا واویلا جاری ہے کہ MQM کے خلاف ایک نئے آپریشن کی تیاری ہو رہی ہے، جبکہ گورنر سندھ اور حکومت ایسے کسی آپریشن سے انکار کر رہی ہے۔ شہر کراچی کا ہر باشعور شہری آپ کی طرزِ سیاست کو سمجھتا ہے کہ جب بھی آپ کی وطن واپسی کا مطالبہ شدت اختیار کرتا ہے آپ کسی آپریشن یا نئے گروپ کا ہوّا کھڑا کر دیتے ہیں۔ موجودہ حکومت اور حالات میں آپ کی وطن واپسی کا مطالبہ زیادہ شدت اختیار کر گیا کیونکہ اپنی گولڈن جوبلی پر صدرِ مملکت جو آرمی چیف بھی ہیں، کی جانب سے آپ نے گلدستہ اور کیک وصول کیا۔ سابق وزیر اعظم

Marfat.com

اور حکومتی پارٹی کے صدر چودھری شجاعت آپ کو وطن واپس لانے کے لیے خود لندن تشریف لا رہے تھے اور وزیر اعلیٰ سندھ نے کہا کہ الطاف حسین کی وطن واپسی کوئی مسئلہ نہیں اور وہ اپنی مرضی سے لندن میں رہ رہے ہیں۔

سربستہ راز؟

حکومتی بیانات اور وطن واپسی کے سازگار ماحول کے تحت پیدا ہونے والے دباؤ کو ختم کرنے کے لیے آپ نے ۱۷ اگست کو جنرل ورکرز اجلاس میں دو خطوط جو وزیر اعظم سیکریٹریٹ اور CCPO کے دفاتر سے جاری ہوئے، کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ متحدہ کے خلاف آپریشن کی تیاری ہو رہی ہے اور سازش کے تحت متحدہ میں ایک نیا گروپ بنایا جا رہا ہے۔ آپ نے ان خطوط کا تو ذکر کیا لیکن ان کے مندرجات سے MQM کے کارکنان کو آگاہ نہیں کیا، کیونکہ اس سے آپ کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا۔ ان خطوط کے مضمون کے مطابق آپ کے حکم پر آپ کے نمائندہ خصوصی واسع جلیل نے 8 دہشت گردوں، جو ماضی میں قتل و غارت گری اور دہشت گردی کی سیکڑوں وارداتوں میں ملوث رہے ہیں، کا ایک قاتل دستہ تشکیل دیا ہے جنھیں سات افراد کو قتل کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے اور آپ کی مرتب کردہ فہرست میں الحمدللہ میرا نام پہلا ہے۔ مجھے آپ کا چیلنج قبول ہے۔ میرا ماضی گواہ ہے کہ میں نے کبھی زمینی خداؤں کو سجدہ نہیں کیا اور ظالموں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے آپ کے حکم پر میرے گھر پر فائرنگ ہوئی، مجھ پر قتل اور دیگر سنگین الزامات کے جھوٹے مقدمات قائم ہوئے، میرے گھر پر پولیس سے چھاپے ڈلوائے گئے، لیکن آپ کو جان کر تکلیف اور مجھے لکھتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ میں اب بھی III-C-12/19 نزد عباسی شہید اسپتال میں رہائش پذیر ہوں، میرا آفس گجر نالہ پر ہے اور میں صبح سے رات گئے تک اس شہر کراچی میں گھومتا ہوں جہاں آپ بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔

بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا

ہر شخص آپ کی طرح زندگی کی اتنی چاہت نہیں رکھتا کہ موت کے خوف سے لندن بھاگ

Marfat.com

جائے اور زندگی کی ضمانت کے لیے امریکا کا تنخواہ دار ایجنٹ بن جائے اور امریکا کی نوکری اس طرح کرے کہ پاکستان سمیت دنیا کے دیگر ممالک میں لاکھوں مظلوم مسلمانوں پر ہونے والے امریکی مظالم پر خاموشی اختیار کرے اور ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی ہو کہ ''مظلوموں کا ساتھی ہے الطاف حسین!'' آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ ''زندگی'' اور ''عمر'' کا فرق کیا ہے؟ زمینی خداؤں اور ظالموں کے سامنے سر اٹھا کر آزادی اور وقار سے جینے کا نام زندگی ہے، اور زمینی خداؤں، ظالموں کے سامنے سر جھکا کر بے بسی اور مظلومیت کے ساتھ قسمت میں لکھی سانسوں کو پورا کرنا عمر ہے۔ آپ ۲۱ویں صدی میں شہر کراچی کے کروڑوں عوام کو دہشت گردی، قتل و غارت گری اور بندوق کی نوک پر ذہنی اور جسمانی طور پر غلام بنانا چاہتے ہیں، اور میں ان کی آزادی اور باوقار زندگی کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں، اور آخری سانس اور لہو کے آخری قطرے تک جدوجہد جاری رکھوں گا، چاہے اس میں میری جان بھی چلی جائے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی شخص گولی سے نہیں مرتا، اپنی موت سے مرتا ہے، چاہے موت ٹھوکر لگنے سے واقع ہو جائے۔

موت زندگی کی محافظ

شاید آپ بھول گئے لیکن مجھے حضرت علیؓ کا قول اب بھی یاد ہے ''میری موت میری زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔''

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو، راہ گزر تو دیکھو
ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجیے
ہر راہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

تحریری جواب کے بجائے آپ کے عمل کا منتظر''

نمرودی روش

اس مدلل اور جرأت بھرے خط کا الطاف حسین کے پاس کیا جواب ہوتا۔ پرویز محمود پرامن شہری

Marfat.com

اور قانون کے دائرے میں زندگی گزارنے والا عوامی لیڈر تھا اور الطاف صاحب کا کردار سب کے سامنے ہے۔ ان کا جواب بھی ظاہر ہے، ان کی سوچ، تاریخ اور کلچر کے مطابق ہی آنا تھا، سو وہی ہوا جو اس سے قبل ہزاروں بے گناہ شہریوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ نمرود اور اس کا ٹولہ جب لاجواب ہو گیا تو ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا گیا تھا! باطل کی ہمیشہ سے یہی سرشت ہے اور یہی تاریخ!

آخر ۱۷ ستمبر ۲۰۱۲ء کو قاتلوں نے اس عظیم مسیحا، صاحب دل انسان اور لوگوں کے درد بانٹنے والے سماجی رہنما کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ ڈاکٹر پرویز شہید کے علاوہ جماعت کا ایک اور ساتھی عبدالواحد بھی ان کے جنازے کے روز شہید کر دیا گیا۔ وہ دن اہلِ کراچی کے لیے سوگ اور ماتم کا دن تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں اشک بار تھیں اور ہر دل اداس و پریشان تھا۔ کراچی بھر میں لوگوں نے سوگ منایا۔ شہر میں بہت بڑے احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ وزیر اعلیٰ ہاؤس اور گورنر ہاؤس کے باہر تمام جماعتوں کے احتجاجی کارکنان جمع ہو گئے۔ لوگوں نے وزیرِ اعلیٰ ہاؤس کے سامنے دھرنا دیا اور ایم۔ کیو۔ ایم کے ظلم و درندگی کے خلاف زبردست نعرے بازی کرتے ہوئے حکومت کو وارننگ دی کہ وہ قاتلوں کو گرفتار کر کے عدالت میں فی الفور پیش کرے۔ اس موقع پر اسد اللہ بھٹو اور سابق ناظم میٹرو پولیٹن کارپوریشن کراچی جناب نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ نے حکومتی کارندوں کو ایک میمورنڈم بھی پیش کیا۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ بھی دیدنی تھی۔ یوں لگتا تھا، سارا شہر جنازے کے لیے نکل آیا ہے۔ اس میں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی، اے۔ این۔ پی اور تمام مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ پھر اس عظیم انسان کو سخی حسن کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اخباری رپورٹس کے مطابق شرکائے جنازہ نے قبر کی مٹی کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دیا۔

تعزیت کے لیے حاضری

ڈاکٹر پرویز محمود نے اپنے پیچھے بیوہ اور گیارہ سالہ بیٹی رابعہ محمود چھوڑی ہے۔ ناظم آباد میں جو خاندانی گھر تھا وہ مرحوم کے بھائی جناب جاوید محمود اور دیگر ورثا نے اپنی یتیم بھتیجی رابعہ محمود کے نام

Marfat.com

کردیا ہے۔ڈاکٹر پرویز محمود کے بڑے بھائی جناب اختر محمود مرحوم بھی جماعت کے کارکن تھے۔ میں ان کے گھر تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو جماعت اسلامی کے مقامی و ضلعی ذمہ داران کی ایک تعداد بھی وہاں موجود تھی۔مرحوم کے دو بھتیجے عزیزم خالد اختر محمود اور خرم اختر محمود ہمارے انتظار میں تھے۔انھوں نے ہمارا استقبال کیا۔گھر کے دالان میں بہت سی کرسیاں پڑی تھیں جس سے معلوم ہوا کہ آنے جانے والے مہمانان کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔گھر کا دروازہ کھلا رکھنا اس خاندان کی تاریخی روایت ہے جو عظمت اور بڑے دل کی بھی علامت ہے۔مجلس میں موجود شہید کے دونوں بھتیجے اپنے عظیم چچا کی زندگی کے ایمان افروز واقعات کا تذکرہ کر رہے تھے۔کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اپنے تاثرات و جذبات قلم بند بھی کر دیں۔جماعت کے تمام ساتھی بھی اپنا اپنا تاثر بیان کر رہے تھے۔ہر ایک کا یہی بیان تھا کہ شہید اپنے ساتھیوں میں سے کبھی کسی دو کے درمیان اختلاف اور تصادم کی کیفیت دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور فریقین سے ہاتھ جوڑ کر اللہ کے نام پر التجا کرتے کہ باہمی اختلاف و افتراق کو فراموش کر کے گلے مل جائیں اور دلوں سے کدورت مکمل طور پر ختم کر دیں۔کسی مخالف کے ہاتھوں کوئی کارکن ستایا جاتا تو اس کی ڈھال بن جاتے اور ظالموں کو بے خوف للکارتے۔وہ اقبال کے شعر کا مصداق تھے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

اللہ تعالیٰ شہید کے درجات بلند فرمائے اور ان کے جملہ لواحقین کو صبر و اجر سے نوازے۔اللہ شہید کی بیوہ اور یتیم بچی رابعہ کو اپنا سایہ رحمت عطا فرمائے اور ہر شر سے محفوظ کر کے ہر خیر ان کا مقدر فرمادے۔

Marfat.com

شیخ عبدالوحید

(۱۹۵۱ء-۲۰۱۲ء)

سانحۂ ارتحال

یکم اکتوبر ۲۰۱۲ء کو فجر کی نماز کے ساتھ اطلاع ملی کہ امیر جماعت اسلامی ضلع بہاولپور شیخ عبدالوحید اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ امیر صوبہ پنجاب ڈاکٹر سید وسیم اختر بھی نماز میں موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ۳۰ ستمبر کا پورا دن شیخ صاحب ان کے ساتھ ضلع کے مختلف دیہات میں مرحومین کی تعزیتیں اور مریضوں کی عیادتیں کرتے رہے۔ شام کو واپس بہاولپور آئے۔ ڈاکٹر صاحب شام کو بہاولپور سے لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور ہی میں شیخ صاحب کی اچانک بیماری اور پھر وفات کی اطلاع ملی۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ شیخ صاحب کو رات ۱۲ بجے کے قریب دل کی تکلیف محسوس ہوئی، اور فوراً ہسپتال لے جائے گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک آدھ گھنٹے ہی میں طبیعت مزید خراب ہوگئی۔ پھر اللہ کی طرف سے اپنے بندے کو بلاوا آیا اور وہ اپنا صالحانہ ریکارڈ لے کر خدمتِ ربانی میں حاضر ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ شیخ صاحب کی تمام حسنات کو قبول فرمائے اور ان کے انسانی تسامحات سے درگزر فرما کر انھیں اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔

اپنائیت و ہم آہنگی

زندگی میں بعض لوگوں کے ساتھ اچانک ملاقات ہوتی ہے۔ پہلے سے نہ ان کا کوئی غائبانہ تعارف ہوتا ہے نہ کسی حوالے سے جان پہچان، مگر پہلی ہی ملاقات ایسی دیرپا اور مضبوط دوستی میں ڈھل جاتی ہے کہ جس طرح فارسی کے قادر الکلام شاعر امیر خسرو نے کہا:

Marfat.com

من تو شدم تو من شدی، من جاں شدم، تو تن شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں ، من دیگرم تو دیگری

راقم کو شیخ عبدالوحید مرحوم کے ساتھ کچھ ایسا ہی تجربہ ہوا۔ میں جدہ اور سعودی عرب کے دیگر شہروں میں ۱۹۷۴ء سے جاتا آتا رہا ہوں۔ بعض سالوں میں تین چار مرتبہ بھی چکر لگ جاتا تھا۔ اس عرصے میں بے شمار پرانے اور نئے دوست اخوت و محبت کے رشتوں میں شامل رہے اور ہر ایک کی حسین یادیں دل و دماغ کو معطر کرتی رہیں۔ یہ ۱۹۹۲ء کی بات ہے کہ جب نیروبی سے آتے ہوئے میں جدہ ایرپورٹ پر اترا تو برادرِ عزیز راؤ طاہر صاحب کے ساتھ ایک نہایت سنجیدہ اور تین ساتھی کو استقبال کے لیے موجود پایا۔ راؤ صاحب نے تعارف کرایا کہ یہ ہمارے دوست شیخ عبدالوحید صاحب ہیں۔ موصوف اس اپنائیت اور تپاک سے ملے کہ جیسے جنم جنم کا ساتھ ہو حالانکہ یاد نہیں پڑتا کہ پہلے کبھی ان کو دیکھا ہو۔ میں ان کی محبت اور اپنائیت سے بہت متاثر ہوا۔

قصور اور قصوری

گاڑی میں بیٹھ کر تفصیلی تعارف شروع ہوا تو پتہ چلا کہ شیخ صاحب کا آبائی تعلق قصور سے ہے مگر ان کی پوری فیملی کئی سالوں سے بہاولپور میں مقیم ہے۔ بعد کے ادوار میں کبھی کبھار میں شیخ صاحب سے مذاق میں کہتا کہ آپ اصلی قصوری ہیں، قصور آپ ہی کا ہے تو مسکراتے ہوئے کہتے: ”نہیں جناب میں تو بہاولپوری ہوں۔ قصور کے حالات سے بالکل نابلد ہوں۔ میں قصوری ہرگز نہیں ہوں۔ میرے خلاف یہ فردِ جرم واپس لیجیے۔“

ترقی کے مدارج

راؤ محمد طاہر صاحب نے بتایا کہ شیخ عبدالوحید صاحب سعودی عرب جانے سے قبل تحریک اسلامی سے متعارف نہ تھے۔ جدہ میں آکر ہی جدہ کے تحریکی حلقے سے متعارف و منسلک ہوئے اور اس کے بعد بڑی محنت و توجہ سے نہ صرف خود قرآن کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ درسِ قرآن دینے کی مہارت و مشق بھی جاری ہے۔ اپنی محنت و دلچسپی کی بدولت علمی و تحریکی مدارج تیزی سے

Marfat.com

طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا: ''اللّٰھم زد فزد''۔ ان سے اس اولین ملاقات کے دوران ہی ان کے کئی نہایت پرمغز، خیالات اور اٹھائے گئے سنجیدہ سوالات سننے کا موقع ملا۔ مجھے اس امر پر خوشگوار حیرت بھی ہوئی کہ جدہ ہی میں کی گئی میری بعض گفتگوؤں کی کیسٹس سن کر انھوں نے کئی سوالات و نکات پیش کیے۔ احباب سعودی عرب کی ایک بہت اچھی روایت یہ رہی ہے کہ وہ ہر مہمان کی گفتگو کو اجتماعات و باہمی نشستوں میں ریکارڈ کر لیا کرتے ہیں اور پھر اس کی کاپیاں تمام افراد کے پاس ہر حلقے میں اور ہر گھر میں پہنچ جاتی ہیں۔ لوگ گھر سے اپنے کام پر جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے اپنی گاڑیوں میں یہ گفتگو، تقریر اور خطبہ سننے کا اہتمام کرتے ہیں۔ جدہ میں سالہا سال تک ہمارے محترم بھائی جناب وسیم احمد انصاری ریکارڈنگ کی ذمہ داریاں نہایت سلیقے اور مہارت کے ساتھ ادا کرتے رہے ہیں۔ موصوف آج کل پاکستان واپس آ چکے ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ معلوم نہیں جدہ میں اب یہ محاذ کس بھائی نے سنبھال رکھا ہے۔

ذمہ دار و فرض شناس

ائیر پورٹ سے راؤ طاہر صاحب کے گھر تک تیس، چالیس منٹ کی اس مسافت میں شیخ عبدالوحید سے ایسی اپنائیت پیدا ہوگئی کہ زندگی بھر اللہ کے فضل سے اس میں کبھی کوئی رخنہ پیدا نہ ہوا۔ اس ملاقات کے بعد تو ۲۰۰۴ء تک جب بھی سعودی عرب جانا ہوا، شیخ صاحب سے طویل نشستیں اور ملاقاتیں رہیں۔ دو مرتبہ میرے ساتھ جدہ سے مدینہ منورہ تک انھوں نے اپنی گاڑی میں سفر کیا۔ جدہ سے مکہ جانے کے لیے تو اکثر و بیشتر ان کی رفاقت میسر رہی۔ وہ اپنے گھر پر بھی بڑی محبت کے ساتھ ضیافت کا اہتمام کرتے تھے۔ شیخ صاحب نے تحریکی حلقے میں شامل ہونے کے بعد بڑی تیزی سے علمی و تعلیمی منازل طے کیں۔ وہ جدہ کے حلقہ میں اہم مدرسین قرآن میں سے تھے۔ وہ جدہ کے ایک تنظیمی یونٹ، شمالی زون کے ناظم بھی رہے۔ انتہائی ذمہ داری سے بطور کارکن بھی منصوبہ عمل کو پوری روح کے ساتھ سمجھ کر اپنا فرض ادا کرتے رہے اور ذمہ داری پر فائز ہونے کے بعد بھی اپنے فرائض کی ادائیگی کو ذاتی امور پر ترجیح دیتے رہے۔

Marfat.com

تنظیمی حلقے

جدہ میں پہلے تین حلقے ہوا کرتے تھے اور یہ ہمارے مقامی نظم کے مطابق تنظیمی اضلاع کہلاتے تھے۔ ان کے نام علاقائی بنیادوں پر تھے یعنی شمال جنوبی یا مشرقی وسطی وغیرہ۔ اب یہ نام تحریکی شخصیات کے ناموں پر رکھ دیے گئے ہیں اور حلقے بھی تین کی بجائے چار ہو گئے ہیں۔ سید مودودی زون، میاں طفیل محمد زون، خرم مراد زون اور ڈاکٹر نذیر شہید زون۔ تحریک اسلامی کی چار عظیم شخصیات کے ناموں پر حلقوں کا قیام خوش آیند ہے۔ اللہ ہمارے ساتھیوں کو ان کی کاوشوں کا بہترین اجر و انعام عطا فرمائے اور جن سابقون کے نام پر یہ حلقے قائم ہیں، ان کے بھی درجات بلند فرمائے۔ ان چاروں مرحومین کا تحریک کی آبیاری میں جو گراں قدر حصہ ہے، اس سے کون بے خبر ہے؟ یہ ایک حقیقت اور ماہرینِ نفسیات کے نزدیک مسلمہ بات ہے کہ نام کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے۔ شمالی، جنوبی سے وہ بات نہیں بنتی جو ان اکابر کے ناموں سے منسوب حلقوں کے کارکنان کو احساسِ ذمہ داری دلاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مثبت پہلو اور سامانِ ترغیب ہوتا ہے ورنہ اگر سرے سے احساس ہی نہ ہو یا بالفاظ دیگر بیج ہی نہ ڈالا گیا ہو تو پھر ناموں کا معاملہ غیر متعلق ہو جاتا ہے۔

قصۂ چہار درویش

جدہ میں قیام کے دوران وہاں کے ساتھیوں کی باہمی محبت و اخوت بھی خوب پروان چڑھی۔ سعودی عرب بحیثیت مجموعی اور حلقہ جدہ بالخصوص ہماری بیرون ملک تحریکی اکائیوں میں بہت نمایاں ہے۔ یہاں چہار درویش بھی پائے جاتے تھے۔ ان کی اپنی ایک دل چسپ تاریخ ہے جس پر ایک درویش صفدر بشیر صاحب کبھی کبھار قلم اٹھاتے ہیں اور کئی لطائف نذرِ قارئین کرتے ہیں۔ ان چہار درویشوں میں سے یکے بعد دیگرے تین پاکستان آ گئے۔ ایک اب تک جدہ میں مقیم ہیں چاروں ہیروں میں سے ایک یعنی شیخ عبدالوحید اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تین ماشاءاللہ حیات ہیں۔ اللہ ان کو صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔ ان میں دو تو واپس آ کر مرکز جماعت میں ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں یعنی الیاس احمد فاروقی صاحب اور صفدر بشیر صاحب۔ شیخ عبدالوحید

Marfat.com

صاحب نے بہاولپور میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اول الذکر دونوں احباب مرکزی شعبہ مالیات منصورہ میں کام کررہے ہیں۔ چوتھے درویش راؤ محمد طاہر صاحب ہیں جو جدہ میں ملازمت کررہے ہیں۔ ان کے علاوہ تینوں درویشوں کا تعلق اکاؤنٹس کے شعبے سے تھا۔

مدینہ اور شیخ صاحب

شیخ عبدالوحید ۲۰۰۴ء میں مستقل طور پر پاکستان واپس آگئے۔ پاکستان میں ان کے قیام کا یہ آٹھ سالہ دور ہر تحریکی کارکن اور قائد کے لیے ایک مثال ہے۔ شیخ صاحب شادی سے پہلے بھی سعودی عرب میں رہے پھر واپس آئے۔ ان کا خاندان نسلوں سے کاروبار سے وابستہ ہے۔ مگر شیخ صاحب نے خود کو کاروبار کے لیے فِٹ نہ پایا۔ چنانچہ شادی کے بعد ۱۹۹۱ء میں پھر واپس سعودی عرب چلے گئے۔ شیخ صاحب کا زیادہ قیام تو جدہ ہی میں رہا مگر کچھ عرصہ مدینہ منورہ میں بھی ملازمت کی۔ مدینہ منورہ کے تمام اہم اور تاریخی مقامات سے مرحوم بخوبی واقف تھے۔ ایک ایک جگہ کا نہ صرف تعارف کراتے بلکہ یہ بھی بتاتے کہ ان مقامات کا حلیہ نئی عمارتوں اور سڑکوں کی وجہ سے کب بدلا گیا۔ مکہ میں بیت اللہ شریف میں حاضری پر بھی مرحوم پر ایک روحانی کیفیت طاری ہوجایا کرتی تھی مگر مدینہ منورہ میں تو وہ رقتِ قلب کے ہاتھوں ناقابل بیان کیفیات سے گزرتے تھے۔ روضۂ اقدس پر حاضری کے وقت ان پر بے خودی وخود فراموشی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔

رقیق القلب

شیخ صاحب کے والد محترم، شیخ محمد شفیع، قصور سے بہاولپور منتقل ہوئے اور اپنے کاروبار کو خوب منظم ومضبوط کیا۔ شیخ عبدالوحید صاحب کے سات بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ شیخ صاحب ان آٹھ بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ شیخ صاحب کو میں نے بہت رقیق القلب پایا۔ کوئی مؤثر درس قرآن یا تقریر سنتے تو مختلف واقعات پر آبدیدہ ہوجاتے۔ چند سال قبل ان کے (پانچویں نمبر پر) چھوٹے اور جواں سال بھائی شیخ جاوید سرطان کے مرض میں مبتلا ہوکر فوت ہوئے تو ان کی جدائی پر بے حد غمزدہ تھے۔ جب میں تعزیت کے لیے ان کے پاس حاضر ہوا تو اپنے بھائی کو یاد کرکے

Marfat.com

بے ساختہ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ پھر فرمایا اللہ ہی مسبب الاسباب ہے مگر آپ اندازہ کیجیے کہ جاوید کے معصوم بچوں [ایک بیٹا اور ایک بیٹی] اور نوجوان بیوہ پر تو اس وقت غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ جاوید مرحوم تو شیخ صاحب کے سگے بھائی تھے۔ وہ تو عام جان پہچان والے لوگوں کی اس طرح کی وفات پر بھی بہت غمزدہ ہو جایا کرتے تھے۔ رقتِ قلب ایمان واخلاص کی علامت ہے۔ موصوف اس صفت سے متصف تھے۔

توکل وقناعت

رحیم وشفیق ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب کو اللہ نے بڑی استقامت اور راہ حق میں ایثار و قربانی کے لیے بڑا دل گردہ بھی دیا تھا۔ جدہ سے واپس تشریف لائے تو خود کو اللہ کے دین اور دعوت کے لیے وقف کر دیا۔ بہاولپور میں ان کی اپنی دو دو کانیں تھیں جبکہ ایک دکان ایم ایم عالم روڈ پر گلبرگ لاہور میں بھی تھی۔ کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ کوئی کاروبار شروع کریں مگر مجھے یاد ہے کہ ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا، ”اللہ نے بنیادی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کر رکھا ہے اب باقی ماندہ وقت آخرت کا گھر بنانے میں صرف کرنا چاہتا ہوں۔“ شیخ صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے عزیزم سلمان نے بتایا کہ اللہ کا شکر ہے لاہور کی دکان سے ماہانہ چالیس ہزار روپے کرایہ آ رہا ہے جبکہ بہاولپور کی دونوں دکانوں سے مجموعی طور پر 35 ہزار کی آمدن ہے۔ یہ کرائے جون میں دس فیصد بڑھ جائیں گے۔ الحمدللہ مرحوم بھائی کے اہل وعیال کے لیے دال روٹی کا انتظام ہے، البتہ بچوں کی تعلیم کے اخراجات آج کل خاصے ہو جاتے ہیں اور سبھی بچے ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانی پیدا فرمائے۔

انتخابی معرکہ

جدہ میں قیام کے دوران وہاں سے جب بھی وطن واپس آتے، بہاولپور میں جماعت کے ضلعی اور شہری دفتر میں جا کر رپورٹ کرتے اور اپنے مخصوص انداز میں فرماتے: ”جناب خادم حاضر ہے“۔ جب ۲۰۰۴ء میں مستقل طور پر واپس آ گئے تو بہت جلد یعنی ۱۱ر فروری ۲۰۰۵ء کو ان

Marfat.com

کو جماعت کا رکن بنالیا گیا۔ ان کی مستقل واپسی کے وقت بلدیاتی انتخابات میں صرف چار مہینے باقی تھے، جماعت نے فیصلہ کیا کہ شیخ صاحب کو شہر کی ایک یوسی سے، جہاں ان کی رہائش ہے، بطورِ ناظم کھڑا کیا جائے۔ شیخ صاحب نے معذرت کی اور کہا کہ میں اپنے گھر کے آس پاس کے چار گھروں سے زیادہ کسی کو جانتا تک نہیں، زندگی کا بیشتر حصہ سعودی عرب میں گزارا ہے، میں کیسے انتخاب لڑوں گا۔ دوستوں نے کہا کہ آپ کسی کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لوگ آپ کو جانتے ہیں، اب آپ کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب تو آپ کو میدان میں اترنا ہی ہوگا۔ شیخ صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا اور انتخابی معرکے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا مگر اللہ کی مدد سے آسان ہو گیا۔

شاندار کامیابی

بہاولپور میں نواب بہاولپور کے عباسی خاندان ہی کا سیاست میں طوطی بولتا ہے۔ اس حلقے سے اس سے قبل عباسی خاندان کے ایک اہم رکن طارق انور عباسی صاحب چار مرتبہ منتخب ہو چکے تھے۔ انھیں عباسی خاندان کے علاوہ مقتدر طبقات کی حمایت بھی حاصل تھی۔ شیخ صاحب نے اللہ کا نام لے کر اپنی انتخابی مہم شروع کی اور جلسوں کے علاوہ گھر گھر جا کر انفرادی ملاقاتیں بھی کیں۔ شیخ صاحب کا خاندان غیر معروف نہیں، جانا پہچانا ہے۔ ڈاکٹر سید وسیم اختر صاحب نے بھی صوبائی اسمبلی کا انتخاب دو مرتبہ شہر کی نشست سے جیتا تھا، ان کے لیے بھی خیر سگالی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں تھے۔ جماعت کے کارکنان نے خوب محنت و لگن کے ساتھ کام کیا۔ جب نتائج سامنے آئے تو لوگ حیران رہ گئے کہ اتنی بڑی قد آور شخصیت ایک نو وارد کے مقابلے پر شکست سے دوچار ہو گئی ہے۔

پہلا اور آخری معرکہ

شیخ عبدالوحید صاحب ہر معاملے میں اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے تھے۔ ان کی امیدیں قلیل اور ارادے جلیل تھے۔ یہ پہلا اور آخری سیاسی معرکہ تھا جس میں یوسی کے ناظم منتخب ہو گئے اور اعلان کیا کہ وہ یوسی کے تمام لوگوں کی بلا امتیاز خدمت کریں گے اور انصاف کا دامن کبھی نہ

Marfat.com

چھوڑیں گے۔یوسی ناظم کی حیثیت سے وہ ضلع کونسل کے بھی کونسلر تھے۔اپوزیشن میں ہونے کے باوجودان کی ذہانت ودیانت اور قابلیت وصلاحیت نے اپنالوہامنوالیا۔وہ سب سے اہم ضلعی کمیٹی یعنی مالیاتی کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے۔اپنی یو۔سی میں ترقیاتی کاموں کے علاوہ پورے ضلع کے لیے بھی انھوں نے بہترین پیکج تیار کیے۔لوگ اب تک ان کو یاد کرتے ہیں۔میں نے کہا کہ یہ پہلا اور آخری سیاسی معرکہ تھا، پہلا تو تھا ہی، شیخ صاحب کی اچانک وفات نے مہلت ہی نہ دی کہ دوبارہ معرکے میں اتر سکتے۔یوں یہی آخری بھی ثابت ہوا ورنہ ان کے لیے میدان کھلا تھا اور اس میں گنجایش بھی کافی تھی۔

محبت و بے تکلفی

شیخ صاحب نے محض سیاسی میدان ہی میں پیش رفت نہیں کی، بہت جلد جماعتی تنظیم میں بھی اہم منازل طے کیں۔ بہاولپور شہر کے امیر ۲۰۰۶ء میں مقرر ہوئے۔صوبائی اور مرکزی مجلس شوریٰ کے ضمنی انتخاب میں بتدریج ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۰ء میں رکن منتخب ہوئے اور پھر ۲۰۰۸ء سے لے کر ۲۰۱۲ء تک ضلع بہاولپور کے امیر بھی رہے۔ جب بھی کسی ذاتی کام سے یا تنظیمی اجلاسوں میں شرکت کے لیے لاہور آنا ہوتا تو اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ فون مجھے یا داؤ دمیاں کو دیتے۔اتنی بے تکلفی اور اپنائیت تھی کہ فرماتے، فلاں دن کا ناشتہ یا فلاں دن فلاں وقت کا کھانا میں بھی، میرا ڈرائیور اور میرا ساتھی بھی، (اگر کوئی ساتھ ہوتا) آپ کے ساتھ کھائیں گے۔ان کے اس پیغام سے مجھے بے پناہ مسرت ہوتی کیوں کہ اس میں بے پناہ اپنائیت کا اظہار ہوتا تھا۔ جب بھی اس عرصے میں کبھی میرا بہاولپور جانا ہوا انھوں نے اپنے گھر پر قیام وطعام کا انتظام کیا۔

نازک ذمہ داری اور اجر

شیخ صاحب کی اہلیہ بیگم عبدالوحید کا تعلق ملتان سے ہے۔ ہماری یہ بہن بھی تحریک کا ایک اثاثہ ہے۔جدہ میں بھی تحریک سے وابستہ تھیں اور پاکستان میں بھی تحریکی پروگراموں میں بھرپور حصہ لیتی ہیں۔شیخ صاحب اور ان کی اہلیہ ایک مثالی میاں بیوی تھے۔بیگم عبدالوحید کچھ عرصہ قبل بیمار پڑیں تو شیخ صاحب نے ان کے علاج ومعالجے اور دل جوئی کا حق ادا کیا۔محترمہ نے بھی زندگی بھر

Marfat.com

شیخ صاحب کے ہر پروگرام اور منصوبے میں بھرپور تعاون کیا۔اب اللہ کی رضا سے جو مرحلہ ان پر آن پڑا ہے، اس میں بھی بڑے صبر وتحمل اور حکمت وتدبر کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ ہماری بہن کو ہمیشہ اپنا سایۂ رحمت عطا فرمائے اور ان کی مشکلات کو آسان فرمادے۔ذمہ داری بھاری اور نازک ہے اور بچوں کی اچھی تربیت کا صلہ بھی بہت عظیم ہے۔ہم اپنے گھر میں اکثر اس خاندان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

راہِ حق کا پرعزم راہی

اللہ تعالیٰ نے شیخ صاحب کو اچھی صحت دی تھی مگر آخر میں دل کا عارضہ لاحق ہوا، شیخ صاحب اس کا علاج معالجہ کراتے رہتے تھے۔اسی بیماری کے دوران ایک مرتبہ کسی اہم اجلاس کے لیے لاہور آنا تھا۔اپنی بیماری کے پیشِ نظر وہ بالائی نظم سے معذرت بھی کردیتے تو مناسب تھا، مگر شیخ عبدالوحید صاحب رخصت کی بجائے عزیمت کی راہ پر گامزن تھے۔ان کے بیٹے عزیزم سلمان شیخ نے ان کی رحلت کے بعد میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ابو نے نہ کبھی ڈانٹا نہ کبھی کوئی سزا دی البتہ زندگی میں ایک واقعہ مجھے یاد ہے جب مجھے بھی ان کی سخت ڈانٹ سننا پڑی۔ہوا یوں کہ ابو اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود ایک اجلاس میں شرکت کی خاطر لاہور جانے کے لیے تیار ہوئے تو سب اہل وعیال نے ان کو لاہور جانے سے منع کیا۔میں نے ذرا زیادہ اصرار سے منع کیا۔اس وقت تو ابو نے کچھ نہ کہا مگر گھر سے باہر نکل کر راستے میں سخت ڈانٹا اور فرمانے لگے: ''میں کوئی بستر پر گرا ہوا معذور اور اپاہج ہوں، کمزوری کے باوجود ٹھیک ٹھاک چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہوں۔اللہ کے راستے میں نکلنے کی سکت ہو اور آدمی عذر تراش کر گھر میں بیٹھ جائے تو کیا یہ اچھا ہوتا ہے؟ صحت و بیماری، زندگی و موت سب اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔جب آدمی بے بس ہوجائے تو اللہ بھی اس کے عذر کو قبول فرماتا ہے مگر آدمی جب اچھا بھلا ہو تو اسے بھی اللہ کے ساتھ کیا ہوا عہد نبھانا چاہیے۔''

پھول اور کلیاں

شیخ صاحب کو اللہ رب العالمین نے خوب صورت گھریلو ماحول دیا۔اچھی رفیقۂ حیات سے نوازا۔ان کے آنگن میں خوب صورت پھول اور خوشنما کلیاں کھلیں اور وہاں باغ و بہار کے مزے

Marfat.com

لوٹتے رہے۔اب اللہ ان کو جنت کے باغوں میں خوش وخرم رکھے۔ چار بیٹیاں اور دو بیٹے عطا فرمائے۔ان کا بڑا بیٹا سلمان بہت کم عمر ہے مگر انتہائی سنجیدہ، سلجھا ہوا اور سمجھدار بچہ ہے۔اس پر بھی اپنی والدہ محترمہ کی طرح بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے۔اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔اس کے تایا، چچا اور دادا ابو ماشاء اللہ سلامت ہیں۔اللہ ان سب کو بھی حقِ سرپرستی ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔دو بہنیں عزیزم سلمان سے بڑی ہیں، دو ان سے چھوٹی اور رضوان بیٹا سب سے چھوٹا ہے۔شیخ صاحب کی بڑی صاحبزادی قائداعظم میڈیکل کالج بہاولپور میں ایم بی بی ایس کے آخری سال میں ہے جبکہ اس سے چھوٹی بہن انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم بی اے کر رہی ہے۔سلمان نے گذشتہ سال ایف ایس سی کا امتحان شیخ صاحب کی زندگی ہی میں پاس کرلیا تھا۔اس نے اگرچہ فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی مگر شیخ صاحب کی رائے تھی کہ نمبر مزید بہتر بنانے اور پوزیشن امپرووکرنے کی ضرورت ہے۔چنانچہ آگے کی کلاس میں داخل کروانے کی بجائے اسے شیخ صاحب نے یہی تلقین فرمائی کہ وہ ایف ایس کے امتحان کا اعادہ کرے۔سلمان سے چھوٹی دونوں بہنیں بھی زیرِ تعلیم ہیں اور ان میں سے بڑی نے شیخ صاحب کی تمناؤں کے مطابق اللہ کی رحمت اور اس کے فضل وکرم سے قرآن مجید مکمل حفظ کرلیا ہے۔یہ بیٹی کے لیے بھی اعزاز ہے اور اس کے والدین کے لیے بھی بلندی درجات کا ذریعہ ہے۔ رضوان بھی شیخ صاحب کی خواہش کے مطابق قرآن حفظ کر رہا ہے۔ان کی وفات کے وقت آٹھ پارے حفظ کرلیے تھے، اب ماشاء اللہ اس کے نو پارے ہو چکے ہیں۔اللہ تعالیٰ اسے بھی اس سعادت میں اس کی بہن کی طرح کامیابی عطا فرمائے۔

شیخ صاحب کی کمی احباب شدت سے محسوس کرتے ہیں۔پھر اہل وعیال کے لیے تو یہ غم کا پہاڑ ہے۔اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازے۔اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہمارے بھائی کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور لغزشوں کو معاف فرما کر جنت الفردوس میں ان کا ٹھکانہ بنادے۔آمین یارب العالمین۔

Marfat.com

ظفر محمد چودھری

(۱۹۳۹ء-۲۰۱۲ء)

راچڈیل (یوکے) میں مقیم جماعت اسلامی اور یوکے اسلامک مشن کے رکن اور میرے ذاتی دوست اور بھائی ظفر محمد چودھری ۱۴ رنومبر ۲۰۱۲ء کو داغِ مفارقت دے گئے۔ برطانیہ سے مولانا محمد اقبال صاحب نے ان کی وفات کی اطلاع دی تو دلی صدمہ ہوا کہ ایک از حد مخلص اور لوجہ اللہ محبت کرنے والا ساتھی بچھڑ گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے، مرحوم کو اپنے مقرب بندوں میں شامل کرے، نیکیوں کو شرفِ قبولیت بخشے اور غلطیوں کو معاف فرمائے۔ اے رب رحمان ورحیم، غفور وحلیم، اپنے بندے سے حسابِ یسیر کا معاملہ فرمانا۔ تو بہت رحم فرمانے والا ہے۔

عجوباتِ زمانہ

ظفر محمد چودھری صاحب کا تعلق ہمارے گاؤں سے متصل بڑے گاؤں جوڑا سے تھا۔ وہ آج سے تقریباً پینتالیس سال قبل پاکستان سے برطانیہ منتقل ہو گئے تھے۔ انھوں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ علاقے کا معزز خاندان تھا اور اس کے ساتھ وہ عجوباتِ زمانہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ان کے ایک چچا (اور سسر) حافظ محمد نسیم مرحوم بہت جیّد دیوبندی عالمِ دین، صحیح العقیدہ مسلمان اور حاذق حکیم تھے۔ بہت اچھے زمیندار اور کاشتکار بھی تھے۔ ان کے آٹھ بیٹوں میں سے پانچ بیٹے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اچھے مناصب پر فائز اور زندگی کی تمام آسائشوں سے بہرہ ور تھے مگر ان کے نقشِ قدم پر ان میں سے کوئی بھی مکمل طور پر نہ چلا۔ چند ایک تو دینِ اسلام اور قرآن کے بارے میں بھی تشکیک کا شکار تھے جبکہ بعض نماز روزے اور حج کی حد تک عملی مسلمان تھے مگر ان کے شب و روز

Marfat.com

میں بھی حافظ صاحب کا رنگ ناپید تھا۔ حافظ صاحب صاحبِ علم بھی تھے اور عقائد کے لحاظ سے بہت پکے موحّد بھی مگر انھوں نے اپنی بستی، برادری اور اہل وعیال میں منظم دعوت وابلاغ کا کام نہیں کیا تھا۔ منطق اور فلسفہ کے ساتھ حکمت وطبِ یونانی بھی ان کے خاص شعبے تھے۔ مگر انھوں نے کوئی باقاعدہ درس قائم کیا نہ طب کی پریکٹس کی۔ میرے بزرگان نے بھی ان سے ذاتی طور پر کچھ علوم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ بچپن میں میرے علاج معالجے کے لیے بھی محترم حافظ صاحب سے ہمارے بزرگان رابطہ کیا کرتے تھے، ان کی تجویز کردہ دوائیں بڑی کڑوی ہوتی تھیں، میرے لیے ان کو استعمال کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔

باہمی تعلقات

ظفر صاحب کے والد مرحوم میاں محمد حکیم صاحب کٹر بریلوی اور عرس ونیاز کے زبردست حامی تھے۔ ظفر صاحب کے ماموں میاں فضل کریم مرحوم جماعت اسلامی کے رکن اور بہت جرأت مند مردِ مجاہد تھے۔ خاندان کا ہر فرد اپنے اپنے میدان کا شاہ سوار تھا، باصلاحیت وذہین! ہمارے خاندان کے ساتھ ان کے شروع ہی سے بہت اچھے دوستانہ تعلقات تھے جو اب تک قائم ہیں۔ ظفر صاحب کے برادر نسبتی ماسٹر محمد حلیم صاحب سکول میں میرے استاد تھے۔ ان کے ایک دوسرے برادر نسبتی ڈاکٹر محمد ریاض (حال مقیم امریکہ) بھی میرے بچپن کے سکول فیلو اور دوست تھے۔ حافظ محمد نسیم صاحب میرے تایا جان اور والد صاحب کے استاد تھے۔ ہماری اور ان کی زمینوں کی سرحدیں بھی ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور کھیتوں پر موسم کے مطابق کام کے دوران بزرگوں کے درمیان پرلطف مجلسیں بھی منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان میں بہت سے علمی نکات اہل ذوق کو سننے کو مل جاتے تھے۔

عرس ونیاز اور دعوت انقلاب

ظفر محمد صاحب عمر میں مجھ سے چھ سات سال بڑے تھے۔ وہ اپنے تین بھائیوں میں منجھلے تھے۔ ان کی تین بہنیں تھیں، ایک ان سے بڑی اور دو چھوٹی۔ ظفر صاحب اپنے ماموں میاں فضل کریم کی وساطت سے، اپنے دورِ طالب علمی میں جماعت اسلامی کی دعوت سے متاثر ہوئے۔ ان

Marfat.com

کے ماموں میاں فضل کریم مرحوم کی کاوشوں کا بھی بلاشبہ اس میں بڑا عمل دخل تھا مگر ظفر صاحب کی ذاتی سلامت روی بھی اس کا ایک عامل تھی۔ ظفر صاحب کی اس تحریکی سوچ اور انقلابی فیصلے کی وجہ سے ان کے والدین اور دیگر اہلِ خاندان ان سے شروع میں تو نالاں تھے۔ پھر مخالف ہو گئے اور ظفر صاحب کی استقامت کے سبب یہ مخالفت شدت اختیار کرتی گئی۔ ان کے والد ویسے بہت حلیم الطبع تھے مگر اس معاملے میں ہرگز نرمی دکھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ ہر سال اپنے آبائی قبرستان میں ایک عرس کرایا کرتے تھے۔ اس میں مولانا محمد عمر اچھروی، پیر سید ولایت شاہ، فضل شاہ اور ان جیسے دیگر معروف بریلوی علماء و مناظر دھواں دھار تقاریر کرتے۔ ان سب کا روئے سخن وہابیوں کی طرف ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے دیہات میں کوئی سلفی یا اہلِ حدیث نہ تھا، البتہ ہمارے بزرگ دیوبندی مکتبِ فکر کے حامی تھے اور حافظ محمد نسیم مرحوم کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ وہ بھی پکے مواحد تھے مگر اپنی ذات کی حد تک۔ ہمارے بزرگان با قاعدہ دعوت وابلاغ کے ذریعے اپنے خیالات وعقائد کا پرچار کرتے تھے۔ اس کی بدولت اللہ کے فضل سے ہمارے گاؤں اور دیگر دیہاتوں میں بھی عوام کے عقائد میں بہت تبدیلی آئی، بدعات وشرک کی جگہ توحید وشریعت پر عمل ہونے لگا۔ یہ بات نذر و نیاز پر دارو مدار رکھنے والے طبقات کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ہمارے بزرگان بعد میں جماعت اسلامی میں چلے گئے۔ ہمیں مستقل طور پر وہابی سمجھا جاتا تھا۔

جذباتِ تشکر

بچپن میں ہم اکثر وہابیت کے یہ طعنے سنا کرتے تھے۔ میرے ہم عمر بعض عزیز تو اس کا برا مناتے تھے مگر میں محظوظ ہوا کرتا تھا۔ میں اکثر اپنے ہم جولی و ہم عمر بریلوی لڑکوں کو کہتا کیا تم وھاب کے منکر ہو حالانکہ قرآن میں پڑھتے بھی ہو ''اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ'' تو ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا کرم تھا کہ ہمارے خاندان کا اپنے علاقے میں بہت زیادہ اثر ورسوخ اور ہمارے بزرگوں کا بڑا رعب تھا، اس وجہ سے اس طوفان کے باوجود عام لوگ ہماری بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ بعض علما عرس کے شرکا سے ہاتھ کھڑے کروا کے عہد لیتے تھے کہ وہابیوں سے حقہ

Marfat.com

پانی اور علیک سلیک بند کر دو۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ لوگ وہاں ہاتھ بھی کھڑے کرتے اور جلسہ سننے کے بعد جب اپنے اپنے دیہات کو جا رہے ہوتے اور ہمارے گاؤں کے پاس سے گزرتے ہوئے ہماری حویلی کے قریب پہنچتے تو حسبِ معمول جھک کر بزرگوں کو سلام کرتے۔ ماشاء اللہ! یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا جس پر میں ہمیشہ حضورِ حق میں جذباتِ تشکر پیش کرتا ہوں۔

منبر و محراب کا کردار

ظفر محمد صاحب کے ماموں میاں فضل کریم چک نمبر ۵ بھلوال میں اپنی الاٹ شدہ زمینوں پر چلے گئے تھے مگر اپنے گاؤں میں بھی باقاعدگی سے آتے رہتے تھے اور کئی ہفتے بلکہ بعض اوقات کئی مہینے یہاں ان کا قیام رہتا تھا۔ یہاں بھی ان کی کچھ زمین تھی۔ یہ دونوں ماموں بھانجا عرس کے نام پر منعقدہ یہ جلسے ہمارے ہاں ہمارے بزرگوں کے ساتھ بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مساجد میں ابھی لاؤڈ سپیکر نہ آئے تھے، البتہ جلسوں کے لیے ان کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ اب تو حالات خاصے بدل چکے ہیں۔ ہر مسجد میں لاؤڈ سپیکر ہے۔ بعض مساجد میں تو اس کا مثبت اور مفید استعمال ہوتا ہے جبکہ اکثر میں محض شور و ہنگامہ اور لایعنی اعلانات کا اودھم ہی سنائی دیتا ہے۔ منبر و محراب اگر اپنا صحیح کردار ادا کرنے لگیں اور وہاں سے کلمۂ حق بلند کیا جاتا رہے تو شیطانی میڈیا اور فحاشی و عریانی کا پرچار کرنے والے ذرائع ابلاغ کا توڑ ممکن ہے۔ بدقسمتی سے یہاں سے اختلافی امور کو اچھالا جاتا ہے، یا پھر لایعنی سروں کے ذریعے لوگوں کی سمع خراشی کی جاتی ہے۔ اگر تمام مسجد سے محض سادہ ترجمہ قرآن مجید، کسی بھی عالم دین کا کیا ہوا، پڑھ کر سنایا جائے تو معاشرے میں بڑی تبدیلی آ جائے گی۔ کاش کوّے اور ہنس کی کہانیوں کی جگہ کوئی سنجیدہ موضوعات اہلِ منبر و محراب کی توجہ کا مرکز بن سکیں!

ابتلا اور استقامت

ظفر صاحب کے جماعت اسلامی میں آنے کی وجہ سے ان پر شدید ابتلا آیا۔ انھوں نے اسے صبر و استقامت سے برداشت کیا اور مستقل مزاجی سے اپنی راہ پر چلتے رہے۔ اس عرصے میں ایک آدھ بار ان پر یہ ذہنی دباؤ اتنا شدید ہوا کہ وہ ڈیپریشن کا شکار بھی ہوئے۔ ایمان کی دولت اور

Marfat.com

یقین کی قوت سے وہ اللہ سے دعائیں مانگتے تھے کہ وہ انھیں دلجمعی اور یک سوئی کے ساتھ اس راہ پر چلنے کی توفیق بخشے۔ الحمدللہ ان کی دعائیں اللہ نے قبول فرمائیں اور وہ اس کیفیت سے نکل آئے۔ ظفر صاحب ایک سکول میں ٹیچر بھی رہے اور کچھ عرصہ جماعت اسلامی ضلع گجرات کے ضلعی دفتر میں ہمہ وقتی کارکن کے طور پر بھی ملک محمد شریف مرحوم کے ساتھ کام کیا۔ بعد کے ادوار میں بھی مرحوم اپنے ان ایام کا تذکرہ بڑے ذوق وشوق سے فرمایا کرتے تھے۔ وہ جماعت کے بزرگان کے لیے ہمیشہ رطب اللسان رہے۔

اہل وعیال

ظفر محمد صاحب کی شادی ان کی چچازاد، حافظ محمد نسیم مرحوم کی صاحبزادی، رشیدہ نسیم کے ساتھ ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد وہ ۱۹۶۷ء میں جرمنی، بیلجیم اور پھر برطانیہ چلے گئے۔ برطانیہ آکر انھوں نے یوکے اسلامک مشن کے ساتھ کام شروع کیا اور جلد ہی اس کے رکن بن گئے۔ بیرون ملک سفر سے تھوڑا ہی عرصہ قبل وہ جماعت کے رکن بنائے گئے تھے۔ اس عرصے میں روزی کمانے کے لیے وہ مختلف سرکاری محکموں اور نجی اداروں میں بھی کام کرتے رہے۔ اللہ نے ظفر صاحب کو اولادِ صالح سے نوازا۔ پہلی شادی سے ان کے دو بیٹے امتیاز ظفر اور اعجاز ظفر اور دو بیٹیاں ربیعہ ظفر اور عمیرہ ظفر تھیں۔ ان کی اہلیہ آپا رشیدہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئیں اور ۱۹۸۰ء کے آغاز میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ آپا رشیدہ کی وفات کے چند ماہ بعد ظفر صاحب نے دوسری شادی بھی اپنے گاؤں اور اپنی برادری میں کی۔ ان کی دوسری اہلیہ آپا مقصودہ تحریکی کاموں میں ظفر صاحب کی ہمنوا اور مکمل طور پر مؤید ومعاون تھیں۔ دوسری بیوی سے ظفر صاحب کو اللہ نے دو بیٹے افراز ظفر اور اعتزاز ظفر اور ایک بیٹی مدیحہ ظفر سے نوازا۔ ماشاءاللہ یہ سبھی بچے چار بیٹے اور تین صاحبزادیاں اپنے باپ کی امیدوں پر پورے اترے اور ان کی فکر کو پوری طرح اپنایا۔ اللہ سب کو سلامت رکھے۔

برطانیہ کا قیام

ظفر صاحب کے بیرون ملک جانے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی میاں محمد

Marfat.com

آصف جوان کے ماموں میاں فضل کریم کے داماد ہیں، انگلستان میں بسلسلہ تلاش معاش مقیم تھے۔ ظفر صاحب گھریلو حالات کی وجہ سے ذہنی تناؤ و معاشی مشکلات کا شکار تھے۔ میاں فضل کریم صاحب نے آصف کو متوجہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کے لیے باہر جانے کی کوئی سبیل نکالے۔ آصف صاحب کی کاوش سے ظفر صاحب ۱۹۶۷ء میں جرمنی چلے گئے۔ یہ ٹرانزٹ سفر تھا۔ یہاں وہ چند ہفتے مقیم رہے پھر چار ہفتے کے لیے بیلجیم کا ویزہ مل گیا۔ بیلجیم سے آصف صاحب نے اپنے بعض دوستوں کی وساطت سے انھیں برطانیہ بلوالیا مگران کے کاغذات اور قیام کو باقاعدہ قانونی شکل دینے میں مزید چار سال لگ گئے۔ ۱۹۷۱ء میں انھیں باقاعدہ یو کے میں رہائش کے حقوق مل گئے۔ قواعد کے مطابق چند سالوں بعد ان کو یہاں کی شہریت بھی مل گئی۔ پہلے چار سال کے عرصے میں بھی انھوں نے مختلف پرائیویٹ اداروں اور فرموں میں کام کیا۔ کاغذات درست ہونے کے بعد انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی پاکستان سے برطانیہ بلوالیا اور یوں وہ سبھی بھی برطانوی شہریت حاصل کرنے کے اہل ہو گئے۔

مقامی جماعت اسلامی

برطانیہ آتے ہی ظفر محمد صاحب نے پہلا کام یہی کیا کہ یو کے اسلامک مشن کے ساتھ وابستگی اختیار کی۔ جماعت اسلامی کے رکن تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ مشن کے رکن بھی بن گئے۔ پہلے نیلسن میں مقیم تھے، پھر راچڈیل چلے گئے اور آخر دم تک یہیں مقیم رہے۔ راچڈیل میں مشن کی دو مساجد ہیں۔ نیلی مسجد تو ایک عظیم الشان مسجد ہے۔ اس کی تعمیر و ترقی میں دیگر ساتھیوں کی طرح ظفر صاحب کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ظفر صاحب خود کبھی اس کا تذکرہ نہیں کرتے تھے مگر ان کے جاننے والے بیان کرتے ہیں کہ انتہائی نامساعد حالات اور معاشی مشکلات کے باوجود جب انگلستان میں ان کو پہلی تنخواہ ملی تو ساری رقم جماعت اسلامی ضلع گجرات کو روانہ کر دی۔ بعد میں بھی ان کا یہ سلسلۂ اعانت مسلسل جاری رہا۔ وہ اپنے گاؤں میں مقامی جماعت کے رکن تھے، جس کے امیر میرے والد گرامی میاں فیض محی الدین مرحوم تھے۔ کافی عرصے تک ہمارے گاؤں کی مقامی

Marfat.com

جماعت چار ارکان پر مشتمل رہی۔ میرے والد گرامی قدر، دو میرے ماموں صاحبان اور ظفر محمد صاحب۔ ظفر صاحب بیرون ملک مقیم ارکان میں شمار ہوتے تھے۔ چاروں ارکان کے درمیان اس قدر محبت تھی کہ اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں مل سکے گی۔ والد صاحب کے ساتھ ظفر صاحب کو اس قدر محبت بلکہ عقیدت تھی کہ جب بھی ان کا تذکرہ کرتے یہ بات ضرور کہتے کہ مشکل ایام میں انھوں نے مجھے والدین کی طرح محبت و سرپرستی سے نوازا۔ والد صاحب اپنے اس طرح کے ساتھیوں سے تعاون کیا کرتے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ بعض اوقات ہماری ضروریات پر بھی ان کی ضروریات کو ترجیح دیتے تھے۔ ہمیں اس وقت احساس نہ ہوتا تھا کہ وہ کس قدر قابلِ تحسین کام کر رہے ہیں۔

انکسار و متانت

ظفر صاحب کی طبیعت میں کبھی شوخی اور شیخی داخل نہ ہوسکی۔ وہ سادہ مزاج، منکسر، متحمل اور صابر و متین شخصیت کے حامل تھے۔ والد صاحب کو اعانت جماعت کے لیے رقوم بھجواتے تو اس کا بھی ضرور تذکرہ کرتے کہ آپ لوگ تو طوفانوں کا مقابلہ کر رہے ہیں، ہم تو گوشۂ عافیت میں بیٹھے بس یہی کچھ کرسکتے ہیں کہ کچھ مالی اعانت بھجوادیں۔ واجپائی کی آمد پر میرے ساتھ والد محترم بھی گرفتار ہوئے تھے۔ اس موقع پر ظفر صاحب کو بہت زیادہ پریشانی ہوئی مگر جب میں نے ان کو رہائی کے بعد خط بھیجا اور حالات بیان کیے، نیز والد صاحب کے ایمان افروز انٹرویو کی تفصیلات لکھیں تو بہت اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اپنی داستانِ اسیری پر مشتمل کتاب ''اسیرانِ روشن خیالی'' بھیجی تو اسے پڑھ کر بہت دعائیں دیتے رہے۔

گھریلو ذمہ داریاں

ظفر صاحب کو مختلف بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ ان کو دل کا عارضہ بھی تھا، گردے دونوں ناکام ہوچکے تھے اور کبھی کبھار ڈیپریشن کے حملے بھی ہوتے تھے مگر وہ انتہائی صابر و شاکر بندے تھے۔ ان کی پہلی اہلیہ آپا رشیدہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوئیں تو بڑے غم زدہ ہوئے۔ بچے ابھی چھوٹے ہی تھے مگر بڑے سمجھدار اور صابر تھے۔ ظفر صاحب بچوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں

Marfat.com

خاصے فکر مند تھے۔ انھوں نے احباب سے مشاورت کے بعد اپنی ہی برادری میں دوسری شادی کی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، ان کی دوسری اہلیہ آپا مقصودہ بڑی اچھی اور تعاون کرنے والی خاتون ہیں۔ انھوں نے گھر کے جملہ امور کو سلیقے سے سنبھالا۔ اس دوران پہلے بچوں اور بچیوں کی شادیاں بھی ہوگئیں اور الحمد للہ وہ سب اپنے گھروں میں آباد اور خوش وخرم زندگی گزارنے لگے۔ ظفر صاحب کے لیے یہ بات بہت اطمینان کا باعث تھی۔ ان کے چھوٹے بچے بھی الحمد للہ اب شادی شدہ اور خوش وخرم ہیں۔

رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے

ظفر محمد چودھری صاحب لڑکپن ہی سے نہایت سنجیدہ، شریف النفس اور کم گو تھے۔ جب تحریک سے متاثر ہوئے تو تحریکی امور و معاملات پر بات چیت شروع ہوتی تو نہایت کھل کر اظہارِ خیال کرتے۔ ہمارے ہاں تشریف لاتے تو کئی مرتبہ رات کا قیام بھی وہیں ہوتا۔ والد صاحب ان کے مشکل زمانے میں ان پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور ہمیں بھی ان کی دلجوئی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ظفر محمد چودھری صاحب کے والد کے پاس جو موروثی زرعی رقبہ تھا اسے انھوں نے بیچنا شروع کیا تو ان کے کئی خیر خواہوں نے ناصحانہ مشورہ دیا کہ وہ ایسا نہ کریں، اگر ساری زمین بک گئی تو اگلی نسلیں کیا کریں گی۔ مگر وہ فرماتے کہ اگلی نسلوں کا اللہ خود انتظام کردے گا۔ ان کے اخراجات بہت تھے اور ذریعہ آمدن وہی زرعی زمین تھی جس سے اخراجات کا پورا کرنا محال تھا۔ کچھ زمین بیچ کر انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے میاں محمد آصف کو برطانیہ بھجوا دیا۔ یوں کچھ آمدن ہونے لگی مگر اخراجات سے وہ بھی کم تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً ساری زمین بک گئی۔ اگلی نسلوں کا واقعی اللہ نے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ تنگ دست نہیں خوشحال ہیں، پاکستان میں نہیں یورپ اور امریکا میں ہیں۔

مرشد مودودی کا فیضان

ظفر محمد صاحب جب ایک مرتبہ برطانیہ سے واپس پاکستان آئے تو میں بھی ان دنوں کینیا سے

Marfat.com

پاکستان آیا ہوا تھا۔ بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ اپنے یہاں کے حالات تفصیل سے بیان کیے اور مجھ سے کئی سوالات پوچھے۔ پھر فرمایا کہ تحریکی اخبارات و رسائل میں آپ کی بعض تحریریں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ اس طرح آپ کے حالات کا کچھ پتہ تو چلتا ہے مگر اسلامک فاؤنڈیشن نیروبی کا جس قدر تذکرہ سنا ہے اس کے مطابق معلومات میرے پاس نہیں ہیں۔ جب میں اور میاں محمد روشن [ان کے گاؤں کے ایک بزرگ جو جماعت اسلامی کے عظیم جاں نثاروں میں سے تھے] برطانیہ میں اپنے ساتھیوں کے سامنے آپ کا تذکرہ کرتے ہیں اور آپ سے اپنے تعلق کا فخریہ اظہار کرتے ہیں تو وہ ہم سے کئی ایک سوالات پوچھتے ہیں۔ بیشتر سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہمارے مرشد و مربی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مختلف جغرافیائی خطوں میں جو مراکز قائم کیے ہیں ان میں سے یہ مرکز سرزمین افریقہ کو سیراب کر رہا ہے۔ مگر معلومات میں تشنگی ہے۔ ظفر صاحب کا اوڑھنا بچھونا ہی تحریک اسلامی تھی۔ مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں کئی مرتبہ بھٹکا ہوں مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہر مرتبہ اپنی خصوصی رحمت سے مجھے جلد ہی سہارا دیا اور میں پھر راستے پر آ گیا۔ یہ تحریک کی برکات اور مرشد مودودی کے لٹریچر کا فیضان ہے۔

باہمی مزاح

جب میں نے فاؤنڈیشن کے منصوبوں کا تفصیلی تذکرہ کیا تو بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ "ہمارے پاس برطانیہ میں جس قدر وسائل ہیں ان کے تناسب سے شاید ہمارا کام بہت اطمینان بخش نہیں ہے"۔ میں نے کہا، "یہی سوچ مثبت ہوتی ہے کہ اپنے کام کو کمتر جانا جائے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں پیش رفت جاری رکھی جائے۔ جب کوئی تحریکی کارکن اپنی کارکردگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے تو اچھا بھلا کام بھی زوال پذیر ہونے لگتا ہے۔" ظفر صاحب بہت کم مزاح کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھار ان کی بھی رگِ مزاح پھڑک اٹھتی تھی۔ فرمانے لگے، "ابھی سے ایسی بزرگانہ باتیں شروع کر دی ہیں، اللہ خیر ہی کرے۔" میں نے کہا کہ "یہ صحبتِ ہم نشین کا اثر ہے ورنہ میں کہاں اور عقل و دانش و بزرگی کہاں"۔

Marfat.com

حسرت

ظفر صاحب ان دنوں ہر روز ہمارے ہاں آیا کرتے تھے اور خوب محفل لگتی تھی۔ انھی دنوں میں ایک روز میں اپنے ماموں جان کے ساتھ نماز ظہر کے بعد نکلا اور پروگرام بنایا کہ اپنی فصلوں اور زمینوں کو دیکھ کر آئیں۔ ہماری زمین چار قطعات پر مشتمل ہے۔ ایک قطعہ گاؤں کے بالکل قریب ہے، جبکہ دوسرا شمال کی طرف تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ تیسرا اور چوتھا بتدریج گاؤں سے جنوب مغرب اور جنوب مشرق کی طرف ڈیڑھ ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ ہم شمال کی طرف جا رہے تھے کہ ظفر صاحب بھی اپنے گاؤں کی طرف سے آتے ہوئے نظر آئے۔ جب ہم نے بتایا کہ ہم چہل قدمی کرتے ہوئے کھیتوں کی طرف جا رہے ہیں تو بڑی حسرت سے کہا کھیت کھلیان کا کام ہے تو بڑا مشکل مگر بڑا روح پرور ہوتا ہے۔ ہمارے والد صاحب نے تو یہ قصہ ہی تمام کر دیا ورنہ ہماری زمینیں اور آپ کی زمینیں، شمال اور جنوب دونوں جانب قریب قریب واقع تھیں۔ ظفر صاحب کے معاشی حالات اب اللہ کے فضل سے ایسے تھے کہ انھیں ان زمینوں کی کوئی محتاجی نہ تھی۔ اس کے باوجود ایک حسرت ان کے سینے میں تھی۔ میں نے انھیں تسلی دینے اور ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کرانے کی مقدور بھر کوشش کی اور ماموں جان نے بھی ان کو بہت حوصلہ دیا۔

زمین اللہ کی

میں نے کہا: ”ظفر بھائی! زمین تو اللہ کی ہے۔ بس ایسے ہی وقتی طور پر انسان دعوے کرتا رہتا ہے۔ آخر میں تو دو گز زمین ہی ہر ایک کے حصے میں آنی ہے“ مسکراتے ہوئے ماموں جان سے کہنے لگے، ”حافظ صاحب کو میں نے کل پرسوں بھی یہ کہا تھا کہ بزرگانہ باتیں کر کے رعب نہ ڈالا کریں۔ دیکھیے آج پھر گہری معرفت کی باتیں کر رہے ہیں۔“ ہمارے ساتھ کھیتوں پر گئے اور مغرب کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگے کہ ”وہ گندم کی فصل جو بول کے پرلی طرف نظر آ رہی ہے وہ کبھی ہماری ہوا کرتی تھی، اب فلاں اور فلاں اس کے مالک ہیں۔“ ان ایک آدھ باتوں کے علاوہ اس سارے سفر اور چہل قدمی میں ظفر صاحب

Marfat.com

جماعت، سید مودودیؒ، جماعتی لٹریچر اور جماعت کے دیگر بزرگان بالخصوص ضلعی قائدین، چودھری سلطان احمد، ملک محمد شریف، شیخ ظہور احمد اور شیخ تاج الدین بھنڈاری کے واقعات سناتے اور ایمان افروز تذکرے کرتے رہے۔

ہم دمِ دیرینہ

ظفر صاحب سے برطانیہ میں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جب بھی ان کے گھر جانا ہوا وہ انتہائی خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے۔ آخری سالوں میں صحت اتنی کمزور تھی کہ کہیں جانا آنا موقوف ہو گیا تھا۔ چند سال قبل ایک بار جب میں برطانیہ گیا تو مجھ سے ملنے کے لیے میری قیام گاہ پر ریڈلے نزد نیلسن تشریف لائے، مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا: ''آپ نے بڑی زحمت فرمائی، میں تو راچڈیل آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام طے کر چکا تھا۔'' فرمانے لگے: ''میں آج کل کہیں جاتا آتا نہیں ہوں، اپنی صحت کی وجہ سے مشن کے اجلاسوں سے بھی رخصت لے رکھی ہے۔ مگر ملاقات کو بہت جی چاہا تو میں نے سوچا کہ آپ کی آمد سے پہلے ایک بار میں خود حاضر ہو جاؤں تاکہ ملاقات ایک نہیں دو ہو جائیں'' میں نے اس موقع پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے استاد ذوقؔ کا ایک شعر پڑھا تو بہت لطف اندوز ہوئے اور اس شعر کو دو تین مرتبہ دہرایا:

اے ذوقؔ کسی ہم دمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے!

صاحبِ خیر، داعیِ حق

ظفر صاحب انتہائی مخلص بھائی اور محبت کرنے والے تحریکی ساتھی تھے۔ تحریکی رسائل کے لیے اپنا چندہ بھی باقاعدگی سے بھیجتے اور اپنے بہت سے عزیز و اقارب کے نام بھی پرچے جاری کرانے کے لیے اپنی جیب سے چندے کی رقم ارسال فرماتے۔ میرے والد صاحب کی وفات پر انھوں نے جو خط لکھا اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ یہ بھی تحریر فرمایا: ''مرحوم ہمارے علاقے میں جماعت اسلامی کی پہچان اور تعارف تھے۔ جماعت کے لیے اعانتیں جمع کرنے کی خاطر ہر اس شخص کے

Marfat.com

پاس تشریف لے جاتے تھے جس میں ذرہ بھر بھی خیر اور نیکی کی طرف میلان پاتے تھے۔ ان کے نام بھیجی گئی رقم کا پورا حساب رکھتے تھے اور معطی حضرات کو اس کی تفصیل سے آگاہ فرماتے تھے۔ مجھے اپنا وہ دور اچھی طرح یاد ہے جب وہ میرے ساتھ شفقت و سرپرستی فرماتے اور میں شکریہ ادا کرتا تو فرماتے کہ بھائی یہ میرا دینی و اخلاقی فرض ہے، میں تمھارے اوپر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ میں نے بھی ان کی وساطت سے جماعت کے ساتھ تعاون کرنے کی حتی المقدور ہمیشہ کوشش کی۔ ان کے اٹھ جانے سے آپ ہی محروم نہیں ہوئے بلکہ بہت سے مجھ جیسے کئی لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ان کا بھی ذاتی نقصان ہے۔ اللہ میاں صاحب مرحوم کی نیکیوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور انسان ہونے کے ناطے ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان سے درگزر فرمائے۔"

میں بھی اپنے مرحوم بھائی کے حق میں اللہ کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ ذات بابرکات اُن کو اعلیٰ علیین میں مقامِ رفیع سے نوازے اور جملہ لواحقین کو صبر جمیل کے ساتھ ان کے نقوش پا پہ چلنے کی سعادت بخشے۔

آخری ملاقات

ظفر صاحب سے آخری ملاقات جولائی ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ اس ملاقات کا تذکرہ میں نے "سفرنامہ برطانیہ" میں کیا۔ یہ روداد تحریکی رسائل میں چھپی تو بہت خوش ہوئے۔ میں اگست ۲۰۱۲ء میں بھی برطانیہ میں تھا، ظفر بھائی سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ملاقات کے لیے راچڈیل روانہ ہوا مگر راستے ہی میں آپا مقصودہ کا فون آیا کہ ملاقات ممکن نہ ہو سکے گی کیونکہ ظفر صاحب کی طبیعت اچانک اتنی خراب ہو گئی ہے کہ ہم انھیں ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ اس مرتبہ ملاقات سے محرومی رہی۔ ۲۰۱۱ء کی ملاقات کا جو تذکرہ لکھا تھا اس سے بھی ظفر صاحب کے کچھ احوال کا پتا چلتا ہے۔ وہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

داعیِ حق کی صفات

ہم ۲۵/ جولائی ۲۰۱۱ء بروز پیر، ریڈلے سے دوپہر کو روانہ ہوئے، سب سے پہلے ظفر

Marfat.com

صاحب کے ہاں حاضری تھی۔ مولوی محمد اقبال صاحب اپنی گاڑی میں میرے ساتھ روانہ ہوئے تو خوب صورت علاقے سے گزرتے ہوئے پرلطف گفتگو نے سفر کا مزا دوبالا کر دیا۔ ظفر صاحب کو ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور ہمارے پہنچنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہے تھے۔ ہمیں مل کر بہت خوش ہوئے۔ مولوی اقبال صاحب نے ان کی گلی میں پہنچ کر ایک جگہ گاڑی پارک کی اور ہم ایک جگہ کھڑے ہو کر مکانوں کے نمبر پڑھ رہے تھے کہ دو بوڑھی انگریز خواتین جو اپنے ملحقہ گھروں کے صحن میں ایک دوسری سے گپ شپ کر رہی تھیں، ہمیں دیکھ کر فوراً پکار اٹھیں: ''ڈو یو وانٹ ٹو وزٹ مسٹر ظفر؟ (کیا آپ لوگ ظفر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟)'' ہم نے کہا جی ہاں، تو انھوں نے کہا کہ آپ کی بیک سائیڈ پر پانچواں گھر ان کا ہے۔ یہ بظاہر معمولی سی بات ہے مگر خوشی ہوئی کہ یہاں کا معمول تو یہ ہے کہ عموماً لوگ اپنے دیوار شریک ہمسائے کو بھی نہیں جانتے مگر ظفر صاحب کو گویا پورا محلہ بشمول انگریز آبادی جانتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے داعیِ حق کی جو صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں اپنے گردونواح کے ماحول میں لوگوں سے تعلقات اور خیر سگالی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر ''مرجعِ خلائق'' بننا ناممکن ہے۔ ظفر صاحب نے ملاقات پر اپنی بیماری کا حال بیان فرمایا اور ساتھ ہی کہا کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس کمزوری کے باوجود کچھ کھا پی بھی لیتا ہوں، نیند بھی آ جاتی ہے اور واش روم تک بھی خود چلا جاتا ہوں۔ البتہ اب مطالعہ زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی بستر پر لیٹے لیٹے کچھ نہ کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔

اپنائیت و محبت

ظفر بھائی، صاحبِ ایمان ہیں اور ان حالات میں بھی اللہ نے ان کو بڑا حوصلہ اور دل دیا ہے۔ ان کی ایک اور بہت بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ان کی بیوی اور ساری اولاد ان کی خدمت اور دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔ پچھلے سال پاکستان میں ان کی چھوٹی بیٹی کی تقریب نکاح تھی تو انھوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ ''میں نے اپنی اہلیہ اور بیٹی کو بتا دیا ہے کہ حافظ صاحب میرے نہایت عزیز بھائی ہیں اور میں چونکہ سفر کے قابل نہیں ہوں اس لیے وہاں پر وہ میری نیابت میں میری بیٹی کا نکاح پڑھائیں گے اور اسے رخصت کریں گے۔ پس آپ نے ہر مصروفیت چھوڑ کر یہ کام کرنا ہے۔ اب وہاں آپ ہی اس کے باپ ہیں۔'' میں نے عرض کیا ''ظفر صاحب، آپ کوئی فکر نہ

Marfat.com

کریں۔ آپ کی بیٹی میری بیٹی ہے اور میں ان شاءاللہ آپ کے حکم کی پوری تعمیل کروں گا۔'' یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور مجھے بہت دعائیں دیں۔ میرے لیے تو یہ ایک اعزاز تھا لہٰذا میں عزیزہ کی شادی میں شریک ہوا اور نکاح کے موقع پر ظفر صاحب کے جذبات کا تذکرہ کیا تو ان کے بہت سے عزیز واقارب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ظفر صاحب کی اہلیہ آپا مقصودہ ظفر اور بیٹی سے خصوصی ملاقات ہوئی تو ماں بیٹی اور ظفر صاحب کا صاحبزادہ ڈاکٹر فراز بہت خوش ہوئے۔

[سفر نامہ برطانیہ: ص ۶۱ - ۶۲]

دعا مومن کے لیے نفع بخش

گذشتہ سالوں میں ایک بار برطانیہ کے سفر کے دوران میں ظفر بھائی سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا تو ملاقات پر اپنی کچھ کتب ان کی خدمت میں پیش کیں۔ عزیمت کے راہی جلد اول بھی ان میں شامل تھی۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور کتاب میں شامل مختلف ناموں کو پڑھ کر ان کے متعلق اپنی یادوں کا تذکرہ فرمایا۔ پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگے'' آپ بہت اچھا کرتے ہیں، یہ باتیں ریکارڈ پر لے آتے ہیں ورنہ بعد میں آنے والے ساتھی ان کی شخصیت اور خدمات سے بالکل نابلد رہیں گے۔'' میں نے کہا کہ یہ جانے والے تو اس بات سے بے نیاز ہیں کہ کوئی ان کا تذکرہ کرے یا نہ کرے مگر میں اس لیے یہ مضامین لکھتا ہوں کہ مجھ جیسے کمزور مسافرانِ کارواں کو بھی ترغیب اور حوصلہ ملے اور وہ جانبِ منزل بڑھتے ہیں۔ ظفر بھائی نے کہا'' یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ اپنے تذکرے سے بے نیاز ہیں مگر ان کا ذکرِ خیر پڑھ کر معلوم نہیں کتنے لوگ ان کے لیے دعائیں کرتے ہوں گے، جو بہرحال مومن کے لیے نفع بخش ہوتی ہیں۔'' میں نے کہا، آپ کی یہ بات بالکل درست ہے۔ آج میں ظفر بھائی کے لیے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ اللہ ان کے حق میں ہم سب کی دعائیں قبول فرمائے اور اللہ کرے کہ ہم دنیا سے اٹھ جائیں تو کوئی ہمارے لیے بھی دعا کرنے والا ہو۔

آپا مقصودہ کا خط

ظفر بھائی جان کی وفات پر میں نے ان کی اہلیہ آپا مقصودہ صاحبہ سے فون پر تعزیت کی اور ساتھ ہی ان کو بتایا کہ میں اپنے محبوب دوست اور شفیق بھائی کی زندگی پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ آپ

Marfat.com

بھی کچھ تاثرات بھیج دیں تو ممنون ہوں گا۔آپا جان کا خط مجھے یہ مضمون لکھے جانے کے بعد موصول ہوا۔انھوں نے ۲۶ جنوری ۲۰۱۳ء کو اپنے خط میں جو کچھ لکھا اس کی چند چیدہ چیدہ سطور کو ہم اس مضمون کا حصہ بنا رہے ہیں۔تحریر فرماتی ہیں:

''محترم بھائی جان حافظ محمد ادریس صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بمع اہل وعیال بخیریت ہوں گے۔معذرت چاہتی ہوں کہ جلد خط نہ لکھ سکی۔ظفر صاحب کی وفات کے بعد کچھ دن تو تعزیت کرنے والوں کا آنا جانا لگا رہا۔ذرا فرصت ہوئی تو اپنے تاثرات لکھنے بیٹھی۔بہت سی یادیں دل ودماغ پر حاوی ہو جاتیں۔کوشش کے باوجود طبیعت آمادہ نہیں ہو پاتی تھی۔

ظفر صاحب کے خاندانی پسِ منظر اور حالاتِ زندگی سے تو آپ کافی حد تک واقف ہیں۔ میں یہاں کے حالات اور ان کی بیماری کے بارے مختصراً لکھوں گی۔سب سے پہلے تو میں آپ سے معذرت چاہوں گی، اگر لکھنے میں کچھ غلطی ہو جائے الفاظ اور فقروں کا ربط نہ رہے تو آپ اصلاح فرما دیں، شکریہ۔عرصہ دراز سے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔جب سے فون اور پھر موبائل فون کی سہولت میسر ہوئی ہے، عزیز واقارب سے خط وکتابت کی نوبت نہیں آتی۔خیر اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتی ہوں۔

مخلص رکنِ جماعت

ظفر صاحب نے جب سے جماعت اسلامی کو اپنایا اور اس کے نصب العین کو سمجھا، اس لمحے سے آخر وقت تک اس پر قائم رہے اور ہر طرح کے حالات میں ہمیشہ اپنی جماعت کو سپورٹ کیا۔ بلکہ ان کا جینا مرنا سب کچھ اپنی جماعت کے لیے تھا۔بیوی ہونے کی حیثیت سے میں گواہی دیتی ہوں کہ وہ اپنی جماعت کے بہت ہی مخلص اور ایثار کرنے والے رکن تھے بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی ہمیشہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تلقین کرتے اور الحمدللہ ان کے بچوں نے ان کو کبھی مایوس نہیں کیا!

Marfat.com

اب ظفر صاحب کی بیماری کی کچھ تفصیلات لکھوں گی۔ظفر صاحب عرصہ ساڑھے آٹھ سال گُردوں اور دل کی بیماری میں مبتلا رہے۔الحمد للہ پھر بھی وہ اپنی روزمرہ زندگی آسانی سے گزار رہے تھے۔علاج معالجے کی سہولت میسر تھی، اپنی ادویات بڑی باقاعدگی سے خود ہی استعمال کرتے تھے اور کھانا پینا بھی نارمل رہا لیکن فوت ہونے سے تین ماہ پہلے ان کی حالت بگڑنا شروع ہوئی تو پھر دن بدن بگڑتی ہی چلی گئی۔کبھی گھر،کبھی ہاسپٹل آنا جانا رہا۔

محبِّ مخلص

آپ چند ماہ قبل U.K میں تھے تو آپ نے ان سے ملنے آنا تھا۔میں نے آپ کا بتایا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، بے بسی کے آنسو کیونکہ ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ بات چیت کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔تھوڑی دیر بعد ان کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو ان کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروانا پڑا۔ان کے دل میں یہ بڑی حسرت رہی کہ آخری بار آپ سے ملاقات نہ ہوسکی۔مجھے اکثر کہتے کہ میں نے حافظ صاحب سے دعا کروائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نزع کا وقت آسان کرے۔الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت آسان موت دی۔اللہ کی راہ میں صدقات کرنے والے تھے،اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسانی فرمائی۔ان کی موت حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوئی اور ہمیں بھی پتہ نہ چلا۔یہاں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو مریض ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوتا ہے، جب اس پر آخری وقت آئے تو گھر والوں کو فون کرکے بلا لیا جاتا ہے کہ آپ کا مریض آخری سفر کی کیفیت میں ہے۔لیکن ہوا یوں کہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا اعتزاز ظفر معمول کے مطابق ان کے وزٹ کے لیے گیا تو کہا ''ابو جی السلام علیکم''۔ظفر صاحب آنکھیں بند کیے لیٹے تھے،انھوں نے آنکھیں کھول کر اعتزاز کی طرف دیکھا۔پھر آنکھیں بند کرلیں اور کوئی بات نہیں کی اعتزاز نے پھر پوچھا ''ابو جان کیا آپ سونا چاہتے ہیں؟'' انھوں نے دوبارہ آنکھیں کھول کر اپنے پیارے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر بند کرلیں۔اعتزاز کچھ اندازہ نہ کرسکا۔اس نے فوراً اپنے بھائیوں کو فون کیا کہ ابو جان کی طبیعت کچھ سست لگتی ہے۔

Marfat.com

وفات اور آخری سفر

میں اور اعتزاز سے بڑے دونوں بیٹے اعجاز ظفر اور ڈاکٹر افراز ظفر دس منٹ میں ہاسپٹل پہنچ گئے لیکن ہمارے جانے سے قبل ہی وہ اپنے اللہ کے حضور پہنچ چکے تھے۔ پھر ہم نے ڈاکٹر کو بلایا کہ ان کا چیک اپ کریں۔ ان کا جسم گرم تھا، ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد بیٹوں سے کہا ''مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ اپنے فادر کو کھو چکے ہیں اور ان کی موت کا سبب حرکتِ قلب کا بند ہونا ہے'' وہاں نہ کسی نرس کو خبر، نہ ڈاکٹر کو، کیونکہ ان کا دن بھر کا معمول نارمل تھا۔ نرس نے بتایا صبح ناشتہ بھی کیا اور دوپہر کو کھانا بھی کھایا اور جب میں ساڑھے چار بجے پوچھنے آئی کہ آپ شام کے کھانے میں کیا کھائیں گے، تو انھوں نے کہا آج میں شام کو کچھ نہیں کھاؤں گا مجھے بھوک نہیں۔ اس طرح شام پانچ بجے ۱۴رنومبر ۲۰۱۲ءکو سکون اور خاموشی سے اپنے اللہ کے ہاں چلے گئے۔

ہاسپٹل سے ہی ہم نے سب سے پہلے ان کے نہایت قریبی، قابلِ اعتماد اور تحریکی بھائی ضمیر صاحب کو اطلاع دی۔ وہ فوراً ہی اپنی اہلیہ کے ہمراہ ہاسپٹل پہنچ گئے۔ بچوں کو حوصلہ دیا اور تدفین و جنازے کے سارے معاملات خود سنبھال لیے۔ دوسرے دن ۱۵رنومبر ۲۰۱۲ءکو بعد از نماز ظہر نیلی مسجد میں نماز جنازہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ سب عزیز و اقارب، دوست احباب جنازے پر پہنچ گئے۔ بیٹوں کے بھی بہت سے دوست، دور دراز شہروں سے آئے۔ ورکنگ ڈے ہونے کے باوجود جنازہ میں کثیر تعداد شریک تھی۔ حافظ صاحب! کیا بتاؤں کہ غسل دینے کے بعد ظفر صاحب کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ نیلی مسجد میں تینوں بیٹوں اور تحریکی ساتھی، بھائی ضمیر صاحب نے ان کو غسل دیا۔

تربیتِ اولاد

وہ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں اور سب رشتہ داروں اور دوست احباب کو راہ حق پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے بچے یہاں کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہوئے اور اس گمراہ کن تہذیب میں رہتے ہوئے بھی دینِ حق پر قائم ہیں جو مرحوم

Marfat.com

کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ کئی رشتہ داران سے کہتے تھے آپ کا ستارہ بہت بلند ہے، آپ کے بیوی بچے آپ کے فرمانبردار ہیں جبکہ ہم اپنے اہل وعیال سے اتنی محبت کرتے ہیں لیکن ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ پھر آپ کے بچے پڑھ لکھ کر بہت جلد سیٹل ہو جاتے ہیں۔ ظفر صاحب جواب دیتے تھے ”میں ستاروں پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ مجھ پر میرے اللہ کی کرم نوازی ہے اور میرے اللہ کا یہ وعدہ بھی ہے کہ جو میرے کام میں لگ جاتا ہے میں اس کے کام میں لگ جاتا ہوں۔ فی الواقع میں اللہ کے اسی وعدہ پر یقین رکھتا ہوں۔“ ہم سب نے ان کی بہت خدمت کی اور دل و جان اور دل کی خوشی سے کی۔ اللہ تعالیٰ ہماری ان کاوشوں کو قبول و منظور فرمائے۔

حق پر قائم، صلح جو

بھائی صاحب میں نے اکتیس سال تین ماہ اور چند دن ان کی رفاقت میں گزارے۔ بلاشبہ وہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ حق اور سچ بات کہنے میں کبھی لاگ لپیٹ نہیں کی، نہ ہی لومۃ لائم کا خوف ان کو لاحق ہوا۔ کھل کر جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ نہایت ہی صاف فطرت انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ کے باغی اور دینِ حق سے غافل لوگوں کو کھری کھری سنانے والے اور اپنے تحریکی ساتھیوں کے لیے نہایت مہربان، ہمدرد اور محبت کرنے والے، بلکہ سراپا محبت! بقول اقبال

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

ظفر صاحب اپنی گھریلو زندگی میں بھی کھلے ڈھلے انداز میں رہتے۔ لیے دیئے رہنا ان کی عادت نہیں تھی۔ ہر طرح کے جذبات کا کھل کر اظہار کرتے۔ زیادہ تر ان کی گفتگو کا موضوع اسلام ہی ہوتا مگر کبھی کبھی ہلکی پھلکی بات چیت کرتے اور گفتگو کو خوشگوار بنانے کے لیے شعر و شاعری بھی کرتے تھے۔ اگر کبھی معاملات میں کچھ تلخی پیدا ہو جاتی تو بہت جلد صلح پر آمادہ ہو جاتے، بلکہ صلح میں ہمیشہ ہی پہل کرتے اور کہا کرتے کہ حضور پاکؐ نے فرمایا ہے صلح میں پہل کرنے والا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اس لیے میں پہل کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ ان کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں

Marfat.com

جن سب کو لکھنا ناممکن ہے۔ مختصراً یہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ہم سب کو دین حق پر چلنے کی نصیحت کی۔ میں نے ان کے بچوں سے پوچھا ہے کہ حافظ صاحب کی طرف اپنے تاثرات لکھنا چاہتی ہوں۔ آپ اپنے ابو جان کے لیے کیا کہنا چاہیں گے تو سب بچوں نے یہی بات کہی ہے کہ ہمارے ابو جان نے ہمیشہ ہمیں اچھی بات کہی، ہماری اچھی تربیت کی اور ہمارے لیے دنیا کے بجائے دین کو ترجیح دی۔ الحمدللہ اللہ نے ہمیں دنیا بھی دی اور دین بھی اور یہ سب ہمارے ابو جان کی تربیت کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہمیں ان کا جانشین اور ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

حافظ صاحب ان کے بغیر گھر سُونا سُونا لگتا ہے۔ ان کی وجہ سے عزیز و اقارب اور تحریکی بھائیوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا گھر میں خوب رونق رہتی تھی۔ میں یہاں ان کے لیے یہی شعر لکھوں گی:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا!

بچگان کا مزید تعارف

اب میں بچوں کے بارے کچھ تفصیل لکھنا چاہوں گی۔ الحمدللہ میرے تین بچے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر افراز ظفر جو کہ اب جی۔ پی ہے اور شادی شدہ ہے اور اپنی بیوی کے ساتھ الگ گھر میں رہتا ہے۔ اس کے بعد بیٹی خدیجہ ظفر ہے وہ بھی شادی شدہ ہے اور اپنے گھر میں آباد ہے اس کی تعلیم بھی بی۔ ایس۔ سی۔ سائیکولوجی ہے اور مانچسٹر سٹی کونسل میں معذور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کے بعد چھوٹا بیٹا اعتزاز ظفر ہے۔ وہ بھی۔ بی۔ ایس۔ سی، ان کمپیوٹر ملٹی میڈیا اور انٹرنیٹ ہے۔ اس کو ابھی اپنی فیلڈ میں جاب نہیں ملی۔ اس کے لیے دعا کریں۔ وہ ابھی غیر شادی شدہ ہے۔ اب میں اور وہ اس گھر میں رہ رہے ہیں۔ ویسے اعتزاز بیٹا اپنے ابو جان کے نقشِ قدم پر سب سے بڑھ چڑھ کر چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ثابت قدم رکھے

Marfat.com

اور ظفر صاحب بھی اعتزاز کو سب بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے میری محبت کا پیمانہ یہی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ جتنا زیادہ مخلص ہوگا مجھے وہ اتنا ہی زیادہ عزیز ہوگا اور اعتزاز سے محبت کی بھی یہی وجہ ہے۔

ظفر صاحب کی پہلی بیوی سے چار بچے ہیں۔ سب سے بڑا بیٹا امتیاز ظفر جو کہ ڈیزائن انجینئر ہے اور امریکہ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سیٹل ہے اور اچھی جاب پر فائز ہے۔ اس سے چھوٹا اعجاز ظفر۔ ایم۔ ایس۔ سی ان آئی ٹی کمپیوٹر ہے اور ادھر راچڈیل ہی میں رہتا ہے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بہت عزیز رکھتا ہے اور ہم سب بڑے پیار محبت سے مل جل کر رہ رہے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ اسی طرح پیار محبت سے رکھے۔ ظفر صاحب کی پہلی بیوی سے دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں پاکستان میں ہیں اور اپنی فیملی میں ان کی شادیاں ہوئی ہیں۔ وہ دونوں بھی اپنے اپنے گھروں میں آباد اور خوش ہیں۔ اللہ ان کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ ان دونوں نے بھی بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔

آپ جب ظفر صاحب پر اپنے تاثرات لکھیں تو جس رسالے میں بھی لکھیں ایک کاپی ہمیں بھجوادیں۔ اور ایک بھائی جان محمد آصف کو جوڑا بھی بھجوادیں۔ وہ بھی خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں بھائی جان کے حالات پر مشتمل مضمون مل جائے۔ خواتین میگزین مجھے یہاں سے مل جاتا ہے میں یہاں نیلی مسجد حلقہ خواتین کے پروگرام میں شامل ہوتی رہتی ہوں۔ اللہ سے دعا کریں کہ ہم سب کو ثابت قدمی عطا فرمائے۔ آمین۔ اگر لکھنے میں کچھ غلطی ہو تو معاف فرمادیں۔ اس کے علاوہ جہاں آپ ضروری سمجھیں کاٹ چھانٹ یا اضافہ کر کے برائے مہربانی اصلاح بھی کر دیں۔ بہت بہت شکریہ۔ میں نے بہت عرصہ بعد خط لکھا ہے۔ میری طرف سے بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام اور آپ کے تمام بچوں کو سلام، پیار اور دعائیں۔ والسلام۔ آپ کی بہن

مقصودہ ظفر راچڈیل، یو کے۔''

Marfat.com

صاحبزادہ محمد ابراہیم

(۱۹۲۸ء--۲۰۱۲ء)

صاحب ایمان کا جنازہ

جماعت اسلامی کے بزرگ رکن اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے دور کے سرگرم مخلص کارکنان میں سے ایک انتہائی قیمتی فرد صاحبزادہ محمد ابراہیم اکتوبر ۲۰۱۲ء میں اپنی زندگی کی ۸۴ بہاریں خزاں میں تبدیل کرنے کے بعد اپنے دائمی ٹھکانے پر چلے گئے۔ مرحوم کی زندگی بھی لائق تحسین تھی اور وفات بھی قابل رشک! اللہ کا یہ بندہ اپنے اندر بے پناہ خوبیاں رکھتا تھا۔ مرحوم کی وفات کے وقت راقم یورپ کے دورے پر تھا۔ یورپین مسلم کونسل کا سالانہ اجلاس برلن، جرمنی میں ہو رہا تھا، اس میں شرکت کے علاوہ ناروے میں اسلامک کلچرل سنٹر اوسلو نے بھی کئی پروگرام ترتیب دے رکھے تھے۔ اوسلو میں فون کے ذریعے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملی تو ازحد افسوس ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ مرحوم سے وابستہ یادیں ایک ایک کر کے دل کو بے قرار کرنے لگیں۔ آخری ملاقات بھی ذہن میں تازہ ہوگئی جس میں مرحوم نے فرمایا تھا: ''میری خوش دامن کا اور پھر میری اہلیہ کا جنازہ آپ نے پڑھایا تھا، اب میرے جنازے کا بھی خیال رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی سفر پر نکلے ہوئے ہوں اور میں کوچ کر جاؤں۔'' ایسے صاحب ایمان اور مخلص بندوں کے جنازے میں شرکت تو سعادت ہوتی ہے۔ افسوس کہ ان کے جنازے میں شرکت سے محروم رہا۔

مسافر اور گاڑی

مندرجہ بالا گفتگو کو سن کر میں نے عرض کیا: ''صاحبزادہ صاحب یہ کسے معلوم کہ کون کس کا جنازہ پڑھے گا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔'' فرمانے لگے: سنا نہیں آپ نے کیا کہا۔'' نقل

Marfat.com

سماعت تو تھا مگر بات سن لیا کرتے تھے۔ میں نے پھر اپنا فقرہ دہرایا تو اپنی دائمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ''تم تو ہمارے ہاتھوں میں جوان ہوئے ہو۔'' میں نے پھر عرض کیا: ''آپ کی صحت الحمدللہ مجھے اب پہلے سے بہتر لگتی ہے اور پھر منزل کا تعلق عمر سے تھوڑا ہے۔ یہ تو متعین ہے نہ کہ عمر سے منسلک۔ اپنے اپنے سٹیشن پر ہر مسافر اترے گا، گاڑی رواں دواں ہے، اسی طرح دوڑتی رہے گی۔'' کہنے لگے: ''مولانا مودودیؒ فرمایا کرتے تھے ''میرا چہرہ بڑا چور ہے، دیکھنے والوں کو اندر کی کیفیت کا اندازہ نہیں ہوسکتا'' میرا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ میری صحت اب جواب دے گئی ہے۔''

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی صحت بھی آخری سالوں میں خاصی خراب رہتی تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کا چہرہ مبارک ہمیشہ ترو تازہ اور ہشاش بشاش نظر آیا کرتا تھا۔ صاحبزادہ صاحب کے مولانا سے منسوب الفاظ کے متعلق تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی ان سے سنے ہوں مگر مولانا آخری سالوں میں ہر ملاقات پر اپنی صحت کا پورا حال بیان فرمایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ملاقات کے دوران فرمانے لگے ''میرا ہر عضو مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ میں نے ان کو آرام نہیں لینے دیا، اب یہ بدلہ لے رہے ہیں۔''

قیمتی یادداشتیں

ابراہیم صاحب میرے بزرگ بھائی تھے، میں کبھی کبھار ملاقات کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ خوب محفل آرائی کیا کرتے تھے۔ سنتے کم تھے اور سناتے زیادہ تھے۔ میں بھی ان سے دلچسپ و ایمان افروز واقعات سننے کا شوق رکھتا تھا۔ بڑا مزا آتا تھا، ان کی باتوں میں۔ اے کاش وہ خود اپنی یادداشتیں لکھ دیتے یا ہم میں سے کوئی ریکارڈ کر لیتا۔ مولانا مودودیؒ، میاں طفیل محمدؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، شیخ فقیر حسینؒ اور دیگر جماعتی قائدین کے علاوہ ہر مسلک کے علماء جناب مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا ابوالبرکاتؒ، مولانا ابوالحسناتؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا غلام اللہ خانؒ اور حافظ کفایت حسینؒ کے کئی واقعات بھی سنایا کرتے۔ کبھی توجہ ہی نہ کی تھی کہ انھیں ڈائری میں نوٹ کر لیا جاتا۔

Marfat.com

ابتدائی حالات

صاحبزادہ محمد ابراہیم مرحوم علاقہ ہزارہ سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا ابتدائی تعارف ذیل میں دیا جارہا ہے جو ان کے بچوں نے بیان کیا۔

''صاحبزادہ سید محمد ابراہیم مرحوم ۱۹۲۸ء میں صوبہ سرحد کے گاؤں برگ، ہری پور میں پیدا ہوئے۔کل سات بہن بھائی تھے، جن میں سے تین بھائی اور اکلوتی بہن وفات پا چکے ہیں۔بہن کا انتقال صاحبزادہ صاحب کی وفات سے تقریباً ۲ ماہ قبل ہوا۔صاحبزادہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ۲ بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔جوانی بلکہ اوائل عمری میں ہی جماعت اسلامی پاکستان سے وابستہ ہوگئے اور آخری سانسوں تک جماعت کے رکن رہے۔مولانا مودودی صاحبؒ کی رفاقت میں گزرے ماہ وسال ان کا قیمتی اثاثہ تھے، اس وقت کو اکثر یاد کرتے، واقعات کو دہراتے، آنے جانے والے مہمانوں کو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بجائے مولاناؒ کی باتیں اس انداز میں سناتے کہ سننے والا گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا رہتا اور پوری یکسوئی سے تمام گفتگو سنتا۔''

اکابر جماعت سے خصوصی تعلق

ابراہیم صاحب کے بچوں کی بات بالکل درست ہے۔ان کی باتیں انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہوا کرتی تھیں۔ان کا کافی وقت اکابرین جماعت کے ساتھ گزرا۔مولانا مودودیؒ کے بعد ابراہیم صاحب سابق امیر جماعت محترم میاں طفیل محمد صاحب مرحوم کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔جب تک میاں صاحب حیات رہے ابراہیم صاحب خصوصی تہواروں پر یا اس کے علاوہ بھی ان سے ملاقات کے لیے ان کے دولت خانے پر جاتے رہے۔میاں صاحب کے ساتھ گزرے لمحات کا تذکرہ جب بھی کیا جاتا، مرکزی ناظم مالیات شیخ فقیر حسین صاحب کا ذکر کرنا ہرگز نہ بھولتے۔دونوں کے درمیان محض دفتری اور ناظم وماتحت کا تعلق نہ تھا بلکہ دو بھائیوں کی طرح بہت محبت واپنائیت اور بے تکلفی بھی تھی۔آپس میں گھریلو تعلقات بھی بھائیوں جیسے تھے۔مرکز جماعت اچھرہ سے منصورہ منتقل ہوا تو رہائشی فلیٹس میں ابراہیم صاحب پہلے یونٹ پر اوپر اور فقیر حسین صاحب نیچے کے پورشن

Marfat.com

میں مقیم ہو گئے۔ بعد میں شیخ فقیر حسین صاحب کا انتقال ہوا اور ان کا اپنا مکان بھی منصورہ میں بن گیا تو ان کی فیملی وہاں منتقل ہو گئی۔ ابراہیم صاحب نے منصورہ میں پلاٹ ہی نہ خریدا تھا۔ بعد میں ان کے بیٹوں نے گلزارِ منصورہ میں پلاٹ لیے اور وہیں دونوں نے مکان تعمیر کیے۔

امانت و دیانت

ابراہیم صاحب مرکز جماعت میں تو ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ آ گئے تھے مگر شعبہ مالیات میں ذمہ داری کچھ عرصہ بعد لگی۔ یہاں کام کے دوران شیخ فقیر حسین صاحب کو ان کی صلاحیت اور دیانت و امانت کا علم ہوا تو کیش کے جملہ معاملات ان کے سپرد کر دیے۔ وہ تقریباً ۳۵ سال مرکزی مالیات میں خازن رہے۔ یوں جماعت اسلامی کا مکمل کیش ۳۵ سال سنبھالا لیکن جب استعفا دیا تو ایک دیانت دار امین کی مانند پاک صاف ہاتھ لے کر وہاں سے نکلے جس کا تذکرہ وہ اپنے بچوں میں بہت فخر اور شکر گزاری کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ منصورہ میں پلاٹ لینے کا تذکرہ جب بھی ہوتا، فرماتے:

”جب منصورہ کی زمین کا سودا ہو رہا تھا تو میں اس کی پوری تفاصیل سے باخبر تھا۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہوا، ادائیگی میرے ہی ہاتھوں ہوتی تھی۔ زمین سستی تھی اور سب رفقا و اکابرین جماعت کا مجھ سے اصرار تھا کہ پلاٹ خرید لو۔ میاں صاحب نے تو بارہا متوجہ کیا۔ میں ایک ہی جواب دیتا تھا کہ خریدنے کو جی تو چاہتا ہے مگر میرے پاس پلاٹ خریدنے کے لیے جمع پونجی نہیں ہے۔“

خصوصی سرپرستی

ابراہیم صاحب نے ایک مرتبہ ایک ملاقات کے دوران مجھ سے کہا کہ میاں صاحب نے ہمیشہ اپنے کارکنان کا خیال رکھا۔ مجھ سے تو بہت ہی محبت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ مجھے کہا کہ مالیات سے قرض لے کر پلاٹ لے لو۔ ہر ماہ بالاقساط قرض کی ادائیگی کرتے رہنا۔ یہ کوئی ناروا بات نہیں تھی کیوں کہ ہمہ وقتی کارکنان کا یہ حق تسلیم کیا گیا تھا اور اقساط بھی خود بخود معاوضے سے کٹ جاتی تھیں مگر میرا اطمینان نہ تھا۔ میں نے کہا: ”میاں صاحب مجھے کیا معلوم فرشتۂ اجل کی طرف سے میرا نام کب پکار دیا جائے۔ پھر میں اپنے ذمے جماعت کا قرض

Marfat.com

لے کر دربارِ خداوندی میں حاضر ہو جاؤں تو کیا بنے گا۔'' ایک بار فرمایا میں نے جب اپنے سر میں ٹیومر کا آپریشن کروایا تو میاں صاحب نے میرے بارے میں ڈاکٹر فتح خاں ملک صاحب کو اتنی تاکید کی کہ ڈاکٹر صاحب میرا بے حد احترام کرنے لگے حالانکہ وہ پاکستان کے سینئر ترین نیورو سرجن تھے۔ میاں صاحب ہر روز میری خبر گیری کرتے تھے۔ اللہ نے مجھے شفائے کاملہ عطا فرمائی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا زندہ ہوتے تو وہ بھی اسی طرح میری خبر گیری کرتے۔ انھوں نے بھی ہمیشہ میری دلجوئی اور سرپرستی فرمائی۔''

اچھی مثال

منصورہ میں تقریباً ۲۴، ۲۵ سال کا عرصہ گزارا۔ جس دن ان کی اہلیہ کی وفات ہوئی اسی دن ان کا استعفا منظور ہو کر گھر آیا۔ اس کے چند ایام بعد ابراہیم صاحب نے فلیٹ خالی کر دیا۔ محترم قاضی حسین احمد صاحب نے بہت اصرار کیا کہ یہ فلیٹ آپ کا ہے۔ آپ کی خدمات قابل قدر ہیں، اس لیے آپ فی الحال اس فلیٹ میں رہیں لیکن ابراہیم صاحب کی بااصول طبعیت نے یہ مشفقانہ آفر قبول نہ کی اور یہ کہہ کر فلیٹ خالی کر دیا کہ ''یہ فلیٹ جماعت اسلامی کے دفاتر میں کام کرنے والے افراد کو الاٹ کیے جاتے ہیں۔ اب چونکہ میں اپنی جاب سے خود مستعفی ہو چکا ہوں، لہٰذا میرا مزید یہاں رہنا اس اصول کے منافی ہے۔'' اسی دوران آپ کے بیٹے حافظ عمر فاروق کا مکان منصورہ نمبر ۲ میں بن چکا تھا۔ عمر فاروق نے ۱۹۹۵ء میں اپنا گھر تعمیر کیا اور وہ پہلے ہی سے اپنے بیوی بچوں سمیت وہاں رہائش پذیر تھے۔ بعد میں خالد فاروق نے بھی اسی بلاک میں اپنا گھر بنا لیا اور اس کی رہائش وہاں منتقل ہو گئی۔ ابراہیم صاحب آخر دم تک عمر فاروق صاحب کے ساتھ مقیم رہے۔

امرت دھارا

مرحوم کی فیملی کے ہر فرد کا کہنا ہے کہ وہ سبھی بچوں سے بے حد پیار کرنے والے مثالی باپ تھے۔ اپنے بیٹے بیٹیوں، خصوصاً چھوٹے بیٹے خالد فاروق سے بہت پیار کرتے تھے۔ اپنے چھوٹے بڑے مسائل، طبیعت کے اتار چڑھاؤ اور دیگر امور کے متعلق بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ بلاوجہ نہ

Marfat.com

کوئی شکایت، نہ شکوہ، ہمیشہ خوش وخرم اور مطمئن رہنا، ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ کبھی کبھار خالد بیٹے سے کسی بات پر تبادلہ خیال کرتے۔ منصورہ نمبر ۲ میں رہائش پذیر ایک نوجوان عرفان (میڈیکل اسٹور والے) سے بھی بے تکلفی سے گفت گو فرماتے۔ وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور جو بھی کام ہوتا بحسن وخوبی بڑے ادب واحترام سے سرانجام دیتا۔ کئی محلے دار اور احباب کہا کرتے تھے کہ عرفان صاحبزادہ صاحب کا روحانی فرزند ہے۔

جماعت سے وابستہ یادیں

مرکز جماعت میں کام کرنے والے رفقا ازراہ مذاق کہا کرتے تھے کہ صاحبزادہ صاحب مرشد مودودی کا امرت دھارا ہیں۔ وہ مرکز جماعت میں تمام اکابر کی ہر طرح کی خدمت کیا کرتے تھے۔ مالیات کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں ان کو اچھرہ سے ہر روز ہی شہر جانا پڑتا تھا۔ جس ساتھی کا بھی شہر میں کوئی کام ہوتا معمول کے دفتری کام کے ساتھ وہ بھی خوش اسلوبی سے سرانجام دے آتے۔ خریداری کا بہت اچھا ذوق اور سلیقہ تھا۔ بھاؤ تاؤ، جو عام لوگ دکانداروں کے ساتھ نہیں کر پاتے، وہ بہت کامیابی سے کرلیا کرتے تھے۔ مولانا کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ مولانا سے بے تکلف بھی ہو گئے تھے۔ باہمی مزاح بھی چلتا تھا۔ جو کام یا بات مولانا مودودیؒ سے کوئی کروانا چاہتا یا مولانا کو کوئی تجویز دینا چاہتا تو ابراہیم صاحب سے رابطہ کرتا۔ وہ بے دھڑک مولانا کے کمرے میں چلے جاتے اور مولانا سے بات کرا دیتے۔ مولانا ان کا دل رکھنے کے لیے ان کی بات مان لیتے تھے اور کبھی یہ تبصرہ بھی فرما دیتے کہ ابراہیم صاحب سادگی کی آخری حد تک مخلص انسان ہیں۔

مولانا مودودیؒ کی وسیع الظرفی

ایک بار کچھ جماعتی ساتھی مرکز جماعت میں آئے اور ابراہیم صاحب سے کہا ''ہم مولانا کی زیارت کرنا چاہتے ہیں اور ایک دھاگہ ان کے گلے میں باندھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے گھٹنوں کی تکلیف اور جوڑوں کا درد ٹھیک ہو جائے۔'' مولانا کو ''زیارت'' کے نام پر باہر لانا اور دھاگہ گلے میں باندھنا دونوں ناممکن سے کام تھے۔ یہ تجویز لانے والے ساتھیوں نے ابراہیم صاحب کو آگے

Marfat.com

کیا۔ ابراہیم صاحب نے بے دھڑک جا کر آنے والوں کی خواہش مولانا محترم کے سامنے رکھی۔ مولانا کرسی پر بیٹھے تفہیم لکھ رہے تھے، قلم چھوڑ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ''لوگوں کو ملاقات کے لیے لے آئیں۔'' جب تمام افراد ملاقات کر کے چلے گئے تو ابراہیم صاحب وہ ''دم کیا ہوا دھاگا'' لے کر کرسی کے پیچھے جا کھڑے ہوئے کہ مولانا یہ دھاگا آپ کو باندھنا ہے۔ مولانا صاحب مسکرائے اور مزاحیہ انداز میں کہا ''باندھ دیں اور یہ بھی بتا دیں مجھے کب تک باندھے رکھنا ہے۔'' ابراہیم صاحب نے کہا: ''صرف سات دن۔'' مولانا نے فرمایا: ''یہ محض تمھارا شوق ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

اخلاص وسادگی

ساتویں دن جب ابراہیم صاحب دھاگہ کھولنے گئے تو پہلے پوچھا: ''مولانا درد کا کیا حال ہے؟'' مسکرا کر جواب دیا: ''وہی جو دھاگا باندھنے سے پہلے تھا۔'' مولانا نے دھاگا کہاں باندھنا تھا، ابراہیم صاحب کا دل رکھنے کے لیے وقتی طور پر ان کو اجازت دے دی۔ مولانا نے میرے سامنے خود کئی بار فرمایا: ''ابراہیم صاحب بہت مخلص اور سادہ مزاج ہیں۔'' مولانا مرحوم چائے میں چینی بہت زیادہ استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ابراہیم صاحب کپ میں چینی ڈال رہے تھے۔ مولانا سے پوچھنے لگے: ''مولانا اور پا دوں؟'' یہ فقرہ جوں ہی زبان سے نکلا ابراہیم صاحب کو بھی احساس ہو گیا کہ انھوں نے پنجابی کا لفظ ''پادوں'' استعمال کیا ہے اور ان سے فاؤل ہو گیا ہے۔ مولانا نے مسکرا کر فرمایا ''بڑے شوق سے مگر ذرا باہر جا کر!'' اردو میں ''پادوں؟'' کا مطلب پنجابی والے پادوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

سید سے صاحبزادے تک

ابراہیم صاحب کی چھوٹی بہو عزیزہ نسرین سحرش اچھی قلم کار ہے۔ اس نے راقم کو بتایا کہ ابا جی کے بارے میں ایک واقعہ سے میں بہت متاثر ہوئی۔ جب ابراہیم صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ سیّد ہیں، آپ کا شجرۂ نسب امام زین العابدینؒ سے ملتا ہے تو آپ سیّد کے بجائے اپنے نام کے

Marfat.com

ساتھ صاحبزادہ کیوں لگاتے ہیں۔ فرمانے لگے: ''جب میں اچھرہ میں رہائش پذیر تھا تو وہاں محلے کے لوگ سیّد ہونے کے باعث میری اتنی عزت کرتے کہ میں اللہ کے خوف سے ڈر جاتا۔ کوئی پیروں کو ہاتھ لگاتا، کوئی گھٹنے پکڑ لیتا تو کوئی پیٹھ میری طرف کر کے بیٹھنا گناہ تصور کرتا، مجھے یہ سب باتیں سخت ناگوار گزرتیں۔ ہمارے آبائی رشتے داروں میں چونکہ صاحبزادہ فیملی بھی شامل تھی۔ سو میں نے سیّد کا سابقہ ختم کرنے کے لیے خود کو صاحبزادہ ہی کے نام سے متعارف کرانا بہتر سمجھا۔''
دراصل سیّد مودودی کی فکر نے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ اللہ کے ہاں عزت سادات ہونے کے باعث نہیں بلکہ اعمال اچھے ہونے کے باعث ملے گی۔

گھریلو معاملات و واقعات

مرحوم کے بچوں کی گواہی ہے کہ وہ ایک شفیق باپ، محبت کرنے والے شوہر اور مثالی سسر تھے۔ دور و نزدیک کے مستحق رشتے داروں کی ڈھکے چھپے مدد کیا کرتے۔ حدیث نبویؐ کے مطابق جب نیا جوڑا سل کر آتا تو پرانا خاموشی کے ساتھ کسی مستحق کو دے دیا کرتے۔ صاف ستھرا اور مناسب کھانا کھاتے۔ کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور بے وقت بھی نہیں کھاتے تھے۔ طبیعت میں نفاست بہت تھی، روزانہ کے معمولات میں احادیث نبویؐ کے ہر پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے ان کو عمل میں لانے کی کوشش کرتے۔ اپنے خاندان کے تمام اعزہ و اقربا کے لاہور آنے پر ان کی خوب خاطر خدمت کرتے تھے۔ اسی طرح اپنے سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ بھی ہمیشہ محبت اور حسنِ سلوک کا رویہ رکھا۔ وہ تو پڑوسیوں کے بھی خدمت گزار تھے۔

متوکل علی اللہ

صاحبزادہ صاحب کی چھوٹی بہو نے مزید بتایا کہ اسے مرحوم کی اللہ پر توکل کی نسبت سے ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ''جب ہمارے گھر کا لنٹر پڑ رہا تھا تو خالد صاحب فیکٹری میں تھے اس موقع پر اپنا کوئی فرد وہاں موقع پر موجود نہ تھا۔ ادھر لنٹر کا کام شروع ہوا، ادھر طوفانی بارش کے آثار شروع ہو گئے۔ میں بھاگ کر اباجی کے پاس آئی، وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے

Marfat.com

کہا: ''ابا جی اس صورتِ حال میں کیا کریں، خالد صاحب بھی فیکٹری سے نہیں آ سکتے۔'' خود بھی اگر چہ فکر مند تھے مگر مجھے کہنے لگے: ''فکر نہ کرو ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔'' ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ بقول شاعر ''اتنا برسا ٹوٹ کے بادل، ڈوب چلا میخانہ بھی'' والی بارش شروع ہوگئی۔ میرے شفیق و رحیم سسر ان لمحات میں مجھے تسلی دیتے اور مسلسل اللہ سے دعا کرتے جا رہے تھے۔ کمزوریٔ ایمان کے باعث میں نے خیال کیا کہ سارا میٹریل بہہ چکا ہے، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

صابر و شاکر بندہ

ایک گھنٹہ مسلسل شدید بارش برستی رہی۔ بارش تھمنے کے بعد جب میں نے کھڑکی سے ڈرتے ڈرتے گھر کی طرف نگاہ دوڑائی۔ (جس گھر میں ہم رہائش پذیر تھے وہاں سے نیا مکان بالکل سامنے ہی زیرِ تعمیر تھا)۔ جھانک کر نظر ڈالی تو کیا دیکھتی ہوں کہ تمام مزدور اطمینان سے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ لنٹر والی چھت پر پلاسٹک شیٹ بچھی ہوئی ہے اور ہمارا اس قدر طوفانی بارش کے باوجود کوئی نقصان نہیں ہوا۔ والد صاحب اس صورتِ حال پر مسکرائے اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگے جب کہ میں ان کے اللہ پر اس کامل یقین کو دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔'' عزیزہ نے مرحوم کا جو واقعہ سنایا ہے وہ اللہ پر مکمل بھروسہ رکھنے والوں ہی سے متوقع ہوتا ہے۔ یہ کام بہت نفع بخش ہے مگر ہے خاصا مشکل۔ ہاں اللہ جس کے لیے آسان کر دے، اس کے لیے ہرگز مشکل نہیں رہتا۔ قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے کہ جو کوئی بھی اللہ پر توکل کرے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ (الطلاق آیت ۳) اسی طرح حدیث میں ارشاد ہے کہ جو اللہ کا ہو جائے، اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ یہ ہم سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

ایک دوست کی شہادت

صاحبزادہ صاحب کے دیرینہ دوست جناب بشیر علی صاحب نے، جو مرکز کے شعبہ تعمیرات میں سال ہا سال کام کرتے رہے، ان کے متعلق یوں گواہی دی۔ ''صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب نے جب مالیات میں بطور فارغ کارکن کام شروع کیا، اس وقت وہ صدر بازار کینٹ میں رہائش

Marfat.com

پذیر تھے۔ روزانہ انھیں سائیکل پر مرکز جماعت اچھرہ جانا پڑتا تھا۔ اچھرہ سے رات گئے واپس گھر جاتے تھے۔ ان دنوں نہر کنارے کی سڑک بالکل ویران تھی، سڑک پر لائٹ بھی نہیں ہوتی تھی۔ قاضی ثناء الحق صاحب بھی روزانہ کینٹ سے اسی طرح سائیکل پر نیا مدرسہ آیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کبھی اگر لیٹ ہو جاتے تو ابراہیم صاحب ان کے صاحبزادے کو سائیکل پر بٹھا کر نیا مدرسہ لے آتے تھے۔ یہ وضع داری اور مروت ان دنوں عام تھی۔

دینی تعلیم

ابراہیم صاحب کی شخصیت مرکز اور منصورہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے طالب علمی کے زمانے کا آخری حصہ مدرسہ تقویت الایمان شیش محل روڈ میں گزرا۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا داؤد غزنوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف ان کے اساتذہ میں سے تھے۔ اسی لیے مولانا مودودیؒ کو تفہیم القرآن کے سلسلے میں حوالہ جات کے لیے کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو ابراہیم صاحب مولانا عطاء اللہ حنیف سے لایا کرتے تھے اور واپس بھی وہی کرتے تھے۔ مالیات میں شروع سے شیخ فقیر حسین صاحب اور ابراہیم صاحب ہی ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جب دفاتر منصورہ منتقل ہوئے تو محمد نواز منہاس مرحوم بھی اس ٹیم میں شامل ہو گئے۔ منہاس صاحب کے ذکر سے یاد آیا کہ تقسیم ملک سے پہلے منہاس صاحب اور مراد علی شاہ مرحوم، دہلی میں مختلف گورنمنٹ دفاتر میں کام کرتے تھے، جو ایک دوسرے کے قریب واقع تھے۔ چھٹی کے بعد فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک صاحب جماعت کا لٹریچر پڑھتے جاتے تھے، جبکہ دوسرا ساتھی غور سے سنتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لوگ لٹریچر پڑھ کر جماعت میں آتے تھے اور لٹریچر ایک کارکن کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔

جنت کی بشارت

مالیات میں ابراہیم صاحب کا واسطہ ہر چھوٹے بڑے کارکن سے پڑتا تھا۔ چھوٹے سٹاف کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ اخلاص اور اپنائیت کا رہا۔ ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ لوگ

Marfat.com

ابراہیم صاحب کا ذکر جس محبت سے کرتے ہیں، میں نے کم ہی لوگوں کے متعلق ایسا سنا ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ ایک جنازہ گزرا تو لوگ مرنے والے کی تعریف کرنے لگے۔ یہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت واجب ہوگئی۔'' واقعی اس حدیث کی روشنی میں ابراہیم صاحب جنتی شخص تھے کیوں کہ ان کے پرانے شناسا بشیر علی صاحب کی طرح ان کا ہر جاننے والا ان کے حق میں ایسی ہی نیک گواہی دیتا ہے۔

حق ہمسائیگی

میں شاہد ہوں کہ بشیر علی صاحب کے جذبات بالکل درست ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ بھی ایسا ہی ہے۔ صاحبزادہ صاحب میرے ہمسائے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے حق ہمسائیگی بہترین انداز میں ادا کیا۔ بے پناہ محبت کرتے، میری منصورہ سے طویل غیر حاضریوں (اندرونی دورہ جات و بیرونی ممالک کے سفر) کے دوران میرے گھر میں جس چیز کی ضرورت ہوتی، بڑی خوشی اور مسرت کے ساتھ بازار سے خرید کر لا دیتے۔ فرمایا کرتے تھے'' آپ تو میرے برخوردار ہیں، میں نے آپ کی جمعیت کی سرگرمیوں کو بھی دیکھا۔ گویا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے جوان ہوتے دیکھا ہے۔ آپ سفر پر جایا کریں تو بالکل بے فکر رہا کریں۔ میری اہلیہ آپ کے بچوں سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی ہے اور میں بھی تمھارے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ تمھارے یہاں آنے اور ہمارا ہمسایہ بننے کی خبر نے ہمارے پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی ....''

میں نے اگست ۲۰۰۲ء میں ایک مرتبہ ایشیا میں دریچۂ دل میں ان کا تذکرہ کیا تو بڑے خوش ہوئے۔ میں نے لکھا تھا:

دو محبوب ساتھی

بزرگوار محترم صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب ایشیا کے پرانے قاری اور راقم کے حق میں دعا گو ہیں۔ ان کی خدمت میں تازہ مطبوعہ سفرنامہ ''نگری نگری پھرا مسافر'' پیش کیا تو ان کا تاثر یہ تھا کہ

Marfat.com

"مسافر مقیم کب ہوگا اور دریچہ کب کھلے گا؟" آج کی محفل میں دو بزرگوں کا مختصر حال اور ان سے اپنا تعلق خاطر پیش کیا جائے گا۔ ایک بزرگ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ قائم رکھے۔ دوسرے اس عارضی سفر کی مسافتیں طے کر کے عالم جاودانی کو کوچ کر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ اول الذکر بزرگ صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب ہیں اور آخر الذکر بھائی مولوی رشید احمد شاد مرحوم و مغفور۔ ماہرین علوم انسانی کے نزدیک انسان عالم اصغر ہے۔ یعنی یہ چھوٹی سی مخلوق ایک جہان یا ایک دنیا ہے۔ جس طرح دنیا عجیب و غریب اشیا سے مالا مال ہے، اسی طرح انسان بھی اپنے اندر عجوبات رکھتا ہے۔ ہر شخص کا ایک حلقہ احباب اور دائرہ اثر ہوتا ہے۔ اس دائرے اور حلقے میں گوناگوں قسم کے انسان پائے جاتے ہیں۔ ہمارا حلقہ احباب اللہ کے فضل سے خاصا وسیع ہے۔

ہمسایہ ماں جایا

انسان کو اپنے دوستوں کے علاوہ اپنے ہمسایوں سے بھی ایک گونہ تعلق ہوتا ہے۔ حق ہمسائیگی کے لیے قرآن و حدیث میں جو احکام اور تاکید وارد ہوئی ہے اس سے کون بے خبر ہوگا۔ اچھا ہمسایہ ایک عظیم نعمت ہوتا ہے۔ ہم لوگ منصورہ میں ۱۹۸۶ء میں مستقل رہائش کے لیے گاؤں سے منتقل ہوئے۔ ہمارے ہمسائے صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب (نائب ناظم شعبہ مالیات مرکز جماعت اسلامی پاکستان) تھے۔ ایک بہترین اور ازحد مخلص پڑوسی کی حیثیت سے ہم انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

محترم صاحبزادہ صاحب کی اہلیہ مرحومہ بھی بڑی خوبیوں کی مالک اور ہمدرد و غمگسار خاتون تھیں۔ (جنوری ۲۰۰۲ء) مرحومہ کی وفات ہوئی تو منصورہ کی سبھی خواتین غمزدہ اور افسردہ تھیں۔ صاحبزادہ صاحب ۱۹۵۵ء سے جماعت کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ آج کل وہ اپنی صحت اور عمر کی وجہ سے ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں میں موصوف سے ملنے ان کے گھر (گلزارِ منصورہ) حاضر ہوا تو فرمانے لگے "حافظ صاحب میں نے آج وہ مشہور حدیث دوبارہ

Marfat.com

پڑھی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حقوق العباد میں سے دو ہمسایوں سے باز پرس ہوگی۔ آپ ہمارے پڑوسی رہے ہیں، اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی ہو تو معاف فرمادیں۔''

نایاب ہیرے

میں نے کہا'' حضرت ہم تمام اہلِ خانہ آپ کے حسنِ سلوک کے گواہ ہیں اور ان شاء اللہ قیامت کے دن بھی آپ کے حق میں گواہی دیں گے۔ آپ سے بھی میں یہی سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے بارے میں کیا گواہی دیں گے؟'' صاحبزادہ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بے ساختہ مجھے چومنے لگے۔ ایسے عظیم لوگ دنیا میں موجود رہے ہیں۔ موجود ہیں، موجود رہیں گے، مگر قلیل! یہ نایاب ہیرے غائب ہوتے جا رہے ہیں اور معاشرہ افلاس کا شکار ہو رہا ہے۔ صاحبزادہ صاحب سے ہمسائیگی کے تعلق کے علاوہ دفتری اور مالیاتی امور میں بھی معاملات ہوتے رہے۔ میں نے ان کو کھرا، ہمدرد اور ذمہ دار شخص پایا۔ صاحبزادہ صاحب نے ہر قسم کے معاشی حالات میں خودداری کی زندگی گزاری ہے جو اچھا اور قابلِ اتباع نمونہ ہے۔ مومن تنگی اور فراخی، ہر حال میں حدود کا پابند رہتا ہے۔

یہ قیمتی چراغ

میں نگری نگری پھرنے والا مسافر کم ہی گھر پر بیٹھتا ہوں۔ سفر، سفر اور مسلسل سفر۔ کئی دنوں کے بعد منصورہ آیا۔ ایک دن، دو دن، مسجد میں صاحبزادہ صاحب نظر نہ آئے تو ذرا تشویش ہوئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بیمار ہیں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ سجاد نیازی صاحب ہمراہ تھے۔ صاحبزادہ صاحب کو ڈاکٹروں نے مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دے رکھا ہے۔ گھر پر ہی نماز ادا کرتے ہیں۔ زندہ دلی، مسکراہٹ اور معمول کی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ باتوں باتوں میں پھر اسی حدیث کا حوالہ! پرانی یادیں، مولانا مودودیؒ، محترم میاں طفیل محمد صاحب، شیخ فقیر حسین مرحوم اور کئی دیگر بزرگوں کی دلچسپ باتیں سناتے رہے۔ ان لوگوں کا دم بسا غنیمت ہے۔ خدا تعالیٰ سلامت رکھے۔ یہ قیمتی

Marfat.com

چراغ ہیں، روشنی بکھیر رہے ہیں!'' (ہفت روزہ ایشیا مورخہ ۳۱ راگست ۲۰۰۰ء)

پہلے روز کی ضیافت

میں ۱۹۸۶ء میں اپنی فیملی کے ساتھ منصورہ میں رہائش پذیر ہوا۔ بالائی منزل پر صاحبزادہ صاحب کے ساتھ والا فلیٹ مجھے رہائش کے لیے ملا۔ صاحبزادہ صاحب کو ہماری آمد کا علم ہوا تو انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ گھر کا ضروری سامان خرید کرلانے میں انھوں نے اس طرح تعاون کیا کہ عموماً مجھ سے میری پسند معلوم کر کے بہت سی اشیا خود بازار سے خرید کرلائے۔ یہ سامان قیمت اور معیار کے لحاظ سے اتنا اچھا، پائیدار اور مضبوط ہے کہ اب تک ہم بیشتر چیزوں کو بخوبی استعمال کر رہے ہیں۔ جب میں مرکز سے بڑی وین لے کر بچوں کو گاؤں سے لینے کے لیے جارہا تھا تو ابراہیم صاحب نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارا کیا۔ پھر قریب آ کر مجھ سے کہا: ''آج ہی آجائیں گے یا کل؟'' میں نے کہا: ''ان شاء اللہ شام تک ہم پہنچ جائیں گے۔'' فرمایا: ''شام کا کھانا ہمارے ہاں ہوگا۔'' میں نے کہا: ''رہنے دیجیے، ہم ذرا سیٹل ہو جائیں گے تو پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع کرلیں گے۔'' اس پر اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگے: ''فضول باتیں نہیں کیا کرتے، مہمانوں کی ضیافت تو پہلے دن ہی ہوتی ہے۔ آپ جائیں، آپ کے آنے سے پہلے کھانا تیار ہوگا۔''

باہمی محبت و تعاون

ابراہیم صاحب کی اپنائیت اور محبت کا لطف آج بھی دل میں موجود ہے۔ دونوں گھروں کا ہر فرد دوسرے گھر کے ہر فرد سے محبت اور اس کا احترام کرتا تھا۔ دونوں ہمسایوں کے ہاں جو چیز بھی پکتی دوسرے گھر میں اس کا حصہ ضرور جاتا۔ ابراہیم صاحب کی اہلیہ آپا آصفہ بھی ہمارے ساتھ حد سے زیادہ محبت کرتی تھیں۔ ابراہیم صاحب کی بچیاں تعلیمی مسائل کے لیے میرے پاس آتیں۔ وہ مجھے اپنی بچیوں کی طرح لگتی تھیں۔ میری اہلیہ کا ایک آپریشن ہوا تو لیڈی ولنگٹن ہسپتال میں آپا آصفہ دو دن رات اس کے پاس رہیں اور ہر طرح کا خیال رکھا۔ ابراہیم صاحب کا بڑا بیٹا حافظ عمر فاروق رمضان میں قرآن مجید سنایا کرتا تھا۔ میری موجودگی میں جب پہلا رمضان آیا تو ابراہیم

Marfat.com

صاحب نے کہا: ''آپ سے ایک کام ہے۔'' میں نے کہا: ''حکم فرمائیں۔'' کہنے لگے: ''عمر فاروق کے ساتھ دور کیا کرو۔ اس کی منزل سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ تمھارے ساتھ دور سے اس کی منزل ٹھیک ہو جائے گی۔'' میں نے کہا: ''یہ تو میرے لیے بڑی خوشی کا مقام ہے۔'' چنانچہ جب تک ہم ہمسائے رہے، ہر رمضان میں یہ معمول جاری رہا۔

ماتحت اور باس

تین سال پہلو بہ پہلو رہائش پذیر رہنے کے بعد ہم نچلی منزل والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکان شروع میں ناظم مالیات شیخ فقیر حسین صاحب اور پھر خان مسعود احمد خاں (ناظم مالیات) کے پاس رہا۔ ابراہیم صاحب کی رہائش اس کے اوپر تھی۔ ان دنوں جب سامان شفٹ کرنا تھا تو ابراہیم صاحب کے بیوی بچوں نے ہی بیشتر کام کیا۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر دے۔ ابراہیم صاحب نے اس موقع پر مزاحاً مجھ سے کہا: ''اس نیچے والے مکان میں تو ہمیشہ میرے باس رہا کرتے تھے۔ اب تم بھی خود کو میرا باس نہ سمجھنا۔'' میں نے بھی مزاحاً جواب دیا: ''گویا آپ اپنے باس کو نیچے رکھتے ہیں۔'' یہ سن کر ہنسنے لگے۔ اس مکان میں ہم تقریباً چار سال مقیم رہے۔ ہمارے پہلو میں مولانا فتح محمد صاحب کی رہائش تھی۔ وہ بھی مثالی ہمسائے تھے۔ چار سال بعد ہمارا اپنا مکان تعمیر ہوا تو ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ اب بھی دونوں خاندانوں میں مسلسل رابطہ رہا۔

قاضی ثانی

ابراہیم صاحب گرمیوں سردیوں میں واسکٹ مستقل استعمال کرتے تھے۔ محترم قاضی حسین احمد صاحب کے لباس کا بھی واسکٹ، ہر موسم میں حصہ تھا۔ شدید سردیوں میں البتہ قاضی صاحب اور ابراہیم صاحب بھی کوٹ پہنتے تھے۔ ان سالوں میں کئی مرتبہ ظالم و بدعنوان حکمرانوں کے خلاف ہماری مہمات و تحریکیں چلیں۔ انتظامیہ اور پولیس کی طرف سے بعض اوقات منصورہ کا محاصرہ کر لیا جاتا تھا۔ کئی مواقع ایسے آتے کہ محترم قاضی صاحب اور دیگر راہ نماؤں کو کسی پروگرام میں لازماً پہنچنا ہوتا تھا۔ ایسے چند مواقع پر ہم نے ابراہیم صاحب کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ کیا۔

Marfat.com

پولیس والے سمجھے کہ قاضی صاحب نکل گئے، ان کا پیچھا کیا جاتا اور منصورہ سے دباؤ کم ہو جاتا۔ یوں ہم لوگوں کو کسی راستے سے نکل جانے کا موقع مل جایا کرتا۔ ابراہیم صاحب عینک بھی قاضی صاحب کی طرح لگاتے تھے، داڑھی بھی ماشاء اللہ ان سے مشابہ تھی اور اجنبیوں کے لیے چہرہ بھی۔ ہم مذاقاً انھیں قاضی صاحب ثانی کہا کرتے تھے۔

مرشد مودودی کی عظمت

ایک مرتبہ ابراہیم صاحب اکابر جماعت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ مولانا مودودیؒ کی عظمت اور شیخ فقیر حسین صاحب کی نظم وضبط کی پابندی اور اصول پسندی کے ضمن میں ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ مولانا مودودیؒ لکھنے پڑھنے کے لیے کاغذ پنسل مالیات سے منگوایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ سکے والی پنسل ختم ہو چکی ہے، فقیر حسین صاحب نئی پنسل دے دیں۔ انھوں نے عرض کیا: ''مولانا استعمال شدہ پنسل کا آخری حصہ تو بچا ہوگا، وہ کہاں ہے؟'' مولانا نے ایک لحہ توقف کیے بغیر اپنے دفتر میں میز پر پڑے کاغذوں کے درمیان سے وہ بچا کھچا سرا نکال کر دے دیا۔ پھر فقیر حسین صاحب نے نئی پنسل ایشو کر دی۔ میں نے ابراہیم صاحب کو چھیڑنے کے لیے کہا: ''آپ لوگ مالیات میں بیٹھ کر اتنی بداعتمادی اور بدگمانی اور اس کے ساتھ سنگ دلی بھی کیا کرتے تھے۔'' تو کہنے لگے: ''نہیں اس میں ایک درس ہے اور ساتھ مولانا مودودیؒ کی عظمت کا بے مثال نمونہ بھی۔'' مجھے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ یاد آئے اور میں نے ابراہیم صاحب کی تائید کی۔

عید اور حافظہ

ابراہیم صاحب جب گلزار منصورہ منتقل ہوئے تو پانچ وقتہ نماز کے لیے جامع منصورہ آتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد سڑک پر ان کا حادثہ ہو گیا مگر اللہ نے محفوظ رکھا۔ بعد میں دن کی نمازوں میں آ جاتے تھے مگر رات کو آنا مشکل ہو گیا۔ آخری سالوں میں تو مسجد آنا تقریباً موقوف ہی ہو گیا۔ جمعہ اور عیدین پر ہی آتے۔ ایک روز میں عید ملنے ان کے گھر گیا تو کہنے لگے: ''واہ بھئی کیا کہنے، میں تو عید کے بعد دیر تک دیکھتا رہا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے مگر آپ ملے ہی نہیں۔'' میں نے کہا:

Marfat.com

''شاید آپ کو یاد نہیں رہا، میں تو پچھلی عید پر ملنے آیا تو بتایا تھا کہ میں عید منصورہ سے باہر جا کر پڑھتا ہوں۔'' سن کر مسکرائے اور کہا: ''ہاں یاد آ گیا تم ماڈل ٹاؤن جاتے ہو۔'' تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد کہا: ''حافظہ جواب دیتا جا رہا ہے۔ بس مولانا مرحوم اور میاں صاحب مرحوم ہی کی کچھ باتیں یاد ہیں، باقی سب محو ہو رہا ہے۔ ارذل العمر کا دور شروع ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا: ''آپ کا حافظہ تو ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ گھنٹوں واقعات بیان کرتے رہیں تو روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا۔'' کہنے لگے کہ جس پر بیتتی ہے وہی جانتا ہے۔

آخری سفر اور آخری لمحات

میں بیرون ملک سفر سے واپس آیا تو صاحبزادہ صاحب کے بچوں سے تعزیت کے لیے حاضری دی۔ دعائے مغفرت کے بعد میں نے پوچھا کہ صاحبزادہ صاحب کی وفات کس طرح ہوئی تو بچوں نے بتایا کہ وفات سے تقریباً ایک ماہ پہلے بلڈ پریشر لو (Low) رہنے لگ گیا تھا، یادداشت کم ہو گئی تھی، بات کچھ اور کرتے مگر ان کا ذہن جماعت کے دفتر میں گزرے لمحات میں محو ہوتا۔ اپنے کمرے کو دفتر کا نام دینے لگے کہ ''جاؤ میرے دفتر سے فلاں چیز اٹھا لاؤ، یہ چیز میرے دفتر کی میز پر رکھ آؤ وغیرہ وغیرہ۔'' انتقال سے ایک روز قبل دوپہر کا کھانا کھانے سے انکار کیا تو عمر فاروق کی اہلیہ نے دو تین چمچ خود انھیں کھلائے۔ رات کو انھیں ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے Nabulization کر کے سینے سے بلغم نکالا۔ اس کے بعد وہ فریش ہو گئے اور آرام سے سو گئے۔ لیکن اگلی صبح طبیعت میں وہی نقاہت پائی گئی۔ چھوٹے بیٹے خالد نے فیکٹری جانے کی اجازت مانگی تو انھیں روک لیا۔ طبیعت میں عجیب بے چینی شروع ہو گئی تھی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر درد کی شکایت کرتے رہے۔ اسی کیفیت میں اذان عصر ہو گئی۔ ابراہیم صاحب سے اذان کا جواب دینے کو کہا گیا تو جواباً ''اللہ اکبر'' کا ورد کرتے رہے۔

سکراتِ موت

اس کیفیت میں تمام بچے سوائے چکوال میں مقیم چھوٹی بیٹی کے موجود تھے۔ ایک بیٹی نے کان

Marfat.com

میں کہا ''ابو جی میں سورہ یٰسین پڑھنے لگی ہوں آپ سنیں۔'' ابراہیم صاحب نے تائید میں سر ہلایا اور ابتدائی چار آیات خود بھی تلاوت کیں اور آخر میں ''اللہ اکبر'' کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ وقت اور گزرا تو مغرب کی اذان ہوگئی۔ چھوٹی بہو ان کے سرہانے بیٹھی تھی کہ اچانک انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ منجھلی بیٹی نے پوچھا: ''ابا جی کیا دیکھ رہے ہیں؟'' فرمانے لگے: ''پردہ، پردہ ہے۔'' وہ آنے والے وقت کے تصور سے لرز گئیں اور فرطِ غم سے رونے لگیں۔ 6 بج کر 20 منٹ پر پوری شدت سے آنکھیں کھولیں، دائیں جانب سرہانے کی طرف دیکھا اور آخری سانس لیتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

آہ پنچھی اڑ گیا

بیرون ملک سے واپسی پر جب میں مرحوم کی تعزیت کے لیے عمر فاروق صاحب کے ہاں گیا تو ان کے دونوں بیٹے اور ان کے اہل و عیال سبھی موجود تھے مگر نہ وہ رونق نظر آئی، نہ وہ ایمان پرور منظر! یوں لگا کہ پنچھی اڑ گیا ہے اور قفس خالی اور اداس ہے۔ اللہ اس گھر کو آباد رکھے اور اس کے تمام باسی خوشیوں میں کھیلتے رہیں۔ جانے والے میں جو منفرد خصوصیات اور خوبیاں تھیں، ان کو دل ڈھونڈتا ہے اور آنکھیں ترستی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ابراہیم صاحب کی دینی خدمات کو قبول کرے۔ عباد الرحمٰن کی جو صفات اللہ نے قرآن پاک میں بیان کی ہیں، مرحوم ان پر خود کو پورا اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ کی بے ریا عبادت اور مخلوق کی بے لوث خدمت کرنے والے اس نیک بندے کو ربِ رحیم اپنی رحمتوں سے نواز دے۔ یہ وہ بندہ تھا جس کی رات تہجد کے قیام میں گزرتی تو دن اللہ کے ڈر اور خوف میں نماز و قرآن پڑھتے ہوئے۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے منور کردے اور اپنی تمام نعمتیں ان پر تمام کردے۔ (آمین ثم آمین)

Marfat.com

سوانح پر ادارہ معارف اسلامی کی چند اہم کتب

نعیم صدیقی: حیات و خدمات
مرتب: پروفیسر نور ورجان

ملک غلام علی: حیات و خدمات
مرتب: پروفیسر نور ورجان

ترکی کا مرد مجاہد
ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی

جیلانی بی اے
بشیر احمد منصور

چودھری علی احمد خان
ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

کاروان عزیمت
ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

مولانا معین الدین خٹک
(احوال و آثار)
مرتب: پروفیسر نور ورجان

میری تحریکی یادداشتیں
چودھری محمد اسلم

یادنامہ سید اسعد گیلانیؒ
مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

روداد قفس
زینب الغزالی

ملنے کا پتا
مکتبہ معارف اسلامی
منصورہ، لاہور۔ پوسٹ کوڈ: 54790
فون: 35419520-4, 35432419
Website:www.imislami.org, Email:imislami1979@gmail.com

Marfat.com

Marfat.com